ڈاکٹر شیر شاہ سیّد
دل کی بساط

دل کی بساط

(افسانے)

ڈاکٹر شیر شاہ سیّد

Dil Ki Besat

(Short Stories)

By : Dr. Sher Shah Syed

اشاعت : جون ۲۰۰۱ء

کمپوزنگ : لیزر پلس، فون : ۲۶۳۴۴۳۰

سرورق : میر اکبر علی

طباعت : ابن حسن پریس، کراچی

ناشر

بی۔ ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔

scheherzade@altavista.com

دل کی بساط کیا تھی نگاہ جمال میں
اک آئنہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

(فانی بدایونی)

طیبہ فاطمہ کے نام

فہرست

میں شکر گزار ہوں...

میں شکر گزار ہوں اپنے والدین اور بھائی بہنوں سمیت تمام اہل خانہ کا جن کی مسلسل حوصلہ افزائی کی وجہ سے یہ کتاب مکمل ہو سکی۔

میں شکر گزار ہوں اپنے اسکول، کالج اور اس کے بعد کے ان سب خواتین و حضرات اساتذۂ کرام کا جو اپنی بزرگی اور ضعیف العمری کے باوجود گاہے بگاہے مجھے تلاش کر کے کبھی فون پر اور کبھی پیغامات کے ذریعے میری تحریروں کی خوبیوں خامیوں کی نشان دہی کرتے ہیں، غلطیوں کی تصحیح کرتے ہیں اور کچھ نہ کچھ مزید سکھاتے رہتے ہیں۔ کاش آج کل کے بچوں کو بھی ایسے ہی اساتذہ میسر آ سکیں۔

میں شکرگزار ہوں ڈاکٹر آصف اسلم فرخی کا جنھوں نے ایک بار پھر میرے افسانوں کی تصحیح کی اور ان کے پروف کی غلطیاں درست کیں اور کتاب کو قابل اشاعت بنایا، اپنے دوست مبین مرزا کا جن کے تعاون، مشورے اور محبت کے بغیر یہ کتاب شائع نہیں ہوسکتی تھی۔ عبدالسلام سلامی، ڈاکٹر مرزا علی اظہر، جناب عرفان احمد خان اور جناب اسلم خواجہ کا جنھوں نے مسودے کو پڑھا اور قابل قدر مشوروں سے نوازا۔

میں شکرگزار ہوں جناب بخشش علی (اٹلانٹا)، ڈاکٹر حمید پراچہ (واشنگٹن)،

ڈاکٹر آصف، مول چند مرچندانی، انو رادھا ملک (نیویارک)، جاوید اقبال (سوئٹزر لینڈ) اور ان سب دوستوں کا جنھوں نے اپنی کہانیوں، واقعات اور حادثات میں مجھے شامل کیا اور مجھے اجازت بھی دی کہ انھیں زمانے کی کہانی بنا سکوں۔

میں کراچی کی لی مارکیٹ میں رہنے والے ہیجڑا کمیونٹی کے ان معزز افراد کا شکرگزار ہوں جنھوں نے مجھ پر بھروسا کیا اور ساتھ ہی میں سوبھراج میٹرنٹی ہسپتال میں پیدا ہونے والے علیم بیگ صاحب کا شکرگزار ہوں جنھوں نے مجھے ان سے متعارف کرایا اور کراچی کے پرانے شہر کی بہت سی باتیں اور بہت سے واقعات سنائے۔ میں شکرگزار ہوں پرانے شہر کے گلی کوچوں میں رہنے والے ان لوگوں کا جنھوں نے نہایت محبت اور خلوص کے ساتھ میری مدد کی... اورنگی، بنارس کالونی، پٹھان کالونی، لانڈھی، کورنگی اور ملیر میں رہنے والے ان لوگوں کا جن کی کہانیاں اس کتاب میں شامل ہیں۔

آخر میں ان تمام قارئین کا شکرگزار ہوں جنھوں نے میری گزشتہ دو کتابوں کو پڑھا اور پھر وقت نکال کر خطوط کے ذریعے پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا، تنقید کرکے میری اصلاح کی کوشش کی اور بعض ''غلطیاں'' دُہرانے کے باوجود مجھے ایک بار پھر قابل مطالعہ سمجھا۔

شیر شاہ سیّد

یکم جون ۲۰۰۱ء

ایک موت دو شہر

جم مرے بیاسی سال کی عمر میں بھی کافی چاق چوبند تھا۔ بتیس سال کی عمر میں اس نے شادی کی تھی، تین بچوں کا باپ بنا تھا۔ مارگریٹ کے ساتھ زندگی بہت خوب صورت تھی کہ نہ جانے کیا ہوا، بیس سال کے بعد دونوں ہی ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔ مارگریٹ نے طلاق لی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے اب جم سے محبت نہیں رہی ہے۔ بہت تکلیف دہ زمانہ تھا وہ۔ وہ مارگریٹ کے ساتھ رہنا چاہتا تھا اور مارگریٹ اس سے دُور ہوچکی تھی پھر دونوں نے مل کر ہی فیصلہ کیا تھا کہ علاحدہ ہوجائیں۔ مارگریٹ تھوڑے دن نیویارک میں ہی رہی، پھر اسے پتا لگا کہ وہ شکاگو چلی گئی ہے جہاں اس نے دوسری شادی کرلی ہے اور اب خوش ہے۔ جم نیویارک میں ہی رہا۔ بچے بڑے ہوگئے۔ بڑی بیٹی سوزانہ نے ایک کسان سے شادی کی تھی اور کنساس میں آباد ہوگئی تھی۔ جولین کی پہلی شادی ایک سال میں ہی ختم ہوگئی تھی پھر وہ ڈیوڈ سے شادی کرکے سینٹ انٹونیو ٹیکساس میں رہنے لگی تھی۔ دونوں کے دو خوب صورت اور ذہین بچے تھے۔ جم نے دوسری شادی آسٹن کے گھر چھوڑنے کے بعد کی۔ آسٹن آئی لین کے ساتھ نیویارک میں ہی رہ رہا تھا۔

جم اور لیزا کی ملاقات نیویارک میں ہی ہوئی تھی۔ لیزا کے بھی تین بڑے بچے تھے۔ تینوں اپنے اپنے گھروں کے ہوگئے تھے اور لیزا کا شوہر ایک دن بہت

ساری شراب پی کر گاڑی چلاتے ہوئے ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر مر گیا تھا۔ لیزا سے اس کی ملاقات لائبریری میں ہوئی تھی۔ دونوں کی دوستی ہوئی جو محبت میں بدلی اور پھر دونوں شادی کر بیٹھے۔ دونوں کے بچوں نے شادی پر خوب اہتمام کیا تھا۔ دس سال دونوں ساتھ رہے تھے پھر ایک دن یکایک لیزا دل کا دورہ پڑنے سے مر گئی تھی۔ جم اس وقت ستر سال کا تھا۔ جب سے جم اکیلا ہی رہتا تھا۔

زندگی تنہا تھی مگر اس نے جینا سیکھ لیا تھا۔ صبح اٹھتا تھا، محلے کی لائبریری میں اخبار پڑھتا تھا، عمر رسیدہ شہری ہونے کے حوالے سے ہر تفریح گاہ کے دروازے کھلے تھے۔ والی بال اور بیس بال اس کے پسندیدہ کھیل تھے۔ ٹیلی وژن دیکھتا تھا اور محلے کے بار میں تھوڑی بیئر پی لیتا تھا۔

جم بلڈ پریشر کا مریض تھا۔ جس کے لیے اسے دوائیں کھانی پڑتی تھیں اور سال میں چار دفعہ ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا تھا۔

اس روز اسے لگا تھا کہ اس کا بلڈ پریشر زیادہ ہے۔ اس کے سر میں درد تھا اور کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ ای آر (ایمرجنسی روم) فون کر کے ایمبولینس بلوالے۔ اسی وقت جین کا فون آگیا۔ جین اس کی دوسری بیوی کی دوسری بیٹی تھی۔ جم سے بہت قریب آگئی تھی اور دونوں میں بہت دوستی تھی۔ جین نے بتایا تھا کہ وہ صبح اس سے ملنے آئے گی۔ پھر جم جین اور جین کے بچوں کے بارے میں سوچتا ہوا سو گیا تھا۔

☆

شمیمہ، نسیمہ، کریمہ تینوں ہی ابوجان کو لے کر سول ہسپتال پہنچی تھیں۔ صبح صبح شمیمہ اسکول جانے کی تیاری کر رہی تھی، نسیمہ بھی اپنا سامان درست کر رہی تھی اور کریمہ ابوجان کو چائے دینے ان کے کمرے میں گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہ بے سدھ بے ہوش پڑے تھے۔ تریسٹھ سال کی عمر تھی ان کی، بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ اس نے چیخ مار کر دونوں بہنوں کو بلایا تھا۔ وقت نہیں تھا کہ کسی سے بات کی جاتی۔ کھوکھرا پار سے سول ہسپتال بہت لمبا سفر تھا۔ ایدھی کی ایمبولینس تو فوراً ہی آگئی تھی، ابوجان بے ہوش تھے۔ ایمبولینس کے ڈرائیور، لڑکیوں اور محلے والوں کی مدد سے انھیں

ایمبولینس میں ڈالا گیا تھا، صبح کا وقت تھا ہر کوئی کام پر جا رہا تھا۔ تینوں ہی لڑکیاں ایمبولینس میں بیٹھ گئی تھیں۔ ٹی ٹاں، ٹی ٹاں، ٹی ٹاں کرتی ہوئی ایمبولینس سول ہسپتال کی کیزولٹی (شعبۂ حادثات) پونے گھنٹے میں پہنچ گئی تھی۔

ایمبولینس سے اتار کر ایک ٹھیلے نما ٹرالی پر انھیں ڈال دیا گیا تھا جس کا ایک پہیہ ٹوٹا ہوا تھا۔ جب ٹرالی کو دھکا دے کر لے جانے لگے تھے تو راستے بھر وہ پہیہ مسلسل اپنے ہی گرد گھومتا رہا تھا اور ٹرالی جھٹکے لیتی رہی تھی۔ سردی کا زمانہ تھا اور ٹرالی ٹھنڈی ہو رہی تھی جس کے اوپر نہ کوئی چادر تھی اور نہ کمبل۔ شمیمہ نے اپنے پرس کو ابو جان کے سر کے نیچے رکھا تھا اور گھر سے لائی ہوئی چادر ان پر ڈال دی تھی۔ ان کے منھ سے تھوک نکل نکل کر بہہ رہا تھا جو اس نے اپنے ڈوپٹے سے صاف کیا تھا۔ تینوں بہنیں خاموش تھیں مگر تینوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جل بہے جا رہی تھی۔ کریمہ کے ہاتھ میں پنج سورہ تھا جسے وہ بار بار پڑھے جا رہی تھی۔ یا خدا! یا خدا! میرے ابو کو بچا لے۔ اور ہمارا ہے ہی کون۔ یا خدا! یا خدا! یا خدا! یا خدا!

اسٹریچر کو دھکا دے کر شمیمہ اندر جا ہی رہی تھی کہ ایدھی ایمبولینس والے نے کہا، ''تین روپے کی پرچی بنوا لیں۔'' پھر خود ہی بولا تھا، ''لائیں مجھے دیں میں بنوا کر لے آتا ہوں۔'' شاید اس نے سوچا ہوگا کہ لڑکی کہاں جائے گی۔ شمیمہ نے پرس سے تین روپے نکال کر دیے۔ کیزولٹی کے اندر ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ سامنے کا ٹیوب لائٹ ٹوٹا ہوا تھا اور ٹوٹ کر دیوار پر لٹک رہا تھا۔ دو ٹیبلوں کو ملا کر ایک کاؤنٹر سا بنا ہوا تھا۔ جہاں دو آدمی شلوار قمیص پہنے ہوئے بیٹھے تھے، جن کے سامنے اسٹیتھو اسکوپ رکھا ہوا تھا، شمیمہ سمجھ گئی تھی کہ دونوں ڈاکٹر ہیں۔ صبح صبح وہ دونوں بھی چائے پی رہے تھے اور مسکہ بن کھا رہے تھے۔

شمیمہ تقریباً بھاگی ہوئی ان کے پاس گئی تھی۔ ''ڈاکٹر صاحب بچا لیں میرے ابو کو۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے، رات بالکل ٹھیک تھے ابھی صبح دیکھا تو بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔''

ڈاکٹر نے غور سے لڑکی کو دیکھا تھا پھر آواز دی تھی، ''بابو بابے کو فوراً بستر پر ڈالو۔'' بابو پاس ہی کھڑا تھا جو اسٹریچر کو گھسیٹ کر دوسرے کمرے کی طرف لے گیا تھا۔

''فرقان لگتا ہے کہ بابے کو سی وی اے ہوگیا ہے۔ یار ذرا میڈیکل والوں کو بلاؤ تو صحیح، جب تک میں دیکھتا ہوں۔'' وہ چائے کی آخری گھونٹ لے کر کمرے کی طرف گیا تھا۔

وہ بستر پر بے سدھ پڑے ہوئے تھے اور لمبی لمبی سانسیں لینے کی آواز آ رہی تھی۔ ایک بہن مسلسل قرآن پڑھے جا رہی تھی۔ اور ساتھ رو بھی رہی تھی۔

''کب سے ان کی یہ حالت ہے؟'' اس نے پوچھا تھا اور آواز لگائی تھی، ''نرس! بی پی آپریٹس (بلڈ پریشر لینے کی مشین) لاؤ۔ جلدی کرو جلدی۔'' اس نے آنکھیں دیکھی تھیں نبض پر ہاتھ رکھا تھا اور جیب سے ایک چابی نکال کر ابوجان کے تلوے پر نیچے سے اوپر کی طرف کھکوڑا تھا۔ انھوں نے پیر کی انگلیوں کو سیدھا کر لیا تھا۔

''صبح جب اٹھے تو ایسے ہی تھے جی۔'' شمیمہ نے کہا۔

''بلڈ پریشر کی بیماری کب سے ہے ان کو؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''جی بہت دن سے ہے اور کبھی کبھی دوائیں بھی کھاتے ہیں۔'' شمیمہ نے پھر کہا تھا۔

''میڈیکل تھری والے کہہ رہے ہیں ہمارا وقت ختم ہوگیا ہے۔'' فرقان نے آکر ڈاکٹر کو بتایا تھا۔

''ارے تو یار فور والوں کو بلالو، آخر مریض کو تو دیکھنا ہے ناں۔'' ڈاکٹر نے زور سے کہا تھا۔

''میں نے بلایا تھا۔ وہ کہہ رہے ہیں اب او پی ڈی کا وقت ہوگیا ہے وہاں ہی بھیج دیں مریض کو۔'' فرقان نے پھر کہا۔

''ارے گدھے کے بچوں کو بولو، سی وی اے کا مریض ہے، بے ہوش ہے۔ تم نے کہا تھا ان کو؟'' ڈاکٹر نے پھر کہا۔

''نہیں، یہ تو نہیں کہا تھا۔'' فرقان نے جواب دیا۔

''یار تم عجیب انسان ہو بات تو پوری کیا کرو۔'' ڈاکٹر نے جھلا کر کہا تھا۔

''ٹھہرو میں بات کرتا ہوں، یہ کہہ وہ باہر چلا گیا تھا۔

شمیمہ تھوڑی دیر کھڑی رہی پھر آہستہ آہستہ باہر گئی تھی جہاں دو ٹیلی فون رکھے

ہوئے تھے۔

''میڈیکل فور؟ سسٹر میری کسی ڈاکٹر سے بات کرائیں۔'' ڈاکٹر فون پر گرج رہا تھا۔ شمیمہ بھی قریب ہی آ کر کھڑی ہوگئی۔

''ہاں میں بول رہا ہوں ڈاکٹر رشید کیوولٹی سے، ہاں یار ایک مریض ہے سی وی اے کا، پچاس ساٹھ سال کا آدمی ہوگا آ کر دیکھ لو۔'' پھر کسی کے بولنے کی آواز آئی تھی۔

''ارے بھائی! اب آٹھ سے اوپر ہوگیا ہے تمھیں لوگ ڈیوٹی پر ہو اور جو بھی تم سے سینئر ہے اس کو بلاؤ اور آ کے مریض کو دیکھو فوراً۔'' اس نے تقریباً چیخ کر کہا تھا... ''اس مریض کو داخل کرنا ہوگا۔

''یہ وقت ہی خراب ہے۔'' اس نے شمیمہ کی طرف دیکھ کر کہا تھا، ''ڈیوٹی بدلنے کا وقت ہے، ہر وارڈ والا دوسرے وارڈ پر ٹالتا ہے۔ مگر گھبرائیں مت ابھی وہ لوگ آجائیں گے پھر ان کو اوپر لے جائیں گے۔''

''مگر ڈاکٹر صاحب آپ تو کچھ کریں وہ تو بالکل بے ہوش پڑے ہیں۔ کچھ کریں ڈاکٹر صاحب! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔'' شمیمہ نے تقریباً روتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں! ابھی کچھ کرتے ہیں...''

☆

جین نے ایپل پائی کو لپیٹا تھا۔ جم کو ایپل پائی بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے لیے اپنے ہاتھوں سے ایپل پائی بنا کر لے جاتی تھی اور جینیفر کو تیار کیا تھا۔ ڈرمٹ صبح ہی کام پر چلا گیا تھا۔ جینیفر باہر جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ ٹھنڈی تھکی ہوئی صبح تھی۔ جم اس کا سوتیلا باپ تھا مگر اس کی ماں کی شادی کے بعد دونوں بہت قریب آگئے تھے۔ اسے جیسے دوبارہ اس کا باپ مل گیا تھا۔ سالوں میں دوستی بڑھ کر محبت میں بدل گئی تھی اور جم اس کے بچوں کو بے انتہا پیار کرنے لگا تھا۔ اکثر ہفتہ اتوار کو وہ لوگ جم کو اپنے گھر لے آتے تھے۔ جم کے اپنے بچے بھی تھے، فون اور مختلف موقعوں کے مختلف کارڈوں کے ذریعے تعلق قائم رہتا تھا اور کرسمس کے موقعے پر ایک

دوسرے سے ملاقات بھی ہوتی رہتی تھی، جم کا اپنا بیٹا آسٹن نیویارک میں رہتا تھا۔ جین کی اس سے بھی بہت بنتی تھی۔ اکثر و بیشتر یہ لوگ خوش ہونے کے بہانے ڈھونڈ لیتے تھے۔ جین نے گاڑی چلاتے ہوئے سوچا تھا کہ ایپل پائی دیکھ کر جم خوش ہوجائے گا۔ گھر کے سامنے گاڑی روک کر جین نیچے اُتری۔ جینیفر نے پہلے ہی جاکر گھر کی گھنٹی بجانی شروع کر دی تھی۔ ''گرانڈپا، ہم لوگ آگئے ہیں! گرانڈپا ہم لوگ آگئے ہیں!''

دروازہ نہیں کھلا۔ جین نے اپنی چابی نکال کر لگائی۔ اندر بیٹھنے کے کمرے میں ہی جم فون کے پاس صوفے پر بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ جین کی چیخ نکل گئی اوراس نے گھبرا کر فون اُٹھا کر 911 ڈائل کیا تھا۔ ''ایمرجنسی ہے، جلدی ایمبولینس لے کر آؤ۔'' اس نے رو رو کر اور چیخ چیخ کر اپنا پتا بتایا تھا۔

چھ منٹ میں ایمبولینس پہنچ گئی۔ آنے والوں نے فوراً ہی دروازے سے گاڑی لگائی تھی۔ ایک اسٹریچر پہیوں سمیت ایمبولینس سے باہر نکلا تھا۔ نرم گداز گرم چادریں اور گرم پانی سے گرمائے ہوئے اسٹریچر پر بہت احتیاط سے جم کو گاڑی میں لے جایا گیا۔ گاڑی کے اسٹارٹ ہونے سے پہلے ہی جم کے بازوؤں پر بلڈ پریشر لینے والی مشین لگا دی گئی تھی۔ منہ سے بہنے والا جھاگ سکشن سے نکالا جا رہا تھا۔ سانس کی نالی کھولنے کے لیے منہ میں ایک ٹیوب لگا دی گئی تھی۔ آکسیجن کی نلکی لگاکر تیزی سے آکسیجن دیا جا رہا تھا۔ گاڑی کے نکلنے سے پہلے ہی ایک انجکشن بھی لگایا جا چکا تھا۔ ہنگامی علاج کے لیے تمام ادویات ایمبولنس میں موجود تھیں۔ ایمرجنسی سے نمٹنے والی تین نرسیں بڑی تیزی سے اپنا کام کر رہی تھیں۔

ڈرائیور ہسپتال فون کر کے بتا رہا تھا کہ وہ دس منٹ میں جم مرے نام کے بڈھے کو جس کی عمر تقریبا اسی پچاسی سال ہے، لے کر ہسپتال پہنچے گا۔ اسے سی وی اے ہوگیا ہے۔ ریکارڈ آفس سے اس کی فائل نکلوالو۔ اس کی سانس ٹھیک چل رہی ہے، اس کا بلڈ پریشر زیادہ ہے، ہم پہنچنے والے ہیں۔ ایمرجنسی ٹیم کو الرٹ کرو، شاید سرجری کی ضرورت ہو۔

جین نے ایمبولینس کے نکلنے کے بعد آسٹن کو فون کیا کہ دوسرے بھائی بہنوں کو خبر کردے۔ اس نے گھر کے دروازے بند کر دیے تھے اور جینیفر کو لے کر

ہسپتال کی طرف نکل گئی۔

☆

ایک لیڈی اور دو مرد ڈاکٹر میڈیکل فور سے شعبۂ حادثات میں پہنچے تھے۔ ابو ابھی تک برف جیسے ٹھنڈے اسٹریچر پر پڑے ہوئے تھے، نسیمہ بار بار ان کا منھ پونچھ رہی تھی۔ بلڈ پریشر لینے کی مشین زمین پر گر کر ٹوٹ گئی تھی۔ لہٰذا استعمال کرنے کے قابل نہیں تھی۔ پانچ دن سے کیزولٹی میں کوئی بی پی مشین نہیں تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے اپنے کوٹ کی جیب سے اپنی مشین نکال کر لگائی۔ ''بلڈ پریشر تو بہت زیادہ ہے۔'' اس نے ڈاکٹر کو بتایا تھا۔

''کب سے یہ بلڈ پریشر کی دوائیں کھا رہے ہیں؟'' اس نے شمیمہ سے پوچھا تھا۔

''میرے خیال سے تو کھا ہی رہے تھے۔ یہ مجھے پکا پتا نہیں ہے۔'' شمیمہ نے جواب دیا تھا۔

''عجیب بیٹی ہیں آپ؟ آپ کو پتا بھی نہیں ہے کہ یہ دوا کھارہے ہیں کہ نہیں؟ ایسے میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر نے درشتگی سے جواب دیا تھا۔ ''نہ جانے کیسے کیسے جاہل اس ہسپتال میں آجاتے ہیں۔''

''جی وہ کبھی کبھی دوا چھوڑ دیتے تھے کہ کہیں دوا کے عادی نہ ہوجائیں۔ شاید ڈاکٹر نے بھی یہی کہا تھا۔'' شمیمہ نے بڑے ادب سے جواب دیا تھا۔

''جاہل ہے ڈاکٹر، پتا نہیں کون سے ڈاکٹروں کے پاس لے جاتے ہیں آپ لوگ۔'' ڈاکٹر نے مزید غصے سے کہا تھا۔ ''اب تو ان کو وارڈ میں لے جانا ہوگا۔ آپ لوگ ٹھہریں میں انتظام کرتا ہوں۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر دوسرے کمرے میں گیا تھا اور وہاں کے ڈاکٹر سے کہا تھا کہ ''پورٹر کے ذریعے مریض کو فوراً میڈیکل فور پہنچوادو، جب مریض وہاں پہنچے گا تو علاج شروع ہوگا۔ مریض بے ہوش ہے مجھے تو مشکل لگتا ہے کہ بچے گا نہیں۔ یہ لوگ بہت دیر سے ہسپتال پہنچے ہیں۔ اب کوئی خاص افاقہ تو نہیں ہوسکتا ہے۔ نہ جانے کب سے بڑے میاں بے ہوش پڑے ہیں، نہ جانے کیا کیا damage ہو چکا ہے۔ اب تو

کوشش کرنا بھی فضول ہی ہے۔''

''اوئے رمضان!'' ڈاکٹر نے آواز لگائی تھی۔ ''بابے کو میڈیکل فور لے کر جاؤ، جلدی کرو...''

شمیمہ آواز سن کر باہر آگئی۔ ''ڈاکٹر صاحب! ابو ٹھیک تو ہو جائیں گے نا؟'' اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتے بی بی، ابھی میڈیکل فور کے ڈاکٹر نے دیکھا ہے۔'' اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اب علاج ان کی ذمہ داری ہے، دیکھیں کیا ہوتا ہے... ''اس نے جواب دیا تھا۔

''کوشش کریں گے بی بی! ابھی تو وارڈ میں چلیں، وہاں علاج شروع ہوگا۔ کچھ دوائیں اور چیزیں آپ لوگوں کو لانی ہوں گی۔ کوشش تو بہرحال کرنا ہے مگر ان کی حالت صحیح نہیں ہے، وارڈ میں چلیں۔ وہاں آپ کو لکھ کر دیتے ہیں پھر جتنی جلدی آپ دوائیں لائیں گی اتنی ہی جلدی ان کا علاج ہو سکے گا۔'' دوسرے ڈاکٹر نے جواب دیا۔

اتنے میں رمضان ٹوٹے ہوئے اسٹریچر کو دھکا دیتا ہوا باہر آگیا۔ شمیمہ جھپٹ کر پھر باپ کے پاس پہنچ گئی۔ ابھی تک اس کا پرس ان کے سر کے نیچے تھا، ان کی آنکھیں بند تھیں، شمیمہ بار بار منھ صاف کر رہی تھی۔ وہ بے حس بے جان ہی لگتے اگر سانس لینے کی آواز نہیں آرہی ہوتی۔

میڈیکل فور کے ڈاکٹر کو کیزولٹی کے ڈاکٹر نے آواز لگائی تھی۔ ''لڑکیاں خوب صورت ہیں بھائی، وارڈ میں خیال رکھنا۔'' اس نے بڑی شریر مسکراہٹ سے یہ بات کہی تھی... اور زور زور سے ہنس دیا تھا۔

کیزولٹی سے اسٹریچر کھڑ پڑ کھڑ پڑ کرتے ہوئے میڈیکل وارڈ پہنچی۔ اسٹریچر کا ایک پہیہ اپنے ہی طور پر گھومتا رہا تھا۔ ناہموار راستوں پر ہچکولے لیتی ہوئی، ٹکراتی ہوئی، اچھلتی ہوئی اسٹریچر سیڑھیوں پر جا کر رک گئی۔ اسٹریچر والے نے شمیمہ سے کہا کہ بیس روپے دیں تو تبھی دو آدمیوں کی مدد سے اسٹریچر کو اوپر وارڈ میں لے جایا جا سکے گا۔

شمیمہ نے جلدی سے بابا کے سر کے نیچے سے پرس نکالا تھا تاکہ پیسے نکال کر دے سکے۔ گھر سے نکلتے نکلتے اس نے گھر میں موجود پانچ پانچ سو کے چار نوٹ اور سو

کے تین نوٹ برس میں ڈال لیے تھے، کچھ روپے پہلے سے بھی پڑے ہوئے تھے۔ اب خالی پرس اس کا منھ چڑا رہا تھا۔ نہ جانے کب کسی نے کیزولٹی میں ہی خاموشی سے پرس سے پیسے نکال لیے تھے۔ اس کا تو جیسے دل ڈول کر رہ گیا تھا۔

نسیمہ کے پاس بیس روپے تھے جو اس نے پورٹر کو دیے جس نے ایک جمعہ دار کی مدد سے اسٹریچر کو سیڑھیوں سے اوپر پہنچایا۔

وارڈ میں بستر پر ایک گندی سی چادر بچھی ہوئی تھی جس پر انھوں نے بابے کو جا کر ڈال دیا تھا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھے۔ تھوڑی دیر میں ان کے منھ سے جھاگ نکل رہا تھا جو شمیمہ بار بار اپنے دوپٹے سے صاف کر رہی تھی۔

ایک نرس آئی تھی نسیمہ اور شمیمہ کو دیکھ کر چلی گئی تھی۔ جب تھوڑی دیر تک کوئی اور نہیں آیا تو شمیمہ وارڈ کے ساتھ والے نرسوں کے کمرے میں گئی تھی۔

وہاں ایک نرس ایک ٹیبل کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ ٹیبل پر کچھ فائلیں اور کاغذوں کا ڈھیر تھا۔ کونے میں ایک جگہ پر پانی ابل رہا تھا جس میں کچھ سرنج پڑے ہوئے تھے۔ ٹیبل کے ساتھ ہی ایک الماری تھی جس میں کچھ دوائیں رکھی ہوئی تھیں۔ نرس نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے بی بی! کہاں چلی آ رہی ہو؟"

"جی میرے ابو لائے گئے ہیں، بالکل بے ہوش ہیں، کسی نے دیکھا نہیں ہے انھیں ابھی تک۔"

"ابھی دیکھ لیں گے، ویسے بھی ان کی طبیعت بہت خراب ہے، تھوڑی دیر میں اور کیا بگڑ جائے گا۔ آپ بستر پر جائیں ابھی ڈاکٹر ان کو دیکھیں گے۔"

"ذرا جلدی سے بلا دیں ان کو، طبیعت بہت خراب ہے۔" شمیمہ نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔ "کب سے بے ہوش پڑے ہیں، کوئی دوا دیں کہ ذرا ہوش تو آئے۔"

نرس اُٹھ کر دوسرے بند کمرے میں چلی گئی اور تھوڑی دیر میں ڈاکٹر کے ساتھ واپس آئی تھی۔ ڈاکٹر نے آکر پھر ابوجان کو دیکھا تھا۔ نرس بلڈ پریشر مشین لاؤ، نرس آکسیجن لاؤ، نرس کاغذ لاؤ۔ نرس آکسیجن لگاؤ، جلدی سے کینولا دو تو میں آئی وی لائن تو لگا دوں۔ آکسیجن کا سلنڈر دیکھ کر نسیمہ کو لگا تھا جیسے ابو اب نہیں بچیں گے۔

نرس نے آکسیجن کی نلکی ابو کی ناک میں ڈال کر اوپر سے سفید ٹیپ لگا دیا۔
ڈاکٹر نے کاغذ پر جلدی جلدی لکھ کر دیا تھا کہ یہ سامان لے کر جلدی آئیں تاکہ علاج شروع کیا جا سکے۔ ہسپتال میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ سب بازار سے ہی لانا پڑتا ہے۔ ہسپتال کے باہر دواؤں کی کئی دکانیں ہیں، کہیں سے بھی دوائیں لے آئیں، بس ذرا جلدی کریں۔ وقت کم ہے حالت خراب ہی ہوتی جارہی ہے۔
شمیمہ ہاتھ میں کاغذ لے کر ساکت کھڑی تھی، پرس میں کوئی رقم نہیں بچی تھی نسیمہ بار بار ان کا منھ صاف کررہی تھی، کریمہ خاموشی سے قرآن کا ورد کر رہی تھی۔ آسمان جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ ابو کے سینے کی کھڑکھڑ جیسے دُور ہوتی جا رہی تھی۔

☆

ایمبولینس کے پہنچنے سے پہلے ہی ہنگامی حالات سے نمٹنے والی ٹیم پہنچ گئی تھی۔ پوری ایمبولینس ہنگامی کمرے میں گھس گئی تھی اور جم کو ایمبولینس کے اسٹریچر سمیت ہی اُتار کر دوسرے ہنگامی کمرے میں پہنچادیا گیا تھا۔ بلڈ پریشر کا آلہ لگا ہوا تھا اور انجکشن کے اثر سے بلڈ پریشر کم ہوگیا تھا۔ جم گہری گہری سانس لے رہا تھا آکسیجن ماسک ابھی تک لگا ہوا تھا۔ ایک نرس نے جلدی سے پیشاب کی نالی لگا دی تھی۔ دوسری نرس نے ناک سے ایک اور نالی معدے تک پہنچا دی تھی اور اس میں سے کھینچ کھینچ کر معدے سے تیزابی پانی نکالا جا رہا تھا۔
''سینہ خراب ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''یہ تو بہت بوڑھے ہیں۔ جلدی سے اینٹی بائیوٹک کا شاٹ لگا دو تاکہ انفکشن نہ ہو۔'' نرس ایک رگ سے خون نکال کر مختلف ٹیسٹوں کے لیے چھوٹے بڑے شیشیوں میں خون بھر رہی تھی۔
''فوراً مریض کو ایکسرے ڈپارٹمنٹ لے جاؤ، ان کے سر کا سی ٹی اسکین کرنا ہوگا، اگر خون دماغ میں جم گیا ہے تو فوراً آپریشن کرنا ہوگا، دماغ کے سرجن کو خبر کر دو، آپریشن تھیٹر کو بتاؤ، بے ہوشی کے ڈاکٹر کو خبر کرو۔ ان کی فائل آگئی ہے، میں نے پڑھ لیا ہے پہلے بھی کوئی خاص بیماری نہیں ہوئی ہے۔ بلڈ پریشر کے لیے بڑے میاں دوا کھاتے ہیں، ذائی بیٹس یا کوئی اور اس قسم کی بیماری نہیں ہے ان کو، فزیوتھراپی والوں کو

بھی خبر کردو کہ مریض کو ان کی ضرورت پڑجائے گی۔ جب تک آپریشن کا فیصلہ نہیں ہوجائے، ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ بائیں ران پر ایک لال سا نشان ہے دھیان رکھنا پڑے گا کوئی السر وغیرہ نا بن جائے۔ ای سی جی تو بالکل ہی ٹھیک ہے۔ بڑے میاں بالکل جوان آدمی کی طرح بوڑھے ہیں۔'' ڈاکٹر مسلسل مریض کی رپورٹ کر رہا تھا۔

ایکسرے ڈپارٹمنٹ کے لوگ جم کو لے جانے آ گئے۔ نرسوں نے پورٹر نے بہت احتیاط سے جم کے جسم کو دوسری ٹرالی پر منتقل کیا تھا۔ یہ ٹرالی ایکسرے ڈپارٹمنٹ کی تھی اور اب اس پر ہی سب کچھ ہونا تھا۔

☆

''دیکھیں بی بی! آپ کے اباجان کی عمر تو زیادہ نہیں ہے مگر حالت ان کی کافی خراب ہے۔ دماغ میں خون کی رگ پھٹ گئی ہے جس میں سے خون رس رس کر باہر نکل رہا ہے اور دماغ میں جم گیا ہے... ایک تو ان کا بلڈ پریشر بھی بڑھا ہوا ہے جس کے لیے فوری طور پر بلڈپریشر کم کرنے کی دوا دینی ہوگی جو آپ کو فوراً بازار سے لانی ہے، ہمارے وارڈ میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں صرف ڈاکٹر ہیں، نہ نرسیں ہیں، نہ سامان ہے اور نہ ہی دوائیں ہیں۔ یہ پرچی آپ کو لکھ کر دی ہے اورآپ لوگ ابھی تک کچھ لے کرنہیں آئے ہیں۔ اگر لے کرنہیں آئیں گے تو کام کیسے چلے گا، علاج کیسے ہوگا؟ مریض بچے نہ بچے علاج تو کرنا ہوگا ناں۔ کوشش تو کرنی ہوگی، آپ لوگ سرکاری ہسپتال کیا سوچ کر آتے ہیں کہ یہاں ہر چیز فری میں ہے، ہر چیز مل جائے گی، عجیب لوگ ہیں آپ لوگ، کراچی میں رہتے ہیں کہ نیویارک میں؟''

''ڈاکٹر صاحب میرے پرس میں تقریباً تین ہزار روپے تھے جو میں گھر سے لے کر نکلی تھی مگر کسی نے یہ پیسے کیزولٹی میں پرس سے نکال لیے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میں کچھ کروں گی مگر فی الحال تو آپ لوگ کچھ انتظام کریں۔ ہمارا تو ہمارے ابو کے علاوہ کوئی بھی نہیں ہے۔ انھیں کچھ ہوگیا تو ہم کہاں جائیں گے؟'' شمیمہ نے تقریباً روتے ہوئے کہا تھا۔

''ڈاکٹر شازیہ! آپ کے پاس کچھ ہے؟ جب تک یہ لوگ انتظام کرتے

ہیں۔ ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔'' ڈاکٹر نے ایک لیڈی ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر پوچھا تھا۔

''سر! ڈونیشن اور خیرات کے پیسوں سے اس ایمرجنسی کے لیے میں نے کل چیزیں منگلوا لی تھیں۔ آپ کہیں تو اس پہلے مریض سے شروع کر سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر شازیہ نے جواب دیا تھا۔

''اگر ڈونیشن، خیرات کے پیسے نہ ہوں تو نہ جانے ان مریضوں کا کیا بنے۔'' ڈاکٹر غصے سے بڑبڑایا تھا۔

''جلدی کرو، شازیہ ان کا تو برا حال ہو رہا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا تھا، ''بی بی! ہم کوشش کرتے ہیں لیکن آپ اتنی دیر میں اپنے رشتے داروں کو فون کر کے بلالیں اور جو بھی کر سکتی ہیں، کریں۔ ان چیزوں کا انتظام کرنا بہت ضروری ہے۔''

''سر! یہ ہائی ڈرالی زین کا آخری انجکشن بچا ہے اگر اس سے بلڈ پریشر کم نہیں ہوا تو کیا ہوگا؟'' شازیہ اپنے لاکر سے کچھ سامان لے کر آئی اور ڈاکٹر سے کہا۔

''چلو یہ تو شروع کرو۔ کیتھیٹر پاس کرو، این جی ٹیوب پاس کرو، کیزولٹی والوں نے آئی وی لائن تک صحیح نہیں لگائی ہے۔ جو بھی ٹیسٹ ہو سکتے ہیں وہ تو کراؤ۔ ایک دفعہ بلڈ پریشر کم ہو جائے تو دیکھتے ہیں، ساڑھے نو بجنے والے ہیں۔ او پی ڈی میں جانے سے پہلے سر راؤنڈ کریں گے، ان کے لیے بھی کیس تیار کر لو۔'' ڈاکٹر نے تیز تیز لہجے میں جواب دیا تھا۔

''بی بی! آپ تو جائیں چیزوں کا انتظام کریں۔''

شمیمہ نے نسیمہ سے کہا کہ وہ وہیں ٹھہرے، وہ نیچے جا کر پی سی او سے ماموں جان کو فون کر کے بلاتی ہے۔

کریمہ کی آنکھوں سے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ وہ رو رو کر مسلسل دعائیں کر رہی تھی ابو کی صحت یابی کے لیے، کسی معجزے کے لیے۔ اے خدا! میری سن، میرے مالک! میری جان لے لے۔ میرے ابو کو بچا لے۔ انھیں کچھ ہو گیا تو ہمارا کون ہے جو ہمیں دیکھے گا؟''

☆

جین ڈاکٹر کے کمرے میں ہی بیٹھی ہوئی تھی کہ اسٹیون بھی آ گیا تھا، جم کو سی ٹی اسکین کے بعد تھیٹر بھیج دیا گیا تھا۔ ایمرجنسی کا کنسلٹنٹ جین کو بتا رہا تھا کہ دماغ میں رگ پھٹ جانے کی وجہ سے خون جم گیا ہے۔ سر میں ایک چھوٹا سے سوراخ کر کے یہ خون نکال لیا جائے گا جس کے بعد دماغ پر سے دباؤ ختم ہوجائے گا، پھر آہستہ آہستہ امید کی جاسکتی ہے کہ مریض ٹھیک ہوجائے گا، فزیوتھراپی بھی ہوگی پھر، سو فی صد تو نہیں، لیکن کسی حد تک افاقہ ضرور ہوگا۔ لیکن ابھی یہ آپریشن بہت ضروری ہے، جتنی جلدی آپریشن ہوگا اتنا ہی جلد اچھا ہونے کی اُمید کی جاسکتی ہے۔

اسٹیون نے فارم پر دستخط کیے تھا اور جین بولی جو بھی آپ مناسب سمجھتے ہیں، کریں ہم لوگوں کو آپ پر پورا بھروسا ہے۔

بے ہوشی کے ڈاکٹر نے مریض کو دیکھ لیا ہے۔ وہ اور نیورو سرجن بالکل تیار ہیں۔ ''آپریشن کے بعد مریض انتہائی نگہداشت کے کمرے میں ستائیسویں منزل پر ہوگا۔ آپ لوگ وہیں چلے جائیں، لیکن آپریشن میں تقریباً دو گھنٹے لگیں گے۔ آپ لوگ وقت پر لے آئے مریض کو یہ بہت اچھا ہوگیا ہے، میرے لائق کوئی بات ہو تو ضرور بتایئے گا۔'' ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا تھا۔

''نہیں ڈاکٹر! کچھ نہیں، جو بھی ہوسکتا ہے آپ کر ہی رہے ہیں، ہمیں کوئی سوال نہیں کرنا ہے۔''

☆

شمیمہ نے فون پڑوس میں کیا تھا اور کہا کہ ماموں جان کے گھر سے کسی کو بلا دیں۔ ماموں جان تو کام پر جا چکے تھے، ممانی سے ہی بات ہوئی تھی۔ شمیمہ نے بتایا تھا کہ ابوجان فالج زدہ بے ہوش پڑے ہیں۔ جو پیسے گھر میں تھے وہ پرس سے چوری ہوچکے ہیں، ڈاکٹروں نے دوائیں لانے کو کہا ہے اور میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

ممانی نے تسلی دی تھی پھر کہا تھا کہ وہ کوشش کر کے دیکھتی ہیں اگر ماموں کو آفس میں خبر کرسکیں وہ وہاں ضرور پہنچیں گے۔

ممانی کی آواز سن کر اسے رونا آگیا تھا۔وہ آنسوؤں کو پونچھتی ہوئی پی سی او سے باہر نکلی تو کسی نے مخاطب کیا تھا، ''بہن جی! میں دوائیں لے دیتا ہوں آپ کو،

کیوں پریشان ہوتی ہیں...'' ایک آدمی اس کے ساتھ ساتھ ہی پی سی او کی طرف سے آیا تھا۔

''جی آپ کون ہیں؟ میں آپ کو جانتی تک نہیں ہوں،آپ کیوں خریدیں گے دوائیں میرے لیے؟'' اس نے رک کر پوچھا۔

''جی میں آپ کی باتیں سن رہا تھا لیکن اگر آپ کے پاس رقم نہیں ہے تو کیا ہوا، آپ کے ابو کو کچھ نہیں ہونا چاہیے، اگر بہت مسئلہ ہے تو آپ مجھے بعد میں پیسے لوٹا دیجیے گا۔ اس نے کافی شرافت سے یہ بات کہی۔

اسے نہ جانے کیوں اس شخص پر اعتبار سا ہوگیا تھا۔ ٹھیک ہے۔ ''آپ دوائیں دلادیں اور چل کر دیکھ لیں، میرے ابو میڈیکل فور میں ہیں، میں آپ کو رقم واپس کردوں گی۔'' کتنے اچھے لوگ ہوتے ہیں دنیا میں۔ اس نے اپنی دل کی گہرائیوں سے سوچا تھا۔ سول ہسپتال کے پیچھے کیزولٹی والے دروازے والی گلی میں جہاں مختلف میڈیکل اسٹور، ایکسرے کی دکانیں اور الٹراساؤنڈ کا بازار لگاہوا ہے، وہیں کی ایک دکان سے اس آدمی نے ساری دوائیں، سرنج، کیتھیٹر این جی ٹیوب، یورین بیگ اور کینولا دلایا تھا۔ دکان والے نے سولہ سو اٹھاسی روپے کا بل بنایا تھا جو اس نے فوراً ادا کیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وارڈ تک آیا تھا۔

سول ہسپتال میں تو کچھ ملتا نہیں تھا۔ دوائیں باہر کی دکانوں سے خریدی جاتی تھیں۔ ایکسرے کی دکانیں بھی کھلی ہوئی تھیں اور لیبارٹری بھی کھلے ہوئی تھی۔ دو بجے کے بعد زیادہ تر کام انھی جگہوں پر ہوتا تھا۔ ہسپتال کے ہی بہت سے ڈاکٹر اس کام میں شامل تھے۔ ان کے ایکسرے کے سینٹر تھے، الٹراساؤنڈ کی دکانیں تھیں، لیبارٹری انھوں نے ہی کھولی ہوئی تھی اور کئی میڈیکل اسٹوروز میں ان کی شراکت داری تھی۔

ابوجان کی وہی حالت تھی، بے ہوش، ساکت بلڈپریشر کچھ کم ہوگیا تھا، پیشاب کی تھیلی میں پیشاب جمع ہورہا تھا، ناک میں بھی ایک ٹیوب ڈالی جاچکی تھی۔

اسی وقت وارڈ کے بڑے پروفیسر انھیں دیکھنے آئے تھے۔ ڈاکٹر شازیہ کو وہ بتارہے تھے کہ اس قسم کے مریضوں کا انگلینڈ، امریکا میں فوراً سی ٹی اسکین کے بعد سر کا آپریشن کردیا جاتا ہے اور عام طور پر یہ لوگ صحیح بھی ہوجاتے ہیں، مگر ان بابا کا تو

مشکل ہی سے کچھ ہو سکتا ہے، سی ٹی اسکین اور آپریشن ممکن ہی نہیں ہے اور اگر دو چار دنوں میں ہوش نہیں آیا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

☆

جم مرے آپریشن تھیٹر سے جلدی ہی باہر آ گیا تھا۔ وہ لوگ آئی سی یو کے برابر والے کمرے میں بیٹھے ہوئے انتظار کر رہے تھے کہ ہسپتال کے ایک ملازم نے آ کر ان سے فارم بھروایا تھا۔ اس فارم میں پوچھا گیا تھا کہ مریض کے ہسپتال میں آنے کے بعد سے علاج کے شروع ہونے میں کوئی تاخیر تو نہیں ہوئی؟ ایمبولینس کا انتظام کرنے میں دیر تو نہیں لگی؟ ڈاکٹرں، نرسوں اور ہسپتال کے عملے کا سلوک غیرمناسب تو نہیں تھا؟ اسی طرح کے بہت سارے سوالات تھے جن کا جواب دینے میں دیر نہیں لگی۔ ہسپتال کے عملے کا سلوک بہت ہی اچھا تھا۔ انھیں کوئی بھی شکایت کسی سے نہیں تھی۔ بس اب صبح ہو جائے، اس نے سوچا تھا۔

وہ لوگ جم کو دیکھنے آئی سی یو گئے تھے، شیشوں کے پیچھے جم نظر آ رہا تھا۔ اس کا سر پٹیوں سے بندھا ہوا تھا اور جیسے وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

صاف ستھرے آئی سی یو کے اندر دھیمی سی پرسکون روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ صاف اور خوب صورت لباس میں چاق چوبند نرسیں کام کرتی نظر آ رہی تھیں۔ مریضوں کے چاروں طرف مختلف قسم کی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ انھیں اطمینان سا ہو گیا تھا کہ جم خیریت سے ہے۔ انھیں پوری امید ہو گئی تھی کہ جم اچھا ہو جائے گا اور تھوڑے دنوں میں ہی ہسپتال سے باہر دوبارہ اپنے گھر میں ہوگا۔ وہ لوگ اطمینان سے اپنے گھر چلے گئے۔

☆

''لڑکیاں تو تینوں ہی خوب صورت ہیں۔'' اس نے فون پر کسی سے کہا، بس خدشہ یہ ہے کہ بڈھا جلدی نہ مر جائے۔ ابھی تو صرف سولہ سو روپے ہی لگے ہیں، تھوڑا اور ادھار کی دوائیں آ جائیں تو پھر یہ لڑکی پھنس جائے گی۔ پھر وہی سب کچھ ہوگا جو پہلے ہوتا آیا ہے۔''

پہلے بھی یہی ہوتا آیا تھا، سول ہسپتال کے باہر اس قسم کے لوگ گھوم رہے

ہوتے ہیں، بچوں کے وارڈ سے پریشان ماؤں کو دوائیں خریدواتے ہیں، بوڑھے مریضوں کی بیٹیوں کو دوائیں خریدواتے ہیں اور آہستہ آہستہ جب قرض ہزاروں میں پہنچ جاتا ہے تو بچوں کی جوان مائیں اور بوڑھے مریضوں کی جوان بیٹیاں آس پاس کی ہی عمارتوں میں ہوس کا شکار ہوتی ہیں۔ عجیب بات ہے، بچوں کے علاج کے لیے عورت اپنے آپ کو قربان کرتی ہے اور ماں باپ کے علاج کے لیے بھی عورتیں ہی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ نہ کسی کو پتا ہے، نہ کسی کو پتا لگے گا۔ کون بتائے گا، کون کون لٹا ہے یہاں سے؟ خاموشی کی ایک سازش نے گھیرے میں لیا ہوا ہے ان تمام سرکاری ہسپتالوں کو۔ خاموشی کی اس سازش میں کیسی کیسی مائیں، کیسی کیسی بیٹیاں، کہاں کہاں پر کس کس کی نذر ہوگئی ہیں؟ کاش یہ گھروں پر ہی مر جایا کریں۔ اپنے چاہنے والوں کے درمیان اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اپنی بیٹیوں کے روتے ہوئے چہروں کو دیکھتے ہوئے، گھر کی چھایا میں۔

☆

''جم از ڈوئنگ ویل۔'' نرس نے فون پر کسی کو بتایا تھا۔ ''بیاسی سال کی عمر اتنی زیادہ بھی نہیں ہے۔ اس نے آنکھیں کھول لی ہیں، جسم کا آدھا حصہ ابھی تھوڑا ناکارہ ہے۔ اسے بولنے میں مشکل ہورہی ہے مگر لوگوں کو پہچانتا ہے۔ فزیوتھراپی اور مستقل دواؤں سے ضرور افاقہ ہوگا۔ میرے خیال میں اچھا ہوجانا چاہیے۔'' دور کنساس میں جم کی بیٹی کو یہ سن کر بہت سکون پہنچا تھا۔ اس کے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ ابھی تک نیویارک ہسپتال نہیں جاسکی تھی۔ اگلے ہفتے اس کا جانے کا پروگرام تھا۔ وہ روزانہ نرس سے فون کر کے خیریت پوچھ رہی تھی۔ جم آہستہ آہستہ صحیح ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ جم مر سکتا ہے۔ سال میں ایک دو دفعہ ہی ملاقات ہوتی تھی باپ سے مگر پھر بھی اسے اپنے باپ کا خیال رہتا تھا اور یہ سکون بھی کہ نیویارک شہر میں اگر وہ بیمار پڑتے ہیں تو فوراً علاج بھی ہوجائے گا اور ہوا بھی یہی تھا۔ اس نے سکون کی ایک سانس لی تھی اور شام کے کھانے کے لیے سوپ کا بڑا برتن چولہے پر چڑھادیا تھا۔ سردی میں بیل کی دم کا سوپ بچوں کو بہت اچھا لگتا تھا۔ اگلے ہفتے وہ ضرور نیویارک جائے گی، اس نے سوچا۔

☆

ابو جان کی طبیعت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ ایک دفعہ بھی ہوش نہیں آیا تھا۔ بلڈ پریشر کم کرنے کی دوا ہائڈرا لیزین کبھی ملتی تھی اور کبھی نہیں ملتی تھی۔ ایلڈومیٹ کے انجکشن لگ رہے تھے کہ یکایک ان کو تیز بخار ہونے لگا تھا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ شاید ملیریا ہوگیا ہے، جس کے لیے کلوروکوئن دیا جارہا تھا۔ پھر ایک دن ان کا پیشاب بھی سفید سفید سا آنے لگا تھا جیسے اس میں پس آرہا ہو۔

ڈاکٹروں نے ایک اور مہنگی اینٹی بائیوٹک لکھ دی تھی، ماموں جان نے کچھ پیسے دیے تھے، شمیمہ نے اسکول سے کچھ پیسے ادھار لیے تھے اور میڈیکل اسٹور اور اس آدمی کا ادھار چکا دیا تھا۔ اس کا ادھار ہزار سے زائد ہوچکا تھا اور ایک دن اس کی نظروں میں اس نے بہت کچھ پڑھ لیا تھا۔ وہ ڈرگئی تھی، خوف سے کانپ گئی تھی، فرشتے نما انسان کے دل میں جو کچھ تھا اس کے ہونے سے قبل ہی ادھار پورا کر دینا ضروری تھا۔ اس کی تو دو بہنیں تھیں، چھوٹی خوب صورت اور جوان۔ ابو جان تو نہ جانے کب اچھے ہوں گے، کچھ ڈاکٹر اور کچھ وارڈ میں موجود لڑکوں کی نظروں سے وہ خوف زدہ ہوکر راتوں کو کپکپاتی رہتی تھی۔ زندگی اس قدر تلخ ہوجائے گی اور وہ بھی یکایک اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ کتنی ذمہ داریاں آن پڑی تھیں۔ ابو کی طبیعت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اپنے ساتھ بہنوں کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اسی کی تھی۔ روپے ختم ہو چکے تھے اور چاروں طرف کی دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا جس پر بھروسا کیا جاسکتا تھا۔

آج اس نے گھر سے صاف چادر لاکر ابو کے لیے بچھائی تھی۔ تولیے کو گرم پانی میں بھگو کر ان کے چہرے کو ہاتھوں کو، شانوں کو، جسم کو، بالوں کو صاف کیا تھا۔ بستر کے گدے کے نیچے کھٹمل مارنے کی دوا ڈالی تھی۔ ہسپتال کے پتھر کی طرح سخت تکیے کے بدلے میں گھر سے تکیہ لاکر ان کے سر کے نیچے رکھا تھا۔ ہسپتال کے گندے بدبودار پھٹے ہوئے لال کمبل کی جگہ اپنے کمبل سے ابو کے جسم کو ڈھانپا تھا۔ تھکے ہوئے جسم سے بدبو سی اُٹھ رہی تھی اور چہرہ صاف کرنے کے باوجود ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی سایہ ہو۔ پانچ دن میں وہ گھل کر رہ گئے تھے اس نے انھیں غور سے دیکھا اور بغیر آواز کے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بہہ نکلی۔

☆

چھٹے دن جم کو وارڈ میں بھیج دیا گیا تھا۔ اس نے جین کو پہچانا تھا، آہستہ آہستہ کچھ کہا بھی تھا اور ہاتھ بڑھا کر جینیفر کے ہاتھوں کو پکڑ بھی لیا تھا... کمرے میں دن بھر مختلف لوگوں کی لائن لگی ہوئی تھی، صبح نرسوں نے آکر سب کچھ صاف کیا تھا۔ پھر ڈائی ٹیشئن کے لکھے ہوئے کھانے کے مطابق انھیں کھانا دیا گیا تھا۔ ایک نرس نے بڑی احتیاط سے اور بڑے پیار سے آہستہ آہستہ انھیں کھانا کھلایا تھا، پھر سینے کے ڈاکٹر نے آکر انھیں دیکھا تھا، اس کے بعد سرجن نے آکر زخم دیکھے تھے، پھر نیورولوجسٹ نے آکر فالج کے اثرات کو سمجھنے کی کوشش کی تھی، پھر فزیوتھراپی والے آگئے تھے اور جسم کے ہر حصے کو آہستہ آہستہ پیار سے ورزش کرائی گئی تھی، کچھ حصوں پر مالش بھی کی گئی تھی۔ نرسوں نے جسم کے ایک ایک حصے کو آج ذرا تفصیل سے صاف کیا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ سے مختلف ٹیسٹ کرنے کے لیے خون لیا گیا تھا۔ دوپہر کو کھانا کھلایا گیا تھا، پھر وہ سوگئے تھے۔ شام کو سائیکلوجسٹ نے آکر دیکھا تھا۔ جلد کے اوپر پڑے ہوئے نشان کو دیکھنے کے لیے جلد کا ڈاکٹر آیا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے پورا ہسپتال بیاسی سال کے بوڑھے کو بچانے کے لیے بے قرار سا ہوگیا ہے۔ زندگی رک گئی تھی۔ چہرہ دمک رہا تھا۔ اتنے بڑے آپریشن کے باوجود۔

جم کے بچوں سے مشورے کے بعد یہ طے ہوا تھا کہ جم دس بارہ دن کے بعد نرسنگ ہوم میں چلا جائے گا جہاں تربیت یافتہ نرسیں اور فزیوتھراپی کے ماہر جم کو آہستہ آہستہ معمول پر لانے کی کوشش کریں گے۔ وہ وہاں سوئمنگ پول میں نہا سکے گا، اخبار پڑھ سکے گا اور ٹیلی وژن کے پروگرام بھی دیکھ سکے گا۔ شاید دوبارہ کمپیوٹر کے اوپر اپنے بچوں کو پیغامات دے سکے گا، ان کے پیغامات پڑھ بھی سکے گا... وہاں ہر شعبے کے ماہر ڈاکٹر اسے دیکھ سکیں گے اور کسی بھی ہنگامی صورت حال میں فوری توجہ مل سکے گی۔

☆

چھٹے دن یکایک سب کچھ ہوگیا تھا، بخار بھی کم نہیں ہوا تھا، آنکھیں بھی نہیں کھلی تھیں، ہوش بھی نہیں آیا تھا اور انھوں نے جان دے دی۔ نہ کوئی شور اُٹھا، نہ انھوں نے بیٹیوں کے ہاتھ کو پکڑ کر وصیت کی، نہ کسی کے آنسو دیکھے، نہ کسی کو اپنے آنسو دکھائے، خاموشی سے لڑ لڑ کر تھک تھک کر جان دے دی۔ باسٹھ سال کی عمر میں

سول ہسپتال کے گندے سے بستر پر زندگی جتنی مزاحمت کر سکتی تھی، کرتی رہی، مزاحمت کا خاتمہ مسکراتی ہوئی موت نے بہت آسانی سے کر دیا تھا۔

میلی سی چادر میں لپٹی ہوئی لاش نہ جانے کیا کیا کہانیاں سنا رہی تھی۔

❑

عام سی لڑکی

وہ ایک عام سی لڑکی تھی جیسی اور بہت ساری عام سی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ نہ اس کا چہرہ زی ٹی وی پر نظر آنے والی لڑکیوں جیسا تھا نہ اس کے بال ان کے انداز میں بنائے گئے تھے، نہ اس کی ادائیں ان کی طرح تھیں، نہ وہ ان کی طرح بات کرتی تھی نہ وہ ان کی طرح چلتی تھی اور نہ اس کی ناف زی ٹی وی پر دکھائی دینے والی لڑکیوں جیسی تھی۔ میں نے زی ٹی وی پر آنے والی لڑکیوں اور انڈین فلم کی ایکٹریسوں کی نافوں کا بہت تفصیلی مشاہدہ کیا تھا بلکہ ہم دوستوں نے تو ایک طرح کی درجہ بندی بھی کی ہوئی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان لڑکیوں کے پیٹ کو ہم نے حصوں میں بانٹا ہوا تھا۔ عام طور پر دبلی پتلی حسین لڑکیوں کی ناف عمودی ہوتی تھی اور جو لڑکیاں تھوڑی موٹی ہوجاتی تھیں ان کی ناف گول ہوجاتی تھی۔ اور جو زیادہ موٹی ہوجاتی تھیں ان کی ناف متوازی اور سیدھی ہوجاتی تھی اور جیسے جیسے چربی کولہوں اور پسلیوں پر چڑھتی جاتی تھی ویسے ویسے ناف کی شکلیں بھی جیومیٹری کے مختلف انداز میں پھیلتی یا سکڑتی رہتی تھی۔ اس فرق کا اندازہ مادھوری ڈکشٹ، جوہی چاولہ اور ایشوریا رائے کے پیٹ کو دیکھ کر ہوسکتا تھا... اور مزید فرق دیکھنے کے لیے ہالی ووڈ کی ایکٹرسوں اور لندن، پیرس کی ماڈل لڑکیوں کی نافوں کا تقابلی جائزہ لینے میں کوئی برائی نہیں تھی۔ یورپ کی لڑکیوں کی ناف ذرا مختلف ہوتی ہے کیوں کہ وہ بچپن سے ہی مختلف قسم کی ورزشوں میں لگ جاتی

ہیں۔ اس کا اندازہ جولیا رابرٹس، نکول کڈمین اور اب جنیفر لوپاز کی ناف دیکھ کر ہوسکتا تھا۔ ہر نسل، ہر قوم اور ہر رنگ کی عورتوں کی ناف کے بارے میں، میں نے بہت مواد جمع کیا ہوا تھا۔ دوست کہتے تھے کہ میں اس کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھ سکتا ہوں۔ چلیے چھوڑیے، بات لمبی ہو جائے گی۔ یہ تو ایک نہ ختم ہونے والی کہانی ہے۔

میں بات کر رہا تھا سلمٰی کی۔ سلمٰی بالکل عام سی لڑکی تھی۔ میرے خوابوں کی لڑکیوں سے مختلف۔ میرے تصور کی حسینہ سے جدا، میرے ذہن کے کینوس پر بنی ہوئی تصویر سے بہت دور اور زی ٹی وی پر نظر آنے والی والی ایکٹرسوں کا تو شائبہ تک نہیں تھا اس میں... وہ میری بیوی تھی۔ ایک عام سی عورت، ایک عام سی بیوی جیسی ساری بیویاں ہوتی ہیں۔ کوئی خاص بات نہیں تھی اس میں۔

میرے ڈیڈی کے ڈی اے میں کام کرتے تھے۔ تین بہنوں کے بعد میں پیدا ہوا تھا اور بڑی شان سے، بڑے پیار سے رکھا گیا تھا مجھے۔ عہدہ تو ان کا کوئی بڑا نہیں تھا مگر اوپر کی آمدنی کافی تھی۔ کے ڈی اے نے کراچی کی ڈیویلپمنٹ شاید اتنی نہیں کی تھی جتنی ڈیویلپمنٹ کے ڈی اے میں کام کرنے والوں نے کی تھی۔ ہم سارے بچے انگلش اسکولوں میں پڑھتے، گھر میں اچھا کھانا کھاتے، اچھے کپڑے پہنتے تھے۔ میرے پاس جوتوں کی کئی جوڑیاں تھیں۔ اسکول جانے کا جوڑا الگ، شام کو پہننے کے لیے کرپچ کے جوتے اور رشتے داروں کے گھر جانے کے لیے الگ کالے اور بھورے شوز۔

ہمارے غریب رشتے دار ہم سے کافی جلتے تھے، ہمارے گھر میں جو کچھ تھا وہ ان کے گھروں میں نہیں تھا... نہ بڑا سا کلر ٹی وی، نہ ریفریجریٹر، نہ پنکھے، نہ وی سی آر اور نہ ایئرکنڈیشنر۔ ان کے جلنے کی وجہ صاف تھی اور میرے ڈیڈی کے بارے میں اُلٹی سیدھی بکواس بھی وہ لوگ اسی لیے کرتے تھے۔ آج کل کے زمانے میں کون رشوت نہیں لیتا ہے۔ حکومت کی چھوٹی سی تنخواہ میں تو زکام کا علاج بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ اور کیوں کہ وہ لوگ خود سرکاری ملازم نہیں تھے یا کسی ایسی جگہ نہیں تھے جہاں اوپر کی آمدنی ہو تو ان کا جلنا بھی بالکل فطری تھا۔ میں سمجھتا تھا اس بات کو کہ یہ تو انسان کی فطرت ہوتی ہے۔ ایمان داری کے وعظ کرنا بڑا آسان ہے اور موقع ملنے پر ایمان داری کرنا ذرا سا نہیں بے حد مشکل کام ہے۔ لوگ سمجھتے نہیں ہیں اس بات کو۔ اگر یہ بات ان

کی سمجھ میں آجائے تو ان کو یہ سارا نظام سمجھ میں آجائے گا۔ میں اس نظام کو اچھی طرح سمجھتا تھا بالکل اپنے ڈیڈی کی طرح۔

بڑی کوشش کے باوجود بھی میں دسویں میں اوّل نہیں آسکا تھا۔ انٹر میں ڈیڈی نے کوشش کی تھی اور محکمۂ تعلیم میں کام کرنے والے ایک صاحب کو لاکھ روپے دے بھی دیے تھے مگر آخر وقت میں کراچی بورڈ میں کچھ انکوائری شروع ہوگئی تھی اور میری فرسٹ ڈویژن نہیں آسکی تھی جس کی وجہ سے میرا داخلہ میڈیکل کالج میں نہیں ہوسکا۔ اس نظام میں ایسا کبھی کبھی ہوجاتا ہے کہ کام رک جاتے ہیں اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب اپنے تئیں کوئی ایک ایمان دار آدمی نظام کو صحیح کرنے کے چکر میں لگ جاتا ہے، انکوائری شروع ہوجاتی ہے، لوگوں کو معطل کیا جاتا ہے، کبھی کبھی کچھ لوگ نکال بھی دیے جاتے ہیں مگر نظام خود ہی ان حالات کو صحیح بھی کر دیتا ہے۔ اس نظام کی طاقت ہی اسی میں ہے۔ وہی ایمان دار لوگ معطل ہوتے ہیں اور اکثر ان کا قتل ہوجاتا ہے۔ نظام پھر چل نکلتا ہے۔ یہ قسمت کا کھیل تھا کہ اس وقت کراچی بورڈ میں یہ سب کچھ شروع ہوا تھا۔

میں نے گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں بی ایس سی میں داخلہ لے لیا اور امریکا جانے کے پروگرام بنانے لگا تھا۔ ایک دفعہ ٹوفل امتحان بھی دیا مگر بہت کم نمبر آئے اور ویزا نہیں ملا۔ میں نے سوچا تھا کہ پھر کوشش کروں گا۔

ایک رات اچانک میرے ڈیڈی کے سینے میں درد اُٹھا اور جب تک ہم ہسپتال پہنچے، وہ دم توڑ چکے تھے۔ یہ حادثہ یکایک ہی ہوگیا تھا۔ کوئی بھی تیار نہیں تھا اس کے لیے۔ مجھے تو کچھ سمجھ ہی نہیں تھی۔ جب قبر کی مٹی ٹھنڈی ہوئی تو اندازہ ہوا تھا کہ ڈیڈی مجھے دنیا میں بالکل اکیلا چھوڑ گئے تھے۔ وہ تو بھلا ہو رضی انکل کا، انھوں نے مجھے ایک دن بلایا تھا اور کے ڈی اے میں ہی کلرک کی نوکری دے دی تھی۔ سرکاری محکموں میں یہ اچھا نظام ہے کہ باپ کی موت پر اور خاص طور پر اگر یکایک ہو تو محکمہ بچوں کا خیال رکھتا ہے، مگر پاکستان کے خراب ہونے والے حالات میں اب تو یہ روایت بھی ختم ہوتی جارہی ہے۔ میں ذرا خوش قسمت تھا۔

میرا امریکا کا خواب صرف خواب ہی رہا تھا اور میں گھر اور دفتر کے چکروں

میں پھنس گیا تھا۔ میری امی کو پتا تھا کہ ابو کیا کیا چھوڑ کر گئے ہیں۔ پرائز بانڈ، زیورات، اور میری ماں کے نام دو پلاٹ تھے۔ چار سال میں تینوں بہنوں کی شادیاں ہوچکیں تو ان کے جہیز میں بہت کچھ دینے کے بعد ہمارے پاس ہمارے گھر اور کچھ دکانوں کے علاوہ کچھ نہیں رہا تھا۔ پرائز بانڈ اور زمینیں بیچ کر میری امی نے بڑی عقل مندی سے جہیز اور نقد رقم دے کر میری بہنوں کے لیے قابل شوہر خریدے تھے۔ وہ سب اپنے اپنے گھروں میں خوش تھیں۔ میرے ڈیڈی کا یہی پلان رہا ہوگا۔

میرے معاملے میں میری امی سے بڑی غلطی ہوگئی۔ پہلے تو میں شادی کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ کنواری زندگی بھی کیا شان دار زندگی ہوتی ہے۔ دوستوں کا ایک گروپ تھا۔ دفتر اور دفتر کے بعد گھومنا پھرنا، پارٹی، پکنک، شور شرابا، ہو ہاؤ اور ہوڑ ہپہ۔ رات گئے تک کیبل پر فلم دیکھنا اور شہر کی مختلف لڑکیوں کو لارا لپا دے کر موج اُڑانا۔ کراچی بھی کیا خوب جگہ ہے کنواروں کے لیے اور خاص طور پر ہمارے جیسے کنواروں کے لیے جن کے پاس کچھ پیسہ بھی ہوتا ہے، اشیائے خورد و نوش سے لے کر شراب و شباب تک ہر چیز حاصل ہو جاتی تھی۔ گھروں کے اندر ڈسکو اور گھروں کے باہر سمندر کے ساحلوں سے لے کر سمندر میں چلتے پھرتے عیاشی کی جگہیں۔ امریکا میں شاید زیادہ مزے ہوتے ہوں گے۔ مگر جو مزہ کراچی کا ہے اس معاملے میں، وہ کہیں بھی نہیں ہو سکتا۔

میری امی کو بھی سب پتا ہی تھا۔ پھر یکایک انھوں نے میری شادی کا فیصلہ کیا، لڑکی پسند کرلی، مجھے بتایا اور ساتھ شادی کی تاریخ بھی طے کر ڈالی اور سلمٰی میری زندگی میں آگئی... میرے دوستوں نے سلمٰی کو دیکھ کر کہا تھا کہ میری تو قسمت کھل گئی ہے۔ ان کے خیال سے بڑی خوب صورت تھی وہ، مگر مجھے تو وہ معمولی شکل صورت کی ہی لڑکی لگی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی ناف بھی زی ٹی وی والی لڑکیوں جیسی نہیں تھی۔ میرے باپ کے بنائے ہوئے پیسوں کے عوض ماں نے میری بہنوں کے لیے خوشیاں خریدی تھیں۔ بڑی دُھوم سے ان کی ڈولیاں اُٹھائی تھیں، بہت سارے ہمارے ایمان دار رشتہ داروں نے اپنے بچوں کے لیے میری بہنوں کا ہاتھ مانگا تھا۔ جہیز کی طاقت کا اندازہ مجھے اسی وقت ہوا تھا۔

ہوتا یہ ہے کہ جب لڑکوں کی شادی ہوتی ہے تو ان کی زندگی بن جاتی ہے۔ میری بہنوں کے شوہروں کے ساتھ یہی ہوا تھا، میرے کئی دوستوں کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ ان کی بیویاں گھر کے لیے جہیز بھر کر لائی تھیں، زیورات لے کر آئی تھیں اور ان کے شوہروں کو نقد رقم بھی ملی تھی۔ کسی کو کار بھی ملی تھی، کسی کو مکان بھی ملا تھا۔ میمن گھروں میں شادی کرو تو نہ صرف یہ کہ مکان ملتا ہے بلکہ مکان کے اندر پیاز، ہلدی، لہسن تک ڈالوا کر لڑکی دی جاتی ہے۔ آج کل تو یہ سلسلہ بھی چل نکلا ہے کہ دولت اور جہیز کے ساتھ نوکری کا بھی انتظام کیا جاتا ہے اور بات یہ ہے کہ آخرکار یہ ساری چیزیں بیٹی کے لیے ہی تو ہوتی ہیں۔

سلمٰی کوئی خاص ساز و سامان لے کر نہیں آئی تھی۔ ان لوگوں کا اپنا گھر اچھا تھا اور وہ ٹھیک ٹھاک طریقے سے رہتے تھے۔ امی کو بھی رہن سہن سے دھوکا ہوا تھا کہ سلمٰی کو بہت کچھ ملے گا۔ جو کچھ بھی اسے ملا تھا وہ ہمارے لحاظ سے صحیح نہیں تھا، کم تھا۔ زندگی کا یہ بہترین موقع مجھ سے چھن گیا تھا۔ مجھے اپنی ماں کے اندھے پن پر شدید غصہ تھا۔

سلمٰی کو پہلے دن سے ہی مجھ سے عشق سا ہوگیا تھا۔ میں اس کی زندگی میں پہلا مرد تھا۔ اس نے شادی، اچھا شوہر، اچھا سا گھر اور چھوٹے سے بچوں کے چھوٹے سے گھرانے کا خواب دیکھا تھا۔ ساری لڑکیاں ایسے ہی خواب دیکھتی ہیں۔ مگر یہ خواب تو صرف خواب ہی ہوتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں خوابوں کا کیا کام۔ میرے خواب بھی یہی تھے مگر ذرا مختلف انداز سے مختلف طریقے سے وہ بھی بکھر گئے تھے۔ بڑی غلطی ہوگئی تھی ہم لوگوں سے۔

ولیمے سے پہلے ہی میری امی نے سلمٰی کے گھر والوں کو بتادیا تھا کہ ہم لوگ جہیز میں بہت کچھ اُمید کر رہے تھے، آپ لوگ ولیمے کی سلامی میں کسر پوری کر دیں۔ نقد روپے بھی مل جائیں تو کسی نہ کسی طریقے سے کسر پوری ہو جائے گی۔ اس کے گھر والے بھی بالکل ہی احمق تھے بلکہ بدتمیز بھی۔ انھوں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ ولیمے کی تقریب کے لیے میں نے بڑے انتظامات کیے تھے مگر مجھے سب کچھ پھس پھسا سا لگ رہا تھا۔ میری شادی مجھے کسی کا تعزیتی جلسہ معلوم ہو رہی تھی۔

ولیمے کے دوسرے دن امی نے سلمیٰ کے ابو سے بات کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہمیں تو نہیں پتا تھا کہ آپ لوگوں کو کتنا جہیز اور کتنی رقم چاہیے۔ اگر ہمیں پتا ہوتا تو ہم یہ رشتہ ہی نہیں کرتے کیوں کہ اتنی تو ہماری حیثیت ہی نہیں تھی۔

''مگر آپ لوگوں نے یہ تو کہا تھا کہ مناسب جہیز وہیز دیا جائے گا۔ یہ تو کوئی مناسب جہیز نہیں تھا۔ آپ لوگوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے اپنی بیٹیوں کو کیا دیا ہے؟''

سلمیٰ کی ماں اور باپ دونوں چاپلوسی کی زبان بولتے رہے کہ ہماری یہ حیثیت نہیں ہے، ہماری تو اور بھی بیٹیاں ہیں ہماری لڑکی پڑھی لکھی ہے۔ بڑی محنت سے پڑھا ہے اس نے، اچھی جگہ کام کرتی ہے، کچھ کما کر ہی لاتی ہے۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر دیا ہے ہم لوگوں نے وغیرہ وغیرہ۔

یہ عجیب وغریب باتیں تھیں۔ مجھے اپنے سسرال سے شدید نفرت ہوگئی تھی۔

اس رات سلمیٰ روتی ہوئی میرے پاس بیٹھ گئی۔ میرے قدموں کو اس نے اپنے گالوں سے لگالیا۔ رک رک کر آہستہ آہستہ بولی، ''دیکھئے میں آپ سے التجا کر رہی ہوں۔ میرے والد بڑے شریف آدمی ہیں بڑی محنت سے ایمان داری سے سرکاری نوکری کرتے ہیں، شام کو ایک اور نوکری کرتے ہیں تو ہمارے گھر کا خرچ چلتا ہے۔ ہم تینوں بہنوں اور دو بھائیوں کو بڑی اچھی تعلیم دے رہے ہیں۔ میں بڑی ہوں، کمپیوٹر سیکھا ہے میں نے۔ اچھی نوکری ہے میری۔ میں بہت اچھی طرح سے چلالوں گی گھر۔ آپ جہیز کی فکر نہ کریں۔

اس طرح کی باتیں فلموں، ناولوں میں تو اچھی لگتی ہیں اور ایسے سین میں نے زی ٹی وی پر چلنے والے ڈراموں میں دیکھے بھی بہت تھے۔ مگر حقیقی زندگی میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی تنخواہ مجھ سے زیادہ ہی تھی۔ مگر میری اوپر کی آمدنی ہم دونوں کی تنخواہوں سے کہیں زیادہ تھی۔ مجھے غصے میں بھی ہنسی آ گئی تھی۔ ''تنخواہوں سے گھر نہیں چلتے ہیں۔'' میں نے دانت پیس کر کہا تھا۔ ''میری بہنیں آفسوں میں کام نہیں کرتی ہیں، گھروں میں عیش کرتی ہیں کیوں کہ ہم نے انھیں جہیز میں سب کچھ دیا ہے۔ ایسے شوہر خرید کر دیے ہیں جو ان کے ناز نخرے اٹھاتے ہیں۔

ان سے محبت کرتے ہیں اور اگر انھیں اب بھی کوئی ضرورت ہوتی ہے تو میں پورا کر دیتا ہوں۔ مجھے تم سے نوکری نہیں کرانی ہے۔ عورت کی کمائی ویسے بھی اسلام میں جائز نہیں ہے۔ ہمارے گھر کی عورتیں دفتروں میں کام نہیں کرتی ہیں۔ باہر کے کام ہمارے، گھر کے کام ان کے۔ تمھیں نوکری چھوڑنی ہوگی۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جب تمھارے باپ کی یہ حیثیت نہیں تھی تو مجھ سے شادی کیوں کی تھی انھوں نے؟ یاخدا! میں کہاں پھنس گیا...؟"

وہ رات بھر روتی رہی اور میں رات بھر غصے میں سوتا جاگتا رہا۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میرے بڈھے سسر نے اگر ایمان داری کے مردہ گھوڑے پر سواری کرنی تھی تو اتنی اچھی سرکاری جگہ پر کیوں قبضہ کیا ہوا تھا۔ عجیب لوگ ہیں کام کریں گے کے ڈی اے میں، کے ایم سی میں، کسٹم میں، انکم ٹیکس میں اور ایمان داری کے احوال کا باجا بجاتے رہیں گے۔ ان لوگوں کی وجہ سے سسٹم فیل ہوتا ہے۔ کوئی کام اسموتھلی ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ کوئی اصول، کوئی قانون، کسی قاعدے کا کوئی پھٹا ہوا غبارہ لے آتے ہیں نہ خود کچھ کرتے ہیں اور نہ کسی اور کو کچھ کرنے دیتے ہیں۔ ہم لوگوں کو اگر اندازہ ہوتا کہ سلمٰی کے گھر ایمان داری کی نحوست پھیلی ہوئی ہے تو ہم رشتہ بھیجتے ہی نہیں۔ ان لوگوں کو شادی سے پہلے بتانا چاہیے تھا کہ ہم لوگ ایمان دار ہیں، ہمارے گھر میں فاقہ ہے، ہمارے بچوں کو تکلیفیں اُٹھانی ہیں، زندگی کا بوجھ لے کر چلنا ہے۔ نہ جانے کس زمانے کے دقیانوسی لوگ تھے وہ لوگ۔

دوسرے دن امی اور میری بہنیں بھی جمع ہوئی تھیں اور میری قسمت کے پھوٹنے کا ماتم سلمٰی کے سامنے کرتی رہی تھیں۔ میرے سامنے صاف راستہ تھا۔ اگر جہیز کی صورت میں کم از کم نئی گاڑی ہی مل جائے تو میں طلاق نہ دوں، سب کا یہی خیال تھا۔

سلمٰی نے میری بہن سے کہا تھا، "ہمارے گھر میں جو کچھ بھی ہے وہ صرف ہماری ماں کی کفایت شعاری ہے اور ہم دو بہنوں اور باپ کی مشترکہ کوششوں سے اچھی طرح کا رہن سہن ہے مگر اتنی حیثیت کہاں ہے کہ آپ لوگوں کے مطالبے پورے کیے جاسکیں۔ دیکھیں میں پڑھی لکھی ہوں اچھی نوکری ہے میری، میں بہت کچھ کرلوں گی۔

ایسی باتیں نہ کریں، ابھی تو میری اور بہنوں کی شادیاں ہونی ہیں۔"

"ارے، اگر نوکری کرا کر ہی گھر بھرنا تھا تو کسی رنڈی سے شادی نہ کرا لیتے اپنے بھائی کی۔ اگر تم نوکری کروگی تو کون دیکھے گا میری ماں کو۔ کون خدمت کرے گا ان کی؟" میری بہن نے چیخ کر جواب دیا تھا اور ٹھیک ہی جواب دیا تھا۔

اس قسم کے الفاظ اچھے نہیں ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کو نہیں بولنا چاہیے لیکن اگر کسی کی سمجھ میں کچھ آ ہی نہ رہا ہو تو چارہ کیا ہے۔ سلمیٰ یہ سمجھ ہی نہیں رہی تھی کہ اس کی نوکری سے میری کتنی سبکی ہوگی اور گھر میں نئی کار نہ آنے سے جو بے عزتی ہوتی ہے اس کا تو کوئی احساس ہی نہیں تھا اس کو، خاص طور پر ایسی صورت حال میں جب اچھے خاصے جہیز والے رشتوں کو ہم لوگوں نے منع کر دیا تھا۔ دُنیا تھوتھو کر رہی تھی ہم لوگوں پر۔ ہمارے ڈیڈی کتنے ذہین تھے اور ہم لوگ کتنے بے عقل۔ مجھے اپنے پورے خاندان پر شدید غصہ آیا تھا۔

مگر میری بہنوں کی چیخ، میرا سمجھانا کچھ بھی سمجھ نہیں آیا تھا سلمیٰ کو، نہ سلمیٰ کے باپ کو، نہ سلمیٰ کی ماں کو۔ عجیب لوگ تھے وہ، عجیب خاندان تھا ان کا۔ اگر ان کو جہیز وغیرہ نہیں دینا تھا تو مجھ سے شادی ہی نہ کرتے، کچھ پتا تو کرتے ہمارے بارے میں، ہمارے خاندان کے بارے میں۔ کچھ نہیں کیا تھا ان لوگوں نے۔

میری زندگی کسی خراب بلب کی طرح فیوز ہوگئی تھی۔ جس طرح بچپن میں، میں فیوز بلب کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو ہلاجلا کر جلنے کے قابل بنا دیا کرتا تھا اسی طرح کا موقع سلمیٰ کے خاندان کو بھی دیا تھا میں نے، مگر ان لوگوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔ ارے مکان ہی بیچ دیتے، کسی سے قرض لے لیتے، بیٹیوں کی شادی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا جاتا ہے اور ان لوگوں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ تار ٹوٹے ہی رہے تھے میں فیوز بلب کی طرح بے رونق، بے روشنی کے اندھیروں میں کھو کر رہ گیا تھا۔ اب تو میں دوستوں میں بھی اُٹھنے بیٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ رشتے دار کہتے تھے، تمھیں صحیح جوڑ نہیں مل سکا، کہاں پھنسے ہو جا کر... میری ماں اور بہنیں میری مجرم بن کر میرے سامنے کھڑی تھیں۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں اپنی مرضی سے کسی کالج کی لڑکی سے شادی کر لیتا جنھیں بے وقوف بنایا کرتے تھے ہم لوگ۔ غریب تو بہت مل جاتے ہیں

شادی کرنے کے لیے۔

بڑے تلخ ماحول میں اور بڑے ہی دل شکن حالات میں، میں اور سلمٰی میاں بیوی کی طرح سے رہ رہے تھے۔ وہ مجھے، میری ماں کو، میری بہنوں کو خوش کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھی اور میں روز بہ روز اس ناانصافی سے مکدر ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ہائے ری قسمت! ہائے ری قسمت!...

میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ یہ دوسرا موقعہ تھا جب قسمت نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ ایک جب کراچی بورڈ میں انکوائری کی وجہ سے میں فرسٹ ڈویژن میں پاس نہیں ہوسکا اور دوسری دفعہ میری ماں بہنوں کی حماقت کی وجہ سے جب وہ کوئی انکوائری ہی نہ کرسکیں کہ سلمٰی کے گھر والے آج کل کے زمانے میں کتنے ان فٹ ہیں اور میں ان ابنارمل لوگوں میں پھنس گیا تھا۔

بہت دن نہیں گزرے تھے کہ وہ حادثہ ہوگیا، باورچی خانے میں کسی نے گیس کا بٹن کھلا چھوڑ دیا تھا اور سلمٰی نے جاکر جیسے ہی لائٹر سے چولھا جلانے کی کوشش کی تھی کمرے میں آگ بھر گئی۔ وہ اپنے نائیلون کے کپڑے کے ساتھ بالکل ہی جل کر رہ گئی تھی۔

بڑی مشکل سے میں نے اسے ہسپتال پہنچایا تھا۔ بہت کم دیر وہ زندہ رہی تھی وہاں اور۔ میری نظروں کے سامنے اپنے ماں باپ کے آنے سے بہت پہلے جان دے دی تھی اس نے۔

میں نے کہا ناں کہ سلمٰی عام سی لڑکی تھی، پڑھا لکھا ہونے کے باوجود اور ان عام سی لڑکیوں کی طرح وہ خاموشی سے جل کر مرگئی تھی۔ نہ کوئی شور ہوا نہ کوئی ہنگامہ، نہ اس نے مرنے سے پہلے میرے ہاتھوں کو ہاتھ میں لے کر کچھ کہا، نہ مجھ سے معافی مانگی، نہ میری ماں سے کچھ کہا۔ بے وقوف اتنی تھی کہ اپنے ماں باپ تک کا انتظار نہیں کیا تھا اس نے۔ ہسپتال پہنچی تھی اور ڈاکٹروں کے آنے سے پہلے ہی درد کی شدت سے بغیر چیخ پکار کے مرگئی تھی۔ مرنے سے قبل صرف پتھرائی ہوئی آنکھوں سے کچھ تکتی رہی تھی جیسے کسی ویرانے میں کچھ تلاش کررہی ہو، جیسے کسی کو کچھ کہنا چاہ رہی ہو، یہ اچھا ہے کہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے کوئی ایف آئی آر نہیں کٹ سکتی ہے۔ وہ ان آنکھوں

کے ساتھ بغیر کسی احتجاج کے جسم چھوڑ گئی تھی۔

بہت عام سی لڑکی تھی وہ۔ معمولی شکل و صورت والی جیسی بہت ساری عام سی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ نہ اس کا چہرہ زی ٹی وی پر نظر آنی والی لڑکیوں جیسا تھا نہ ہی وہ ان کی طرح دراز قامت تھی اور نہ ہی اس کی ناف...

❐

شہر برباد کی ڈھول

بڑی سی واشنگٹن فلائر کی ٹیکسی کے لمبے چوڑے گورے چٹے ڈرائیور نے میرا سوٹ کیس اور بیگ اٹھا کر ڈگی میں ڈالا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ میرے لیے کھول دیا۔ مجھے پیچھے بیٹھنے میں ہمیشہ کوفت ہوتی ہے۔ میں آگے کا دروازہ کھول کر آگے ڈرائیور کی سیٹ کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ وہ بھی پچھلا دروازہ بند کر کے فوراً ہی اپنی سیٹ پر آن بیٹھا تھا۔

''ہاؤ آر یو؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''الحمد للہ، فائن تھینکس گاڈ۔'' میں چونک گیا، کسی گورے کے منھ سے الحمدللہ؟

ڈیلس ایئرپورٹ واشنگٹن پہنچ کر مجھے ٹیکسی پکڑنی تھی اور پراچہ کے آفس پہنچنا تھا۔ امریکا میں کلینک کو آفس کہتے ہیں۔ پراچہ ورجینیا میں آنکھوں کا ڈاکٹر تھا، مجھے اس کے پاس ہی رہنا تھا اور واشنگٹن میں ہی ایک پانچ روزہ کانفرنس میں شرکت کرنی تھی۔ یہ کانفرنس دُنیا میں تہذیبوں کے عروج و زوال کے موضوع پر منعقد کی جا رہی تھی۔ کانفرنس میں نسل، ذات اور زبانوں کے نام پر قتل و غارت گری کے حوالے سے بھی بات ہونی تھی۔ یہ کانفرنس واشنگٹن میں کتابوں کے ایک ادارے اور واشنگٹن یونی ورسٹی کے تعاون سے ہو رہی تھی۔ نہ جانے یہ لوگ تہذیبوں کے عروج و زوال پر ماتم کر کے کیا سیکھنا چاہ رہے تھے۔ ان کی تو تہذیب بھی محفوظ تھی اور انھوں نے تو تاریخ سے سیکھا

بھی تھا جس کے مطابق وہ اپنا ملک چلا رہے ہیں۔ یہ کانفرنس ہونی تو ہمارے ہاں چاہیے تھی جہاں تہذیبیں مٹ رہی ہیں، زبانیں موت کے گھاٹ اُتاری جا رہی ہیں، نسلوں کا خاتمہ ہو رہا ہے، ذاتیں، ذات کے نام پر ہی خاموشی سے مٹتی چلی جا رہی ہیں۔ یہ بات کسی کو سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

میں تاریخ پڑھاتا تھا اور تاریخ ہی میرا اوڑھنا بچھونا تھا۔ پاکستان میں تاریخ پڑھانے والے پروفیسر کی تنخواہ اتنی نہیں ہوتی ہے کہ وہ واشنگٹن میں کسی کانفرنس میں جاسکے۔ صرف ہوائی جہاز کا کرایہ ہی میری چھ ماہ کی تنخواہ کے برابر تھا۔ پھر کانفرنس میں شمولیت کی فیس، واشنگٹن میں رہنے کا خرچہ اور اگر پاکستان سے باہر نکلنا ہو تو کچھ نہ کچھ خریداری بھی کرنی ہی پڑتی ہے۔ ادھر یہ حال کہ یونی ورسٹی کا پروفیسر دال روٹی کھا کر عزت سے گزارہ ہی کرلے تو کافی ہے۔ ہمارے جیسے ملکوں میں تاریخ کی کیا اہمیت ہے، اگر تاریخ کی اہمیت ہوتی تو ہمارا یہ حشر ہی کیوں ہوتا۔

تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا تھا ہم لوگوں نے، جبھی تو ملک ٹوٹ گیا تھا، جبھی تو شہر بہ ظاہر بڑھ رہے ہیں مگر اندر سے ختم ہو رہے ہیں جیسے دیمک چاٹ جاتی ہے لکڑی کو۔ اس خطۂ زمین کی تاریخ بھی عجیب تھی حکمرانوں کی تاریخ الگ تھی اور جنتا کی تاریخ الگ تھی۔ عوام موہنجوداڑو سے پہلے بھی غلام تھے اور موہنجوداڑو کے بعد بھی غلام ہیں اور حکمران طبقہ ہر دور میں حکمران ہی رہا تھا۔

پراچہ اور میں ایک ہی اسکول میں پڑھے تھے۔ کراچی کی پی آئی بی کالونی میں پل کر بڑے ہوئے تھے، مجھے کیمسٹری اور بیالوجی سے اُلجھن ہوتی تھی اور اسے پورس کے ہاتھی اور اشوک کے چکر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ میڈیکل کالج میں داخل ہوگیا اور واشنگٹن میں آنکھوں کا ایک بڑا ڈاکٹر بن گیا تھا۔ میں نے تاریخ میں ایم اے کیا تھا، پھر صرف قسمت کا ہی چکر تھا کہ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ سے مجھے جرمنی کا اسکالرشپ مل گیا اور میں نے یورپ کی تاریخ پر جرمنی میں پی ایچ ڈی کرڈالی۔ وہ پانچ سال میری زندگی کے خوب صورت سال تھے۔ پورا یورپ، انگلینڈ، آئرلینڈ دیکھ لیا تھا۔ میں کمیونسٹ ممالک بھی جا کر دیکھ کر آیا تھا۔ پانچ سال تک پڑھا، ملک گھومے، بچت کچھ نہیں کرسکا پاکستان واپس آیا تو ایک چھوٹا سا مکان جو والد صاحب سے ورثے میں ملا تھا

میرا کل اثاثہ تھا اور وہ بھی ایسا تھا کہ اس میں کچھ مرمت، کچھ تبدیلیاں کرا کر رہ سکوں۔ پراچہ نے ہی مجھے اس میٹنگ کے لیے بلا لیا تھا۔ میرا ٹکٹ بھی خریدا، کانفرنس کی فیس بھی دی اور کانفرنس کے بعد ایک ہفتے کی چھٹی کر کے امریکا گھمانے کا پروگرام بھی بنایا تھا... ہماری بچپن کی دوستی میں اس کی مصروفیت کوئی خاص برا اثر نہیں ڈال سکی تھی۔

پروگرام یہی تھا کہ میں ڈیلس ایئرپورٹ سے پراچہ کے آفس پہنچ جاؤں گا پھر وہاں سے کچھ دیر کے بعد پراچہ کے گھر چلیں گے پھر باتیں ہوں گی اور مزید پروگرام بنے گا۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ ایئرپورٹ پر واشنگٹن فلائر کی ٹیکسی مل جائے گی۔ وہ خود نہیں آ سکتا تھا کیوں کہ اسے ایک آپریشن کرنا تھا۔

ڈرائیور کے الحمدللہ سے میں یہی سمجھا تھا کہ یہ کوئی امریکن مسلمان ہے۔ آج کل امریکا میں ہر سال ہزاروں لوگ مسلمان، بدھسٹ، ہری راما ہری کرشنا اور چین کے مختلف مذہب اپنا رہے تھے۔ جن سماجوں میں دولت کی فراوانی ہوتی ہے اور سننے کی برداشت ہوتی ہے، وہاں کے لوگ اپنے مذہب، اپنے اعتماد، اپنے یقین سے اُکتا جاتے ہیں اور ایک اقلیت مذہب تک بدل دیتی ہے یا لامذہب ہوجاتی ہے۔ امریکا، یورپ، جاپان میں یہی ہو رہا تھا۔ سائنسی ترقی اور مادّی آسائشوں نے روحانی خلا پیدا کر دیا تھا جس کے لیے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا تھا کہ کیا وہ امریکن ہے؟

اس نے جواب دیا تھا نہیں امریکن نہیں افغانی ہوں۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ واشنگٹن میں افغانی ڈرائیور سے ملاقات ہوجائے گی۔ افغانستان تو ہمارا پڑوسی ملک تھا اور میں ایک دفعہ شاہ ظاہر شاہ کے زمانے میں افغانستان جا بھی چکا تھا اور اب جو کچھ وہاں ہوچکا تھا اور جو کچھ ہو رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ تباہی کے وہ بادل پاکستان بھی آئیں گے۔ ابھی بادلوں کی کمی ہے۔ وہ جمع ہو رہے ہیں آہستہ آہستہ گھنگھور گھٹا بن کر چھا جائیں گے اور جب چھٹیں گے تو بہت کچھ لٹ چکا ہوگا۔

میں نے پوچھا، ''کب آئے آپ افغانستان سے؟'' ''میں پاکستان سے آیا ہوں اور کابل، قندھار خوب گھوم چکا ہوں۔ جب اچھے حالات تھے وہاں کے۔'' میں نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے بات بڑھائی تھی۔

''میں قندھار کا رہنے والا ہوں۔ آپ پاکستان میں کہاں سے آئے ہیں؟ میں کراچی کے منو ہوٹل میں رہ چکا ہوں۔ آپ جانتے ہو منو ہوٹل۔'' اس نے سوال کیا تھا، ''مکی مسجد کے پاس ہے۔'' اس نے خود ہی جواب بھی دے دیا تھا۔

''میں کراچی کا ہی ہوں مگر اب منو ہوٹل ہسپتال بن گیا ہے۔ کراچی میں ہوٹل، سینما، پارک، سب ختم ہوتے جا رہے ہیں اور اب صرف پاگل خانے، ہسپتال اور گندی گندی عمارتیں بن رہی ہیں۔'' میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ساتھ ہی پوچھ لیا کہ آپ منوہوٹل میں کیا کر رہے تھے؟

''امریکا آنے سے پہلے بہت جگہ جانا پڑگیا، کراچی بھی ایک ایسی ہی جگہ ہے۔ ہم افغانیوں کی ایسی ہی کہانی ہے۔ اب کوئی وطن نہیں ہے ہمارا، نہ کوئی زمین ہے۔ ساری دنیا میں جس طرح سے ہم لوگ ذلیل و خوار ہو رہے ہیں ایسے تو کوئی بھی نہیں ہوا ہوگا۔ ہماری خواتین ہوٹلوں میں کام کر رہی ہیں ہماری قوم بین الاقوامی سطح پر مفلوک الحال ہو کر رہ گئی ہے۔ اچھوت جنھیں کوئی چھو بھی نہیں سکتا ہے جن سے لوگ نفرت کرتے ہیں جو خود اپنا وقار اپنی نظروں میں کھو چکے ہیں۔ لمبی کہانی ہے چھوڑیں۔ اس نے جواب دیا تھا۔

''کہانیوں سے تو مجھے بڑی دلچسپی ہے۔ ''نہیں مجھے بتائیں کیا ہوا تھا۔'' میں نے بڑی دلچسپی سے کہا۔ ''مجھے ابھی تک قندھار یاد ہے۔ میں وہاں رمضان کے زمانے میں گیا تھا اور توپ خانہ بازار کے پاس ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور مجھے یاد ہے رمضان کا زمانہ تھا، سارا شہر رات بھر جاگتا تھا۔ تراویح کے بعد ہوٹلوں میں موسیقی چلتی رہتی تھی اور فنجانوں میں لوگ چائے پیتے رہتے تھے۔ اب تو مجھے یاد نہیں ہے۔ گانے والوں کا نام مگر کچھ نام ابھی تک یاد ہیں۔ احمد ظاہر، احمد ولی، رحیم بخش اور استاد قاسم۔ ارے ہاں میں نے وہاں کے منزل باغ سینما میں دلیپ کمار کی فلم ''داستان'' بھی دیکھی تھی۔ وہی میری زندگی کی پہلی ہندوستانی فلم تھی۔''

وہ لمبی سیاہ شاہراہ پر دُور نظر جمائے ٹیکسی چلا رہا تھا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں کے کونے نم ہوگئے ہیں اور آنسوؤں کے دو قطرے ٹپک کر گالوں پر پھیل رہے ہیں۔ میں نے شاید اس کو دُکھی کر دیا تھا۔ اس نے ٹشو پیپر نکال کر آنسو پونچھے تھے اور

بڑی گلوگیر آواز میں بولا تھا، ''سب ختم ہوگیا۔ اب توپ خانہ بازار اور باغ پل پر زندگی مر چکی ہے۔ منڈی بازار میں سناٹا ہے اور منزل باغ کا سینما ختم کر کے وہاں مسجد بنا دی گئی ہے۔ سب ختم ہوگیا افغانستان میں۔ میں تو ہوں ہی قندھار شہر کا اور آپ نے جو یہ سارے نام لیے تو جیسے میرے سینے پر گولی ماری ہے۔ وہ ساری چیزیں میرے سامنے آگئی ہیں اور دل رونے لگا ہے۔'' اس نے بڑی سادگی سے کہا۔ بڑی عجیب کہانی ہے میری۔ میں کابل یونی ورسٹی میں فزکس پڑھاتا تھا۔ اور اب واشنگٹن کی سڑکوں پر ٹیکسی چلاتا ہوں۔ کابل یونی ورسٹی کے پروفیسر کپڑوں اور قالینوں کا بازار لگاتے ہیں، اسکول استاد برگر بیچتے ہیں اور ہوٹلوں میں ویٹر بن گئے ہیں۔ فوج کے کرنل اور جنرل اور ایئر کموڈور دنیا کے شہروں شہروں میں مسافر بن کر وظیفوں پر زندہ ہیں۔''

ہماری بچیاں جو وہاں پر اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں یہاں بڑے بڑے اسٹوروں میں سیلز گرل بن گئی ہیں۔ یہ ہو رہا ہے افغانستان کے ساتھ۔ دنیا کے ہر ملک میں افغانی موجود ہیں۔ وہ ہر کام کرتے ہیں، جھاڑو لگانے سے لے کر عزت بیچنے تک۔ پیٹ سب کچھ کراتا ہے۔ میرے جیسے نہ جانے کتنے لوگ کہاں کہاں پر کس کس طرح کیا کیا کر رہے ہیں نہ آپ کو اندازہ ہے اور نہ ہی ان لوگوں کو اندازہ ہے جو ان سب چیزوں کے ذمہ دار ہیں۔ اور افغانستان میں جو ہو رہا ہے اس کی تو مثال ہی شاید کہیں بھی نہیں ملے گی۔''

''آپ کیسے نکلے تھے؟'' میں نے انھیں بیچ میں روک کر پوچھا تھا۔

''یہ سب کچھ یکایک ہی ہوگیا تھا۔ روسیوں کے جانے کے بعد ہم نے سوچا تھا کہ اب کچھ امن و امان ہوجائے گا۔ اب دوبارہ زندگی سانس لے گی، اب دوبارہ سڑکوں پر رونقیں بحال ہوں گی، دوبارہ اسکول، کالج، یونی ورسٹی میں تعلیم کا دور دورہ ہوگا، دوبارہ لوگ غریب ہوں گے مگر ذہن و دل کے امیر ہوں گے مگر یہ کچھ نہیں ہوا۔ ایک تیسری جنگ، ایک اور بڑی جنگ میں تبدیل ہوگئی تھی اور ایسی صورت حال ہوگئی کہ ہر پڑھے لکھے ہنرمند قابل آدمی کو افغانستان چھوڑنا پڑ گیا تھا۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح سے بھاگ کر کابل سے نکلا تھا۔ کسانوں کی طرح کے کپڑے پہن کر اپنی بیوی کے ساتھ۔ رات کے اندھیرے میں کھیتوں، وادیوں کو پھلانگتے ہوئے، ندی نالوں کو

پھلانگتے ہوئے کھاڑیوں سے اور مجاہدین سے بچتے ہوئے قندھار سے ہوکر چمن اور پھر کوئٹہ پہنچ گیا تھا۔ کس کس طرح سے میں نے اپنی بیوی کی حفاظت کی ہے اس کا سوچ کر بھی خوف آتا ہے۔ میرے کتنے ہی ساتھی کابل یونی ورسٹی کے گولیوں کا نشانہ بن گئے ان کی بیویاں طوائف ہوگئیں، ان کے بچے بھکاری بن کر رہ گئے ہیں۔ قندھار جانا ضروری تھا۔ کچھ سونا تھا۔ ماں باپ کے زیورات تھے جن کا لے جانا ضروری تھا۔ کیوں کہ بغیر پیسے کے ہم لوگ کہیں بھی نہیں جا سکتے تھے۔''

وہ ذرا دیر کے لیے رکا، ''ساری باتیں تو بتانا مشکل ہے۔ مہینے گزر جائیں گے کہانیاں ختم نہیں ہوں گی۔ صرف واشنگٹن میں ہی تیس ہزار افغانی ہیں اور تیس ہزار کہانیاں ہیں۔ پھر آپ کی بتائی ہوئی جگہ بھی آجائے گی۔ مگر میں آپ کو بتاتا ہوں۔ آج بہت دنوں کے بعد آپ نے مجھے رلا دیا ہے۔ میں پٹھان آدمی ہوں اور پٹھان مرد روتے نہیں ہیں۔ مگر آج ہم افغانیوں کے پاس آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' اس نے رُک رُک کر کہا۔

''کوئٹہ میں ہی ایک ایجنٹ عبدالولی سے ملاقات ہوئی اور اس نے کراچی میں ایک ٹریول ایجنٹ سے رابطہ کرایا تھا۔ اور ہم لوگ ٹرین سے کراچی آئے اور منو ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ سونے کے زیورات بیچ کر جو بھی ہمارے پاس تھا اور دوسرے رشتے داروں سے ادھار لے کر دو دولاکھ میں طے ہوا اور ہم لوگوں کو سوئڈش پاسپورٹ مل گیا تھا اور ساتھ میں ٹکٹ بھی۔ وہ پاسپورٹ جعلی تھے، ان پر ویزا بھی جعلی تھا۔ ہم لوگ کراچی سے نکلے، ترکی پہنچے، ترکی سے اٹلی اور اٹلی سے سیدھا نیویارک۔ نیویارک ایئرپورٹ پر ہی ہم نے امریکن پولیس کو بتا دیا تھا کہ ہم لوگ سوئڈن کے نہیں ہیں بلکہ جعلی ویزے پر سوئڈش بن کر آئے ہیں۔ ہم لوگ افغانی ہیں اور سیاسی پناہ چاہتے ہیں۔ چھ گھنٹے کے انٹرویو کے بعد ہمیں رہنے کی اجازت ملی تھی۔ ایجنٹ نے ہی نیویارک کے ایک یہودی وکیل کا پتا بتایا تھا جس کو ہم نے ایئرپورٹ سے ہی فون کر دیا تھا۔ اس کے لوگ پہنچ گئے تھے۔ وکیل کو دینے کے لیے کچھ پیسے نہیں تھے ہمارے پاس مگر نیویارک کا نظام بہت اچھا ہے اور یہودی وکیل اپنے کام میں پکے ہیں۔ انھوں نے ہم سے صرف یہ کہا تھا کہ ہم لوگوں کو بعد میں قسطوں میں پانچ ہزار ڈالر دینے ہوں گے جب نوکری

کی اجازت ملے گی اور ایک معاہدہ بھی دستخط کرایا تھا اس نے۔

چھ گھنٹے کے بعد امریکن حکومت کے خرچے پر ہی ایک سیاسی پناہ گزینوں کی پناہ گاہ میں ہم لوگوں کو رکھ لیا گیا تھا اور اس یہودی وکیل نے تین ہفتے میں ہی ورک پرمٹ کا انتظام کرا دیا تھا۔ اب ہم لوگ امریکی حکومت کے مہمان تھے، کام کر سکتے تھے، بینک سے ادھار لے سکتے تھے، ہم سب کو سوشل سیکیورٹی کا نمبر مل گیا تھا۔ اب تو سات سال ہوگئے ہیں اور گرین کارڈ بھی بن گیا ہے اور تھوڑے دنوں میں امریکن پاسپورٹ بھی مل جائے گا۔ ووٹ بھی دے سکیں گے ہم لوگ۔ ہزاروں سال میں جو حق افغانستان میں نہیں ملا تھا وہ یہاں چند سالوں میں مل گیا ہے۔'' یہ کہہ کر انھوں نے لمبی سانس لی اور گاڑی میں لگے ہوئے فون پر کسی کو فون کرکے پراچہ کے آفس جانے کا راستہ سمجھا تھا پھر فون رکھ کر کہا، ''اب ہم لوگ سب امریکن ہیں، بچے امریکن اسکولوں میں جاتے ہیں، میری بیوی نے ایم اے کیا تھا اور کابل کے دفتر خارجہ میں کام کرتی تھی، اب وہ کے مارٹ میں کام کرتی ہے اور میں فزکس پڑھاتا تھا، واشنگٹن کی سڑکوں پر ٹیکسی چلاتا ہوں۔ اگر آپ کو فرصت ہو اور آپ کو افغانوں کو دیکھنا ہو تو اتوار کو مجھے ملیں میں آپ کو یونی ورسٹی کے پروفیسر دکھاؤں گا جو پارکنگ لاٹ میں گاڑیوں کو پارک کراتے ہیں، وہ جج دکھاؤں گا جو ہوٹلوں کے دروازوں پر کھڑے ہیں، وہ افغانی عورتیں دکھاؤں گا جو ریسٹورنٹ میں ٹیبل صاف کرتی ہیں۔ اس ملک میں ڈالر کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے ڈالر چاہیے اور ڈالر درختوں پر نہیں اُگتے ہیں۔ اب زیادہ دُور نہیں ہیں ہم لوگ۔'' اس نے گاڑی ہائی وے سے چھوٹی سڑک پر گھماتے ہوئے کہا۔

میں بھی باتوں باتوں میں تقریباً کھو گیا تھا ایک طرف سنتا جا رہا تھا دوسری جانب ذہن نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں سوچ رہا تھا، طرح طرح کے خیالات ذہن کو جھٹکے دے رہے تھے۔ میں جو تاریخ کا پروفیسر تھا، تہذیبوں کے زوال وعروج پر کانفرنس میں شمولیت کے لیے واشنگٹن آیا تھا، میرے ملک کے برابر میں ایک اپنی تہذیب مٹی میں مل رہی تھی جس کے سپوتوں نے ہندوستان سے ترکی تک ہزاروں سال حکومت کی تھی، جن کی زبان میں چاشنی تھی، جن کے گیتوں میں بلا کا درد تھا، جن کے شاہوں کے

دربار میں علم و فضل کی رسائی تھی، جن لوگوں پر دنیا کی کوئی اور قوم حاکم نہیں ہو سکی تھی۔ وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے ہیں۔ زمین پر پڑے ہوئے ایک پتھر کی طرح جس کی کوئی سمت نہیں ہوتی جو لوگوں کی ٹھوکروں کی مرضی سے اپنے راستے کا تعین کرتا ہے۔ مجھے ایک شدید دھچکا سا لگا۔ میرے ذہن میں سوال آیا تھا اور میں پوچھ بیٹھا تھا کہ اگر افغانستان کے حالات صحیح ہوجائیں تو تم واپس جاؤ گے؟

اس نے کہا، ''ضرور جاؤں گا، فوراً جاؤں گا۔ یہ میرا ملک نہیں ہے، یہ میرا کلچر نہیں ہے، یہ زمین میری نہیں ہے، یہاں میری ماں کی قبر نہیں ہے، میرے دادا کا مکان یہاں نہیں ہے، میں کیا، میرے خیال میں ساٹھ ستر فیصد سے زیادہ افغانی فوراً واپس چلے جائیں گے۔ اگر ہمارا پرانا کابل ہمیں مل جائے۔'' اس کی آواز پھر بھرا گئی۔ ''مگر حالات اب کبھی بھی صحیح نہیں ہوں گے۔ افغانستان کی موت ہوگئی ہے وہاں سولہ سترہ سال کے بچے قاضی بن گئے ہیں، وہاں ایک شہادت پر ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے وہاں سرعام لوگوں کو درختوں سے لٹکا کر پھانسی دی جاتی ہے وہاں عورتوں کو گھر میں غلام بنا دیا جاتا ہے۔ وہاں اب ایک ایسی حکومت ہے جو مٹی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے بتوں سے خوف زدہ ہے جو پہاڑوں میں کاٹے گئے ہزاروں سالوں سے ایستادہ گوتم بدھا کے غیر مسلح مجسمے سے جنگ کر رہی ہے جو بھوک کے عفریت سے خوف زدہ ہے، جو غربت کے عذاب سے جنگ نہیں کرتی، جو ناانصافی کے چنگل سے نہیں نکلنا چاہتی، جو صدیوں کی جہالت کو مستقل کرنا چاہتی ہے، جو دنیا بھر کے خلاف ہے مگر دُنیا بھر سے بھیک لینے پر کسی قسم کا اعتراض نہیں رکھتی ہے۔ وہاں اب ایسی حکومت ہے جو افغانستان کو اس قبائلی دور میں واپس لے گئی ہے جہاں پیغمبروں کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اب پیغمبر نہیں آئیں گے اور افغانستان تباہ ہوتا چلا جائے گا۔ آپ اخبار تو پڑھتے ہوں گے، کبھی بی بی سی بھی سنتے ہوں گے۔ ریڈیو ایران کی آواز بھی آتی ہوگی، وائس آف امریکا کی آواز بھی آتی ہوگی، یہ سب کیا کہہ رہے ہیں؟ اب وہاں کیا ہو رہا ہے؟ آپ تو پاکستانی ہیں ناں، آپ کو تو پتا ہونا چاہیے کہ آپ کی فوج نے آپ کے ملک کے ان حکمرانوں نے جو جنگ روسیوں سے شروع کی تھی، وہ کہاں ختم ہوئی ہے؟ اب وہاں پاکستان کے تربیت یافتہ اُن طالبان کی حکومت ہے جن کا ذہن لوگوں کے ہاتھ کاٹ سکتا

ہے، درختوں پر پھانسی لگا سکتا ہے۔ اسکولوں، یونی ورسٹیوں کو بند کر سکتا ہے۔ عجائب خانوں کو مسمار کر سکتا ہے۔ وہ ہم افغانیوں کو مستقبل نہیں دے سکتا ہے، ایک ایسا مستقبل جس پر ہم فخر سے اپنے سر بلند کر سکیں۔''

تھوڑی دیر وہ بھی خاموش رہا تھا اور میں نے بھی کچھ نہیں کہا، مگر پھر پوچھا کہ آخر کیسے ہوگیا یہ سب کچھ؟ اس کے جواب نے مجھے دوبارہ چونکا دیا تھا۔ ''یہ بھی ایک لمبی کہانی ہے۔ میں نے ساری زندگی فزکس پڑھائی ہے۔ توانائی کے اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ کائنات کی ابتدا اور کائنات کی انتہا کے معموں پر غور کرتا رہا ہوں۔ اب بھی جب ان سڑکوں پر ٹیکسی چلا رہا ہوتا ہوں تو کابل کی کوئی صبح، کوئی شام، کوئی تھکی ہوئی دوپہر یاد آجاتی ہے جب کابل یونی ورسٹی میں کوئی لڑکا یا لڑکی مجھ سے پوچھتے تھے کہ آئن اسٹائن کے انرجی کے قوانین کے مطابق کیا انرجی کے لیے سورس کا ہونا ضروری ہے؟ کوئی مجھ سے پوچھتا تھا کیا زمینی کشش کی طرح دوسرے سیارے کشش رکھتے ہیں؟ کیا انسان کبھی چاند سے بھی اوپر جا کر دوسری دنیاؤں میں پہنچ سکے گا؟ کیا کبھی بلیک ہول کی اصلیت کا پتا چل سکے گا؟ کابل کی وہ یونی ورسٹی ویانا کی یونی ورسٹی یا آکسفورڈ یونی ورسٹی یا ہارورڈ کی طرح سے مالامال یونی ورسٹی نہیں تھی۔ مگر احساس امن تھا وہاں پر تعلیم کی کشش تھی، وہاں زندہ رہنے اور زندہ رہنے دینے کی روایات تھی۔ وہاں پر اب جہالت کا ایک بہت بڑا بلیک ہول بن کر رہ گیا ہے۔ جہل کی ہر چیز کھنچ کھنچ کر چل رہی ہے اور کوئی نہیں ہے ذمہ دار اس کا۔ ہم افغانی، صرف افغانی ہی ذمہ دار ہیں اس کے۔ لمبی سیاہ سڑک لگتا تھا کہ کبھی ختم نہیں ہوگی اور اس کی نظریں روڈ پر جمی ہوئی تھیں اور لگتا تھا کہ ذہن کہیں دُور بہت دُور گھوم رہا تھا میں نے کن انکھیوں سے دیکھا، اس کے آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ بے وطن بے زمین آدمی کے آنسو ایسے ہی ہوتے ہوں گے، ایسا ہی کرب ہوتا ہوگا دلوں میں جس کو اگر چھیڑ دیا جائے تو چھلک جاتا ہے اس طرح سے۔ مجھے دل ہی دل میں افسوس سا ہونے لگا تھا۔

یہ روسیوں کا کام ہے اور نہ امریکیوں کا، یہ تو ہمارا ہی کیا دھرا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر بولا۔ ''اس کا ذمہ دار نہ پاکستان ہے اور نہ ہی ایران، یہ افغان قوم ہی ذمہ دار ہے اس کی۔ دنیا میں ایسی بہت کم قومیں ہوں گی جنھوں نے آپس میں ایک

دوسرے کا اتنا خون بہایا ہوگا، پانی کی طرح۔ امیروں نے بھی، غریبوں نے بھی، پڑھے لکھے لوگوں نے بھی، جاہلوں نے بھی، کمیونسٹ اور دھریوں نے بھی، مذہبی ملاؤں اور طالبان نے بھی۔ داؤد کوئی بڑا انقلابی نہیں تھا۔ ظاہر شاہ کا رشتہ دار تھا۔ ناظم حکمت سے لے کر ببرک کارمل تک اور حفیظ امین سے لے کر ترہ کئی تک اور اب طالبان سے لے کر شاہ مسعود تک یہ سارے کے سارے افغانی ہیں مگر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے۔ کوئی امریکا کی جنگ لڑ رہا ہے، کوئی ایران کے لیے لگا ہوا ہے اور کوئی پاکستان کی حکومت کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ افغانیوں کی جنگ، میری جنگ، میری بیوی کی جنگ، میرے بچوں کی جنگ لڑنے والا کوئی نہیں ہے۔ اور جس قوم کے لوگ اپنی ہی قوم کے خلاف غیروں کی جنگ لڑتے ہیں انھیں تباہی اور بربادی کے سوا کیا مل سکتا ہے؟ میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا، خون کا سمندر اس کے چہرے پر موجیں مار رہا تھا۔

''ہم سب بے غیرت ہیں۔'' اس نے بڑے غصے سے کہا۔ پھر میری منزل آگئی۔ پراچہ کے کلینک کے سامنے گاڑی رک گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ابھی تک سرخی نمایاں تھی اس کے اندر کا درد ابھی تک اس کے چہرے پر عیاں تھا۔ ٹیکسی دیکھ کر اندر سے پراچہ کی سیکریٹری باہر آگئی۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے ٹیکسی کا کرایہ دے دیا۔

پانچ دن کی کانفرنس بہت اچھی تھی، ساری دنیا سے تاریخ داں آئے ہوئے تھے۔ لاطینی امریکا کے، مایا تہذیب سے لے کر اہرام مصر کی کہانی دھرائی گئی تھی اجنتا کے غاروں سے آسٹریلیا کے ابروجنیز کا ذکر کیا گیا تھا۔ یمن کی عمارتوں سے لے کر موہنجوداڑو کی تعمیرات کے معجزوں پر غور کیا گیا تھا۔ ہلاکو خان سے سکندراعظم تک کیا ہوا تھا، ہٹلر سے ویت نام تک ایک ہی کہانی تھی، قومیں، نسلیں، ذاتیں، ثقافتیں، تمدن، زبان، تہذیب، مذہب، اعتقاد، ایمان، یقین سب اسی وقت تباہ ہوئے جب انسانوں نے آپس میں جھگڑا شروع کیا، اپنے اندر سے فساد کا آغاز کیا۔ ہر آغاز کا نام نیا، پر انجام مختلف نہیں تھا۔ قتل و غارت گری، عورتوں کی پامالی، بچوں کی رسوائی، بوڑھوں کی کس مپرسی اور جوانوں کے خون کا نذرانہ... تاریخ تو بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کرتی

ہے مگر نہ جانے کیوں انسان سمجھتا نہیں ہے۔ وائٹ ہاؤس سے وائٹ ہال تک، کریملن سے تن من اسکوائر تک، اسلام آباد سے دلّی تک، تل ابیب سے بیروت تک اور نکاراگوا سے پیرس تک۔ ساری کانفرنس کے دوران میں سنتا رہا، سمجھتا رہا اور سوچتا رہا تھا۔

کانفرنس کے اختتام پر مجھے کابل یونی ورسٹی کا وہ پروفیسر بہت یاد آیا جو واشنگٹن میں ٹیکسی چلاتا ہے۔ اس کا تو نام بھی نہیں پوچھا تھا میں نے۔ مگر نام میں کیا رکھا ہے۔ ہزاروں لاکھوں افغان مہاجروں کے کوئی نام تھوڑی ہیں، سب مہاجر ہیں اور سب اس ٹیکسی ڈرائیور کی طرح بے سکون، بے اطمینان، بے منزل، بے مکان۔

میں نے پراچہ سے پوچھا تھا کہ واشنگٹن کی سڑکوں، محلوں، بازاروں اور مضافاتی علاقوں کا نقشہ سمجھنے میں کتنے دن لگیں گے؟ کیا وہ مجھے اُدھار پر ہی صحیح ایک ٹیکسی دلا دے گا؟ جب پڑوس کا طوفان ہمارے پاس بھی پہنچے گا، سرحد کے اس طرف پشاور سے کراچی تک، جب کراچی یونی ورسٹی میں بھی مٹی اُڑے گی، جب کراچی بھی کابل کی طرح، جب لاہور ہرات کی طرح، جب کوئٹہ قندھار کی طرح ڈھول ڈھول ہوکر بکھرنا شروع ہوگا، جب نیویارک کا وہ یہودی وکیل مجھے بھی سیاسی پناہ دلا کر امریکا میں کام کرنے کا ورک پرمٹ دلا دے گا تو میں اس فزکس کے پروفیسر کی طرح واشنگٹن کے سڑکوں پر اپنی قوم کی بے غیرتی کی کہانی سناؤں گا کیوں کہ تاریخ پڑھنے کا وقت ختم ہوچکا ہوگا۔

پراچہ ہنس پڑا۔ بڑے زور سے، بڑی بے یقینی کے ساتھ۔ وہ ڈاکٹر تھا آنکھوں کی بیماریوں کا ماہر، آنکھوں کے اندر جو ایک عدسہ ہوتا ہے اس کے آپریشن میں یکتا۔ اسے میری طرح سے کیمسٹری بیالوجی سے نفرت نہیں رہی تھی، اسے سکندرِاعظم اور راجا پورس کی جنگ سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے تاریخ نہیں پڑھی تھی۔

اس لیے وہ ہنس رہا تھا اور میری آنکھوں میں ڈھول اُڑ رہی تھی، لٹے ہوئے قریوں کی ڈھول...

□

معمار

بس سے اتر کر تقریباً دو میل پیدل چلنا پڑا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی پگڈنڈی، پتھروں اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر سے ہوتے ہوئے ٹیلوں اور خود رو جھاڑیوں سے گزر کر یکایک وہ گاؤں سامنے آ گیا تھا اور گاؤں کی پتلی پتلی گلیوں سے گزرتے ہوئے، گندی نالیوں کو پھلانگتے ہوئے، چھوٹے جوہڑوں سے بچتے ہوئے اور چند ٹوٹے پھوٹے مکانوں اور جھگیوں سے گزر کر تقریباً گاؤں کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر ایک اونچی سی چٹان کے اوپر ایک چھوٹی سی مسجد کے باہر وہ بیٹھا ہوا تھا۔ ایک بڑے سے پتھر کے اوپر اس کی دو بیساکھیاں ساتھ ہی زمین پر رکھی ہوئی تھیں اور اس کے دونوں کٹے ہوئے پیر شلوار کے اندر تھے۔ اس نے اوپر سے ہی مجھے دیکھا تھا اور بے ساختہ کھڑا ہونے کی کوشش کی تھی اور لڑکھڑا کر گر پڑا تھا۔ اس کے پیر کٹ گئے تھے جن پر نہ کھڑے ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھوں کی مجبوری اس کے ماتھے کی پیشانی اور گھبراہٹ نے جیسے اسے توڑ سا دیا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر اس کے پاس پہنچ گیا اور اسے گلے سے لگایا۔ اس نے میرے ماتھے کو چوما اور میں اس کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

رحمان جب کراچی میں تھا تو شروع شروع میں، میں نے اسے بالکل ہی پسند نہیں کیا۔ میری اس کی پہلی ملاقات صبح پونے آٹھ بجے ہوئی تھی۔ وہ میرا آفس میں پہلا دن تھا۔ میرا آفس آواری ٹاور کی بلڈنگوں میں تھا۔ میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں

کام کرتا تھا۔ آواری ٹاور اور میٹروپول کے آس پاس گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ مشکل ہی سے ملتی تھی اس لیے صبح سویرے آ کر ہم سب لوگ اپنی گاڑیاں کھڑی کر دیتے تھے اور صبح سویرے ہی کام کا آغاز بھی ہوجاتا تھا۔ اس روز میں نے گاڑی کھڑی ہی کی تھی کہ وہ آ گیا تھا۔ کالے رنگ کے ملیشیا کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی اس نے۔ نہ وہ کالا تھا نہ گورا۔ بال کٹے ہوئے تھے اور بکھری ہوئی داڑھی نے تقریباً پورے چہرے کو چھپایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں کچھ تھا، کھوئی کھوئی ہوئی آنکھیں، کچھ بے قرار سی آنکھیں، سوئی سوئی سی مگر ہراساں آنکھیں، میں انھیں کوئی مفہوم نہیں دے سکا تھا۔

اس نے پوچھا تھا، گاڑی صاف کرانی ہے اور مجھ پر اور میری گاڑی پر بھرپور نظر ڈالی تھی۔

''سن بھائی، یہاں پر کھڑی کی ہے۔ ابھی تو صاف کرکے آیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا تھا۔

''اچھا بھائی، کوئی بات نہیں ہے۔ میں خیال رکھے گا،'' اس نے جواب میں کہا تھا۔

''خیال رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ کون سا اس میں ہیرے چاندی رکھے ہوئے ہیں؟'' میں نے جواب دیا اور سوچا تھا کہ واپسی پر خیال کرنے کے پیسے چارج کرلے گا۔

''خیال کرنے کے پیسے نہیں لگتے ہیں۔'' اس نے شاید میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔ ''آپ نئے آئے ہو ادھر اس لیے آپ کو پتا نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا تھا۔

وہ صحیح کہہ رہا تھا خیال کرنے کے پیسے نہیں لگتے تھے اور میں آیا بھی نیا تھا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ ان سڑکوں پر کھڑی ہونے والی گاڑیوں کا کارپوریٹ کلچر کیا تھا۔

مجھے بعد میں آفس کے ساتھیوں سے پتا لگا تھا کہ وہ صبح سے شام تک گاڑیوں کی صفائی، دُھلائی کا کام کرتا تھا۔ ہمارے آفس اور آس پاس کے دفتروں میں جتنے بھی لوگ کام کرتے تھے ان کی گاڑیوں کی صفائی کی ذمہ داری اسی کی تھی۔ صبح سویرے سے اس کے کام کا آغاز ہوجاتا تھا اور شام گئے تک وہ کام کرتا رہتا تھا۔ آفس کی گاڑیوں کی صفائی، آنے جانے والے لوگوں کی گاڑیوں کی صفائی کے لیے اس

نے اپنا خود ہی تقرر کر لیا تھا۔

کراچی کی سڑکوں کا اپنا ایک الگ انتظام ہے۔ شہر کے کچھ علاقے میونسپلٹی کی ذمہ داری ہیں اور کچھ علاقوں کا نظام کنٹونمنٹ بورڈ نے سنبھالا ہوا ہے اور کچھ علاقوں کا انتظام کسی کے حوالے نہیں ہے۔ کچھ علاقوں میں مسلسل گٹر بہتے رہتے ہیں اور کچھ علاقوں میں گٹر کے بہنے کی اجازت تک نہیں ہے۔ میں نے گزشتہ کئی سال میں میٹروپول اور گورنر ہاؤس کے آس پاس نہ گٹر بہتا ہوا دیکھا ہے نا کوڑے کے ڈھیر نظر آئے ہیں۔ اگر میونسپلٹی کسی علاقے کو صاف رکھنا چاہتی ہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ اسی طرح سے گندگی کو پھیلانے کا بھی یہی سلسلہ ہے۔

کراچی شہر بھی بانٹا ہوا ہے فقیروں نے۔ یہاں پر ایک طرح کا ٹھیکے داری کا نظام ہے۔ جو ٹھیکے دار جس علاقے میں فقیروں کا انتظام کرتا ہے اسی کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اس علاقے کی پولیس کو بھی کھانا دے اور اپنے فقیروں کے بھی رہنے سہنے کا انتظام کرے۔ ایک علاقے کے فقیر کسی دوسرے علاقے میں بھیک نہیں مانگ سکتے ہیں اور اسی طرح سے ایک علاقے کے پولیس والے دوسرے کے علاقے میں بھتا نہیں لے سکتے ہیں۔

جیب کتروں، اٹھائی گیروں، بھتا لینے والوں اور ڈاکا ڈالنے والوں کے درمیان بھی شہر بٹا ہوا ہے۔ اس معاملے میں وہ سب سے ایمان دار ہیں، ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ بے ایمانی کے اپنے اصول ہوتے ہیں اور بے ایمان اپنے اصولوں میں بڑے ذمہ دار اور بہت ایمان دار ہوتے ہیں۔

اسی طرح سے شہر میں پارک ہونے والی گاڑیاں بھی بٹی ہوئی تھیں، علاقے بٹے ہوئے تھے اور ان کا نظام بھی بٹا ہوا تھا۔

آہستہ آہستہ رحمان نے مجھے کراچی میں اپنی کہانی سنادی، ٹکڑے ٹکڑے کرکے، جو اب تک اس پر بیتی تھی۔

رحمان سوات سے آیا تھا جب وہ کراچی آیا تھا تو صحیح طریقے سے بڑا بھی نہیں کہلا سکتا تھا۔ ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کے باپ نے اسے اس کے چچا کے ساتھ کراچی بھیج دیا تھا۔ اسے بھی بہت شوق تھا کراچی آنے، وہاں کام کا اور کام کرنے کے

بعد پیسے جمع کر کے اپنے گاؤں واپس جانے کا، طرح طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں لے کر، فخر و غرور کے ساتھ۔ پڑھنے اور اسکول جانے کا اسے کبھی بھی شوق نہیں تھا... اس نے اپنے ذہن میں جو کراچی کا نقشہ کھینچا ہوا تھا اصلی کراچی اس نقشے سے مختلف تھا۔ اس نے اپنے گاؤں کی ایک بڑی تصویر بنالی تھی اپنے ذہن میں اپنے اصولوں کے مطابق جو ہزاروں سال پرانے ہیں۔ پتھر کے زمانے کے اصول۔ کراچی اور کراچی کے اصول بدلتے رہتے ہیں، بہت تیزی کے ساتھ۔ کوئی ٹھہراؤ نہیں ہے ان میں۔ ہر روز نیا قانون ہر روز نیا دن۔

کراچی اس کی زندگی کا عجیب و غریب تجربہ تھا۔ اتنی گاڑیاں، اتنی روشنی، اتنی عورتیں سڑکوں پر اس نے پہلی دفعہ دیکھی تھیں۔ شروع شروع میں تو وہ گھنٹوں فارغ وقت میں سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر گاڑیاں گنتا رہتا، اس کی گنتی ختم ہو جاتی تھی گاڑیاں ختم نہیں ہوتی تھیں۔

اس کا چچا ایک آفس میں چوکی دار تھا۔ اسی آفس میں وہ بھی کام کرنے لگا تھا۔ اس کے ذمے آفس کے اوپر کے کام کرنا تھا اور آفس میں کام کرنے والوں کو چائے پلانا تھا۔ شروع میں تو اس کو مشکل ہوئی تھی مگر پھر وہ کام کا عادی ہو گیا تھا۔ یہی اس کی دنیا تھی اور یہی کراچی کا پہلا بسیرا۔

اس کا چچا کینٹ اسٹیشن کے پیچھے ایک کچی آبادی میں رہتا تھا۔ ریلوے کی زمین پر اس کچی آبادی میں ملک کے ہر جگہ کے لوگ رہتے تھے۔ پٹھان، پنجابی، بلوچ، سندھی، سرائیکی، مہاجر، افغان، برمیز، چائینیز اور نہ جانے کس کس جگہوں کے کس کس طرح کے لوگ۔ زمین کم پڑ گئی تھی، آبادی بڑھتی ہی چلی جاتی تھی۔ چھوٹے سے کمرے میں وہ چار آدمی تھے، دو بستروں پر سوتے تھے اور دو بستروں کے نیچے زمین کے اوپر۔ کمرے کے باہر ایک طرف چولہا بنا ہوا تھا اور ساتھ میں غسل خانے کا انتظام تھا۔ ہزاروں لوگ اسی طرح سے رہتے تھے اور وہ بھی ان لوگوں میں آکر رچ بس گیا تھا۔ جیسے یہیں پیدا ہوا ہو۔ کچی آبادیوں میں رہنے کے اصول بہت سادہ ہوتے ہیں۔ حقیقت میں کوئی اصول ہوتے ہی نہیں ہیں۔ گندگی روکنے یا پھیلانے کے خلاف کوئی قانون نہیں ہوتا ہے۔ بجلی کی چوری کا کوئی اصول نہیں ہوتا ہے۔ پانی کا کوئی وقت نہیں

ہوتا ہے۔ ہر گھر ہر جھونپڑی ہوتی ہے۔ گھر گھر نہیں ہوتے ہیں سر چھپانے کی، رات بتانے کی ایک جگہ ہوتی ہے۔ سرکار کا قانون نہیں علاقے کے دادا، چودھری، مکھیا کا قانون چلتا ہے۔ یہ قانون سمجھنا اتنا مشکل نہیں ہوتا۔

تھوڑے دنوں میں ہی دفتر کے کام سے اس کا دل بھر گیا تھا۔ اس کا دل کرتا تھا زیادہ کام کرے اور زیادہ پیسے کمائے۔ اس کے چچا نے کہا تھا جو بھی کام کرنا ہے کرے مگر صرف یہ خیال رکھے کہ کراچی کے کسی ایسے گروہ کے چکر میں نہ پڑ جائے جو برے کام کرتے ہیں۔ برے کام بہت سارے تھے۔

شراب کی تقسیم کا ایک نظام تھا جس میں بہت سے لوگ لگے ہوئے تھے۔ شہر کے کونے کونے میں شراب پہنچانے کے مختلف طریقے تھے اسی طرح سے چرس اور ہیروئن کے اڈے تھے جہاں سے منظم طریقے سے چرس اور ہیروئن شہر بھر میں پہنچائی جاتی تھی۔ اسکولوں، کالجوں، یونی ورسٹیوں اور مزاروں پر پہنچانے کا بہت عمدہ نٹ ورک تھا۔ وقت پر ضرورت مند کو چیز مل جاتی تھی۔ شہر میں خاندانی منصوبہ بندی کی اتنی اچھی پلاننگ نہیں تھی جتنی اچھی ہیروئن کی ڈسٹری بیوشن کا نظام تھا۔ اسلحہ کا کام تو بہت ہی اچھے طریقے سے ہو رہا تھا۔ کیوں کہ اسلحہ ہرا آدمی خریدنا چاہتا تھا اور بعض لوگ تو مستقل خریدار تھے۔ یہ سارے کام بڑے بڑے لوگوں کی مرضی اور ان کی شراکت سے چلتے تھے اور کبھی کبھی چھاپے مارے جاتے تھے تو چھوٹے لوگ گرفتار ہو کر جیلوں میں سڑتے رہتے تھے۔ ان کے دوست رشتہ دار پیسوں کا انتظام کرتے تھے، پھر پولیس اور عدالتوں میں یہ پیسہ چلتا تھا اور انھیں رہائی نصیب ہوتی تھی۔ کراچی کے اس کالے دھندے میں لاکھوں لوگوں کا روزگار تھا۔ ان بے روزگاروں کا بھی جو نوکری کی تلاش میں تھے اور ان کارندوں کا بھی جو کم تنخواہ پر سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں ملازم تھے۔

نہ جانے کیوں پہلے دن سے ہی رحمان نے اس قسم کے کسی کام میں حصہ لینے کی کوشش نہیں کی تھی حالاں کہ اس کے بہت سارے ہم زبان اسی طرح کے کاموں میں لگے ہوئے تھے اور نظروں کے سامنے ہی جو ٹین کے بکس میں سامان لے کر آئے تھے وہ پجارو گاڑیوں میں گھومنے لگے تھے۔ انھیں صرف پیسا کمانا تھا... ہر

قیمت پر اور ہر قسم کا دھندا کر کے۔

اسی طرح سے اس کے چچا نے اسے سمجھایا تھا کہ کراچی کے کچھ علاقوں میں اس کو کبھی بھی نہیں جانا ہے۔ لالو کھیت، اورنگی کے بعض علاقے جیکب لائنز کے علاقے کراچی میں رہنے والے پٹھانوں کے لیے نہیں تھے۔ جب بھی کراچی میں حالات خراب ہوتے تھے تو ان علاقوں میں غارت گری ہوتی تھی۔ بسیں جلتی تھیں، کاریں چھینی جاتی تھیں، گھر لٹتے تھے۔ چھابڑی والے، پان والے، مزدور، دکان دار اپنے کاموں سے محروم ہو کر گھر بیٹھ جاتے تھے اور جانیں تو ایسے جاتی تھیں کہ جن کا کوئی حساب بھی نہیں تھا۔ اب اتنی جانیں جا چکی تھیں کہ ان کا حساب کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ آخر کب تک حساب رکھا جائے؟ حساب کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

کراچی میں بھی عجیب عجیب طرح جھگڑے ہوتے تھے۔ کبھی مہاجروں اور سندھیوں کا جھگڑا تو کبھی مہاجروں اور پٹھانوں کا جھگڑا شروع ہو جاتا تھا پھر کبھی مہاجروں اور پنجابیوں کا جھگڑا ہو جاتا۔ جب مہاجر دوسروں سے لڑ جھگڑ کے تھک جاتے تو پھر آپس میں جھگڑنا شروع کر دیتے تھے اور ان جھگڑوں میں نہ جانے کتنے معصوم لوگ اپنی جانیں کھو دیتے۔ رحمان کی سمجھ میں کبھی بھی نہیں آیا تھا کہ یہ جھگڑے کیوں شروع ہوتے ہیں؟ کون ان کے پیچھے ہوتا ہے؟ اسے تو صرف یہ پتا ہوتا تھا کہ ان جھگڑوں میں دکانیں بند ہو جاتی تھیں، ٹھیلے نہیں لگتے تھے، شام ہوتی ہی نہیں تھی، کام ہوتا ہی نہیں تھا، پیسے ملتے ہی نہیں تھے۔ اندھیرا ہو جاتا تھا۔ اندھیرا اندر سے باہر تک جسم سے روح تک ایک ایسا اندھیرا جس میں سارا شہر ڈولتا رہتا تھا۔ مگر پیٹ روٹی مانگتا تھا بغیر کسی ہڑتال کے اور کمرے کا مالک کرایہ پابندی سے لیتا تھا چاہے شہر سارا ہفتہ بند رہے۔

دفتر کا کام چھوڑنے کے بعد تھوڑے دنوں تک اس نے سبزی منڈی میں وزن اٹھایا، اس کام میں تھوڑے زیادہ پیسے ملتے تھے مگر بہت صبح سویرے اُٹھنا پڑتا تھا اور کام بھی بہت سخت تھا۔ وہ جلد ہی اس کام سے بھی اُکتا گیا تھا۔ مگر سبزی منڈی کا تجربہ بھی خوب تھا۔ صبح سویرے سبزیوں کا آنا، پھر آڑھتیوں کا ان سبزیوں کو بیچنا، ان کی بولی کا طریقہ پھر سارے شہر میں اس کا پہنچنا۔ جب سارا شہر سوتا تھا تو

سبزی منڈی جاگتی تھی۔

سبزی منڈی میں ہی اس نے ایک کوچ اڈے پر کنڈیکٹری کرنی شروع کردی تھی مگر جلد ہی وہ ڈرائیوروں سے پریشان ہوگیا تھا۔ زیادہ تر ڈرائیور بدتمیز تھے نہ صرف گالی گفتار کرتے تھے بلکہ ایسی حرکتیں کرتے رہتے تھے کہ اسے سوچ کر گھن آتی تھی۔ نہ جانے کس طرح اس نے اپنی جان بچائی تھی۔ کراچی ایسا ہوگا نہ اس نے سوچا تھا اور نہ ہی سمجھا تھا۔

اسے اتوار کا وہ دن یاد تھا جس دن شام کو چھٹی کے بعد گل حمید ڈرائیور اسے اپنے اڈے پر لے گیا تھا، وہاں اس نے کھانا کھایا تھا اور جس کے بعد گل حمید نے اس پر دست درازی کی کوشش کی تھی۔ شہر کا یہ رخ اس کے لیے عجیب تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کبھی ایسا ہوگا اس کا اپنا پٹھان بھائی اپنے علاقے کا آدمی اس طرح سے اس کی عزت کے پیچھے پڑ جائے گا، اس سے تو اچھا ہے کہ کسی اور آدمی کی گولی سے اس کی جان چلی جاتی۔ مگر یہ سب کچھ تو بہت عام تھا۔ منی بس کے ڈرائیور، کنڈکٹر، ٹرکوں کے ڈرائیور، کلینر، ان بسوں اور ٹرکوں کے لیے بنے ہوئے اڈوں کے اوپر کام کرنے والے بچوں پر کیا کچھ نہیں کرگزرتے تھے۔ کوئی شنوائی تھی نہ کسی کا پتا تھا۔ ایٹم بم بنانے والے ملک کے حکمرانوں، سیاست دانوں کے پاس ان خرافات کو سمجھنے اور ان بچوں کے لیے کچھ کرنے کا وقت کہاں تھا۔ دوسرے کام ضروری، بہت ضروری تھے۔

وہ چھوٹا تھا مگر کراچی نے آہستہ آہستہ اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ زندگی کے ایسے ایسے رخ دکھائے تھے جو شاید کتابوں میں تو ہوتے ہوں، مگر زندگی میں ان کا ہونا قابل یقین نہیں تھا۔ مگر زندگی کے اپنے داغ تھے کراچی کے اوپر۔

کنڈکٹری چھوڑ کر اسے پیٹرول پمپ پر نوکری مل گئی تھی۔ جو گاڑیاں آتی تھیں ان میں پیٹرول ڈیزل ڈالنا پڑتا تھا مگر ڈیوٹی بڑی لمبی ہوتی تھی۔ صبح چھ بجے سے رات کے بارہ بجے تک پھر دوسرے دن کی چھٹی ہوتی تھی۔ وہ اتنا تھک جاتا تھا کہ رات ایک دو بجے گھر پہنچ کر بستر پر گرتا تھا تو دوسرے دن صبح دس بجے سے پہلے آنکھیں نہیں کھلتی تھیں۔ پیسے اچھے ملتے تھے، کچھ تنخواہ کی صورت میں کچھ بخشش کے نام

پر۔ مگر جلد ہی اس کا دل اس کام سے بھی اچاٹ ہوگیا تھا۔ اسے خود سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کیوں ہے؟ ایک بے چین روح کی طرح ایک جسم سے دوسرے جسم کی طرف جانے کی خواہش لیے ہوئے۔ نئے سے نئے چکر میں پڑنے کو تیار۔ اسے ایک جگہ کام کرنے کی عادت پڑتی ہی نہیں تھی۔

پیٹرول پمپ سے وہ ایک چائے کی دکان پر کام کرنے لگا۔ صدر کے الیکٹرونک مارکیٹ میں یہ دوکان بہت مصروف تھی۔ اطراف کے دفترو ں میں چائے لے جانا پھر خالی برتن واپس لانا پڑتا تھا پیسے ملتے تھے مگر سیٹھ کی پھٹکار بھی ملتی تھی۔ پیالیاں، برتن، گلاس ٹوٹتے تھے تو گالیوں سے بھی نوازا جاتا تھا۔

چائے کی دکان میں ہی اس کی ملاقات فضل رحمت سے ہوئی تھی۔ وہ اپنے گاؤں گیا تھا۔ کراچی آنے کے بعد دوسری دفعہ، جمع کی ہوئی کمائی لے کر۔ اس کے جمع کیے ہوئے پیسوں سے اس کی ماں کا علاج ہوا تھا۔ اس کی بہن کے بچوں کی دیکھ بھال ہوئی تھی جس کا شوہر یکا یک مر گیا تھا۔ اس نے کراچی میں کمائی کیا شروع کی تھی گھر پر یکا یک مسائل بڑھنے شروع ہوگئے تھے۔ وہ کبھی کبھی سوچتا تھا کہ شاید یہ سب کچھ اس کے کام کرنے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ نہ وہ کام کرنے کراچی آتا اور نہ گھر کے یہ خرچ بڑھ جاتے۔ اوپر والے کا حساب بھی خوب ہے ایک ہاتھ سے دے دوسرے ہاتھ سے واپس لے۔

گاؤں میں ہی قریب کے دوسرے گاؤں سے کسی نے آکر اسے ایک پیکٹ دیا تھا کہ کراچی میں فضل رحمت کو دے دے۔ فضل رحمت اس سے ملنے کے لیے اس چائے کی دوکان پر آیا تھا۔ وہ فضل رحمت کو لے کر کینٹ اسٹیشن کے پیچھے اپنے گھر آیا تھا وہاں اس کو وہ پیکٹ دیا تھا۔ فضل رحمت کو کھانا کھلایا تھا اور چائے پلائی تھی۔

فضل رحمت نے اس سے کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کام کرے، میٹروپول کے چاروں طرف سڑکوں گلیوں میں پارک کی جانے والی گاڑیوں کی صفائی کا کام۔ وہ بہت دنوں سے یہ کام کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو بچے بھی کام کر رہے تھے مگر اب کام بہت بڑھ گیا تھا اسے کسی اچھے مددگار کی ضرورت تھی۔ کراچی جا کر پیسے کما کر بھی اسے کیا ملا تھا؟ صدیوں سے چلنے والا خاندانی جھگڑا تو ختم نہیں ہوا تھا۔ خون کی وہ پیاس تو

نہیں بجھی تھی۔ جرگے کا فیصلہ، رمضان کا مہینہ، مذہب کے اصول کراچی کا پیسا کچھ بھی نہیں بدل سکتا تھا۔ قبائل کے پشتو اصول نہ جانے کن پتھروں کے تھے کہ ٹوٹتے نہیں تھے، بدلتے نہیں تھے۔ روشنی کہاں تھی دُور دُور اندھیرا تھا۔

رحمان کو کام پسند آ گیا پھر وہ فضل رحمت کے ساتھ کام پر لگ گیا تھا۔ ابھی سال بھی نہیں ہوا تھا کہ فضل رحمت کو گاؤں جانا پڑ گیا تھا، کچھ پرانی دشمنی تھی جس کے کارن فضل رحمت کے گھر کو آگ لگا دی گئی تھی۔ ایک بچہ، باپ اور ماں جل کر مر گئے تھے۔ تین بچے اور بیوی اکیلے رہ گئے تھے۔ فضل رحمت کو جانا پڑ گیا پھر فضل رحمت واپس نہیں آیا۔ ماں باپ اور بچے کی موت اور ایسی موت... فضل رحمت جیسے ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ آہستہ آہستہ سوکھتا چلا گیا تھا۔

رحمان اب کافی دن گزار چکا تھا، اب وہی انچارج تھا اس کام کا۔ دن رات محنت کرنا اور پیسے جمع کرنا اس کا کام تھا۔ وہ بہت ملنسار تھا، اچھے طریقے سے بات کرتا، محبت سے ملتا۔ اس کے ساتھ دوسرے چار پانچ پٹھان بچے کام کرتے تھے۔ اس نے جاہل ہونے کے باوجود اپنے کام کو بہت اچھے طریقے سے سنبھالا تھا۔ وہ بلا کا تجارتی ذہن رکھتا تھا اور لوگوں سے بات کرنے کا ڈھنگ بھی اسے خوب آتا تھا۔ زیادہ تر لوگ اپنی گاڑیاں اس کے حوالے کر دیتے تھے۔

ہمارے دیکھتے دیکھتے اس کے چہرے پر داڑھی اگ آئی تھی، زیادہ تر پٹھانوں کی طرح سے وہ پہلے بھی مذہبی تھا اب اور بھی مذہبی ہوگیا تھا۔ اب تو اس کی شادی بھی ہوگئی تھی اور دو بچے تھے جو اس کی بیوی کے ساتھ گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ سال میں دو تین دفعہ گاؤں کا چکر لگاتا تھا۔

اب تو گاؤں جانا آسان ہے۔ کراچی سے بس نکلتی ہے۔ سندھ سے، پنجاب سے ہوتے ہوئے سوات ہمارے گاؤں تک پہنچ جاتی ہے صاحب۔ جب میں آیا تھا تو پانچ دن لگتے تھے کراچی آنے میں۔ اب تو دو دن میں کراچی سے سوات پہنچ جاتے ہیں ہم لوگ۔ سب کچھ آسان ہوگیا ہے اور بسیں بھی ایسی ہیں جیسے بڑے بڑے گھر۔ آرام والی کرسیاں اور ٹھنڈی۔ پسینا تک نہیں چھوٹتا ہے۔

وہ اب بھی کینٹ اسٹیشن میں ہی رہتا تھا، اسی کچی آبادی میں جہاں اس نے

کراچی کی زندگی شروع کی تھی۔ ایک دن اس نے بتایا تھا کہ چھٹی والا دن کراچی میں بڑا مزا آتا تھا۔ ہم سارے پٹھان لوگ برنس روڈ پر کباب یا نہاری کھاتے تھے۔ کبھی کلفٹن پر سمندر کو دیکھتے تھے اور کبھی بمبینو، پرنس، کیپری، نشاط، ناز، لیرک، پیراڈائز، ریکس سینما میں آگے بیٹھ کر فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ وہ خود تو مذہبی تھا مگر مذہب کے بارے میں بھی اس کا انداز عجیب تھا۔ مجھے یاد ہے رمضان کے زمانے میں میں اپنی گاڑی میں جب وہاں پہنچا تھا تو پولو کا پیپرمنٹ چوستا ہوا اُترا تھا۔ مجھے خیال بھی نہیں تھا کہ رمضان کا مہینہ ہے۔ میں گاڑی سے اُتر کر جانے لگا تو اس نے مجھ سے کہا تھا ''راستے میں منھ نہ چلائیں میرا تو کچھ بھی نہیں ہے مگر کوئی اور مذہبی آدمی روزہ کا احترام نہ کرنے پر مجھے مار بھی سکتا ہے، وقت بدل گیا ہے صاحب۔ پہلے کراچی میں سینما بھی چلتے تھے، شراب خانے بھی ہوتے تھے مگر لوگ اچھے تھے ایک دوسرے کو مارتے نہیں تھے، چوری بھی نہیں کرتے تھے، ڈکیتی بھی نہیں کرتے تھے، ابھی تو معاملہ بڑا خراب ہوگیا ہے۔ مسجدیں تو بنتی چلی جارہی ہیں اور ایسی ایسی جگہوں پر بنتی ہیں کہ سمجھ نہیں آتا ہے کہ کیوں بنی ہیں۔ کسی جگہ روڈ پر کہیں فٹ پاتھ پر۔ جس جگہ دکان بن سکے لوگ مسجد بنا دیتے ہیں۔ اچھا اسلام ہے کراچی میں۔ جلسے تو کہ بڑے سے بڑے ہو رہے ہیں مگر ایمان داری ختم ہوگئی ہے۔ چوری بھی ہے، لوٹ مار بھی ہے اور مسلمان مسلمان کو مار بھی دیتے ہیں۔ ہم تو قبائلی لوگ ہیں، جاہل لوگ۔ بے وجہ قتل کرتے ہیں۔ جہالت کی وجہ سے مگر مسجدوں کا سودا نہیں کرتے ہیں۔ نمازیوں کا بیوپار نہیں چلاتے ہیں، جتنا مذہب سمجھتے ہیں اتنا ہی اس پر عمل کرتے ہیں۔ مذہب کی تجارت صرف کراچی میں ہوتی ہے۔''

میں نے سوچا کہ رحمان بھی فلاسفی ہوگیا ہے۔ کراچی میں کوئی بھی آدمی فلاسفی ہوسکتا ہے فلاسفی ہونے میں کیا لگتا ہے۔ فلاسفی ہونے کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں ہے، صرف سوچ کی عادت ہونی چاہیے، صرف آنکھیں کھلی رکھنے کی ضرورت ہے، صرف کان کھلے رہنے چاہییں، صرف دیکھنا چاہیے اور سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے فلسفہ تو خود بہ خود آجاتا ہے۔

رحمان ہمارے دوسرے بھی بہت سے کام کردیتا تھا۔ بجلی کے بل، گیس کے

بل، ٹیکس کے کاغذ اور بہت سارے دوسرے چھوٹے موٹے کام۔ ایک طرح سے ہمارے آفس اور اس علاقے میں اور دوسرے آفسوں میں کام کرنے والوں سے اس کے کچھ خاص قسم کے تعلقات تھے۔

کبھی کبھار آواری ٹاور کے نیچے والے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر ہم لوگ اس کے بارے میں بھی بات کرتے تھے۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ وہ بلا کا کنجوس ہے۔ ہر ایک نے حساب کتاب لگایا ہوا تھا کہ جس شدت اور محنت سے وہ کام کرتا تھا، اس سے اس کی اچھی خاصی آمدنی تھی مگر اس کی کنجوسی بھی شدید تھی۔ ایک ایک روپیہ جوڑتا تھا نہ جانے کیوں، اور کہاں یہ خزانہ جمع کر رہا تھا وہ۔

ایک دن میں نے اس سے ہنستے ہوئے کہا بھی تھا کہ یار! کچھ پیسے اپنے اوپر بھی خرچ کر لیا کرو۔

وہ ہنس دیا تھا اور ہنس کر اس نے کہا تھا، ''صاحب! میں جہاں خرچ کرتا ہوں اس سے اچھی جگہ کوئی ہو ہی نہیں سکتی ہے۔''

میں نے بھی ہنس کر کہا تھا، ''اچھا وہ کون سی جگہ ہے بھائی۔''

''کبھی بتاؤں گا سر!'' اس نے کہا تھا۔

مگر وہ بتا نہیں سکا تھا کہ یکایک وہ حادثہ ہوگیا۔ صبح سویرے اس نے پہلی گاڑی صاف کی تھی اور سڑک کی دوسری طرف جا رہا تھا کہ دوسری جانب سے آنے والے ٹرک کی زد میں آگیا تھا۔ میں جب آفس پہنچا تھا تو اس کے پاس کام کرنے والے ایک لڑکے نے بتایا تھا۔ شام کو ہم لوگ اسے دیکھنے گئے تھے۔ جناح ہسپتال کے ہڈیوں کے وارڈ میں وہ بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ گھٹنے سے اوپر اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئیں تھیں۔

صبح کے وقت کسی چرسی ڈرائیور نے اس کے ارمانوں، اس کی تمناؤں کا بڑی بے دردی سے خون کر دیا تھا۔

ہم سب کو بہت افسوس ہوا تھا۔ یکایک انسان کے ساتھ ایک حادثہ ہوتا ہے اور اس کے سارے خواب چکنا چور ہوجاتے ہیں، ڈھیر ہوجاتے ہیں، ختم ہوجاتے ہیں۔ جو بھی حکمت ہے اس کی وہی سمجھ سکتا ہے، ہماری سمجھ سے بالاتر ہے اس کا حساب۔ اس

کی دُنیا اس کا حساب وہی جانے وہی سمجھے۔

چھ ہفتے ہسپتال میں رہ کر وہ سوات واپس چلا گیا تھا۔ ہماری کاریں اسی طرح سے دُھل رہی تھیں مگر وہ نہیں تھا۔

اکثر و بیش تر ہم اس کے بارے میں بات کرتے تھے۔ پھر ایک دن میں نے اور کریم نے فیصلہ کیا تھا کہ اگلی دفعہ جب دفتر کے کام سے پنڈی جانا ہوگا تو ہم لوگ دو تین دن کی چھٹی لے کر اس کے گاؤں جائیں گے اور کچھ روپے دیں گے اسے، ایک طرح کی امداد۔ سالوں اس نے ہم سب لوگوں کی کاریں صاف کی تھیں، ہماری خدمت کی تھی، ہمارے چھوٹے چھوٹے کام دوڑ دوڑ کر کیے تھے۔ اس کی کنجوسی اپنی جگہ پر مگر تھوڑا سا حق تھا اس کا ہم سب پر۔ بہت دنوں تک تندہی سے خدمت کی تھی اس نے ہم لوگوں کی۔ تنخواہ بھی لی تھی مگر ہمارے جو کام کیے تھے ایسے کام جو اس کے کام میں شامل نہیں تھے، ہمارے ذاتی کام، بہت سارے چھوٹے چھوٹے کام جن کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا ہمارے پاس۔ ان کو کبھی جوڑا جائے تو نہ جانے کتنے گھنٹے دن ہفتے، مہینے، سالوں کا کام اس نے صرف ہنس کر بغیر معاوضہ لیے ہوئے کیا تھا ہم لوگوں کے لیے۔ اُن کی تنخواہ نہیں لی تھی، کبھی کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ صرف خلوص و محبت سے اچھے بول بول کر ہمیں خوش رکھنے کی کوشش کی تھی۔

دفتر میں تقریباً ہر ایک نے اس کے لیے چندہ دیا تھا، کسی نے پچاس روپے کسی نے سو اور کسی نے پانچ سو بھی دیے۔ آٹھ ہزار سات سو دس روپے جمع ہوگئے تھے۔ ہم نے اس کا پتا معلوم کیا تھا اور کچے پکے راستوں سے ہوتے ہوئے شہروں، قصبوں، جنگلوں سے گزر کر پہاڑوں سے لڑ کر اس کے گاؤں پہنچ گئے تھے۔

وہ ہم دونوں کو دیکھ کر حیران ہوگیا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کراچی سے کوئی اس طرح سے ملنے آجائے گا۔ اس کے چہرے پر رونق آگئی اور آنکھوں سے چھلکتے ہوئے آنسو اڈ اڈ کر زمین پر گر رہے تھے۔

اس نے آواز دے کر کسی کو بلایا اور مسجد کے اندر سے ایک آدمی آیا تھا۔ رحمان نے اس سے کہا کہ اس کے گھر پر جا کر کھانے کا بندوبست کرے کہ کراچی سے مہمان آئے ہیں۔ وہ بے تحاشا خوش لگ رہا تھا۔

ہم دونوں اس کے ساتھ بیٹھ گئے تھے، باتیں شروع کردی تھیں۔ اس نے اب گاؤں کی زندگی اپنا لی تھی۔ باپ کی چھوٹی سی زمین پر اس کے بچے، اس کی بیوی اور ایک دو مزدور کام کرتے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ سوچ رہا ہے کہ ایک دکان کھول لے تو دکان پر بیٹھ کر کام کرسکے گا، اب کراچی تو نہیں جاسکتا ہے۔ پیر کٹ جانے کے بعد وہ کراچی کے کام کا نہیں تھا۔ وہ مکمل تھا تو کراچی کے کام کا تھا۔ اب وہ کٹے ہوئے پیروں کے ساتھ لنگڑا لنگڑا کر کراچی میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اب یہ گاؤں، یہ دیہات، یہ کھیت، یہ کھلیان ہی میرا ہے، اب مجھے یہیں بھی رہنا ہے، یہیں مرنا ہے۔

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ بولا تھا کہ صاحب یہ جو پیر کاٹ دیتے ہیں تو ان کا کیا کرتے ہیں۔

''مجھے تو کچھ بھی اندازہ نہیں۔ شاید کاٹ کر کسی جار میں رکھ دیتے ہوں گے یا اگر پیر میں جراثیم پڑ گئے ہوں تو اسے جلا دیتے ہوں گے۔ کسی سرجن سے پوچھنا ہوگا۔'' میں نے جواب دیا تھا۔

''نہیں صاحب کسی وجہ سے پوچھتا ہوں۔'' وہ دھیرے سے بولا تھا۔ ''کیوں کہ جب میں ادھر مسجد کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہوں تو میرے پیروں میں کھجلی ہوتی ہے اور میرے ہاتھ میرے پیروں کو تلاش کرتے ہوئے پتھروں سے ٹکراتے ہیں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میرے پیر تو کٹ چکے ہیں۔ نہ جانے کہاں ہوں گے کسی نے دفن کر دیا ہوگا، شاید جلا دیا ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا ہے، جب پیر ہیں ہی نہیں تو پھر کھجلی کیوں ہوتی ہے؟''

میری سمجھ سے بھی باہر تھا۔ ہم دنوں ہی خاموش رہے تھے ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اس مسجد میں ہی ہم لوگوں نے اس کے ساتھ اس کے دل رکھنے کو ظہر کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد مسجد کے باہر درخت کے نیچے ایک سائبان سا بنا ہوا تھا جہاں دوپہر کا کھانا ہم لوگوں نے کھایا تھا۔ گھر کا پکایا ہوا پالک دال اور شلجم گوشت۔ ایسا کھانا بہت کم کھایا تھا ہم لوگوں نے یا شاید اس وقت بھوک بہت شدت سے لگی ہوئی تھی۔

کھانے کے بعد چائے پی کر میں نے رحمان کو لفافہ دیا جس میں اس کے

لیے جمع شدہ رقم تھی۔ اس کے چہرے پر حیرت شدت سے عود کر آئی، ''مگر کس لیے میرا تو کوئی حساب نہیں تھا آپ لوگوں کی طرف۔'' اس نے کہا تھا۔

''نہیں حساب کی بات نہیں ہے یہ ہماری طرف سے ہے تمھارے لیے، ہم سب نے جمع کیا ہے تمھارے لیے۔'' ساتھ ہی میں نے دل میں سوچا تھا کہ اس سے پوچھ لوں کہ اب وہ اپنی کنجوسی کی وجہ بتا دے کہ وہ خود ہی بول پڑا۔ پہلے مسکرایا پھر دھیرے سے بولا تھا۔ 'آپ نے مجھ سے پوچھا تھا ناں کہ میں پیسوں کا کیا کرتا ہوں؟'' آپ تمام لوگوں سے پیسے لیتا ہوں۔ تھوڑے تھوڑے کاموں کے عوض بھی پیسے کی اُمید کرتا ہوں۔ پھر اتنی کنجوسی کیوں کرتا ہوں۔ دراصل میں پیسے جمع کرتا تھا کہ ایک دن اس گاؤں میں اس پہاڑی کے اوپر مسجد بناؤں گا۔ یہ چھوٹی سی مسجد، اس کی دیوار اس کی چھت اس کا فرش سب کچھ میں نے آپ لوگوں کے دیے ہوئے پیسے جمع کر کے بنایا ہے۔ دن دن بھر کام کیا ہے، رات رات بھر جاگا ہوں، ایک ایک روپیہ جوڑ کر ایک ایک اینٹ خریدی ہے اس مسجد کے لیے۔ اس حادثے سے پہلے میں نے اتنے پیسے کر لیے تھے کہ اس مسجد میں قالین بھی لگوا دوں اور لاؤڈ اسپیکر بھی لگوا لوں۔ وہ سب کچھ بیماری میں خرچ ہوگیا، اب آپ لوگ آئے ہو یہ پیسے لائے ہو تو مسجد میں بیٹھنے کی جگہ بھی اچھی ہوجائے گی۔ مگر میں اب سوچتا ہوں کہ اس مسجد کے ساتھ اسکول بھی بنا دوں۔ اگر ہمارے اس گاؤں میں اسکول ہوتا تو شاید ہم لوگوں کی زندگی ذرا بہتر ہوتی۔ مجھے کراچی نہیں جانا پڑتا۔ میرے پیر نہیں کٹتے۔ اذان تو لاؤڈاسپیکر کے بغیر بھی ہوسکتی ہے۔ نمازی اذان کا انتظار نہیں کرتے، وہ وقت پر خود ہی چلے آتے ہیں۔ اگر ان پیسوں سے اسکول کا استاد ادھر آجائے تو وہ ہمارے بچوں کو پڑھا دے گا پھر ہم لوگ اور بھی پیسا جمع کرلیں گے اس کی تنخواہ کے لیے۔''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا تھا۔ اس کے آدھے جسم کے اوپر جو سر تھا، جو آنکھیں تھیں، وہ سوچ رہی تھیں۔ مجھے لگا جیسے میں اس گاؤں کی چھوٹی سی سرخ اینٹوں والی مسجد کے سامنے نہیں کھڑا ہوں بلکہ قرطبہ کی مسجد الحمرا میرے سامنے ہے، جیسے ٹھٹھہ کی شاہجہانی مسجد میرے سامنے ہے، جیسے لاہور کی شاہی مسجد میرے سامنے ہے جیسے دہلی کی جامع مسجد میرے سامنے ہے۔ مجھے لگا جیسے کراچی کی وہ ساری مسجدیں جن کے

چاروں طرف دکانیں بنانے والوں نے سڑکوں، چوراہوں، فٹ پاتھوں پر قبضہ کر کے مسجد کے نام پر اپنی دکان چمکائی ہوئی ہے۔

وہ حشرات الارض ہیں، گندے پانی کے کیڑے ہیں جو دین کے نام پر دُنیا بناتے ہیں اور ادھر کراچی سے دور، بہت دور سوات گاؤں میں میرے سامنے رحمان کھڑا تھا، کھچڑی بالوں کے چھترائی ہوئی داڑھی کے ساتھ۔ اوپر بیساکھی کے سہارے کھڑے ہوئے اس بھولے آدمی کی صورت میں کچھ ایسی شان تھی کہ مجھے بے اختیار اس پر پیار آگیا، دونوں کٹی ہوئی ٹانگیں اور بیساکھی کے سہارے کھڑا ہوا اس کا بدن یوں لگ رہا تھا جیسے منبر اور محراب۔ میرا جی چاہا کہ میں وہیں عقیدت سے جھک جاؤں۔ میں نے ایک ہاتھ سے آنکھوں کے آنسو پونچھے اور دوسرا ہاتھ رحمان سے مصافحے کے لیے بڑھا دیا۔

□

مرغ گویم

مرغ گویم
باہر نکلم
چیل جھپٹم
جان کھویم
مرغ گویم مرغ گویم مرغ گویم مرغ گویم

اور مرغ نے کہا، میرے بچو... میرے بچو، جو تم باہر نکلو گے تو چیل جھپٹا مار کر تم کو لے جائے گی اور تم اپنی جانوں سے چلے جاؤ گے، اپنی جانوں کو کھو دو گے۔ لہٰذا باہر نہ نکلا کرو۔ چیلوں سے ڈرا کرو... مرغ گویم، مرغ گویم، مرغ گویم۔

مولانا شمسی کی آواز میں مثنوی مولانا روم کی طرز پر بڑے انداز سے خرم بھائی نے ہم سب بچوں کو یہ سنایا تھا۔ بڑے بھی ہنس دیے تھے اور ہمیں بھی بڑا مزہ آیا تھا۔

یہ خرم بھائی سے میری پہلی ملاقات تھی۔

اس زمانے میں ریڈیو پاکستان سے روزانہ مثنوی مولانا روم پر درس کا ایک پروگرام آتا تھا مولانا شمسی کی زبردست آواز تھی اور وہ بڑے عمدہ طریقے سے مولانا روم کی مثنویات پڑھتے تھے، پھر ان کی وضاحت بھی کرتے جاتے تھے۔ ہمارے گھر میں

اور ہمارے رشتے داروں کے گھروں میں بڑی پابندی سے یہ پروگرام سنا جاتا تھا۔ اس زمانے میں صرف ریڈیو ہی تھا جس پر تفریحی پروگرام بھی ہوتے تھے اور مذہبی پروگرام بھی سنے جاتے تھے۔ نہ وی سی آر تھا اور نہ کیبل ٹیلی وژن کی عیاشی اور طرح طرح کے پروگرام۔ کبھی بین الاقوامی خبریں، کبھی کھیل، کبھی فلم، ڈرامے اور نہ جانے کتنے تعلیمی پروگرام۔ ٹیلی وژن نہ ہوا یونی ورسٹی ہوگئی، سنیما ہال ہوگیا یا جنگل جہاں جانوروں کو ہر انداز سے دیکھیں یا پھر سمندر کے اندر ہونے والے واقعات سے اپنے آپ کو روشناس کریں۔

میں اسکول میں پڑھتا تھا اور خرم بھائی مجھ سے دو سال سینئر تھے مگر ہماری دوستی خوب ہوئی تھی۔ خاندان کی ہر تقریب میں ان سے ملاقات ہوتی تھی اور میری کوشش ہوتی تھی کہ ان سے ملنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دوں۔ وہ ناظم آباد میں رہتے تھے اور ہم لوگ پی آئی بی کالونی میں، مگر اکثر و بیش تر شادیوں میں، میلادوں میں اور قرآن خوانیوں میں ان سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔

ان کو ہمیشہ شریر کہا جاتا، شاید وہ شریر بھی تھے، مگر مجھے ان کی جو بات سب سے زیادہ اچھی لگتی تھی وہ تھی ان کی پڑھنے کی عادت۔ مجھے بھی پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ کرشن چندر، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، سب کے افسانے مجھے اچھے لگتے تھے۔ میں نے تو آٹھویں کلاس میں ہی باجی کی نویں اور دسویں کلاس کی اردو کی کتاب میں سے سارے افسانے اور کہانیاں پڑھ ڈالی تھیں۔

کورس کی کتابیں کھیل اور کود اپنی جگہ پر مگر ساتھ ہی اردو کی کتابیں پڑھنے کا مجھے بہت شوق تھا۔ خرم بھائی نے ہی مجھے ابن صفی اور اکرم الٰہ آبادی کی کتابوں سے بھی متعارف کرایا تھا پھر میں نے ایک آنے میں دو کتابوں والی گلی کی لائبریری سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر یہ کتابیں لی تھیں اور پڑھ ڈالی تھیں۔ پھر ان ہی لائبریریوں سے مجھے نسیم حجازی ، عادل رشید، اے آر خاتون اور رضیہ بٹ کی کتابوں کا چسکہ لگا تھا۔ وہ یہ ساری کتابیں پہلے ہی پڑھ چکے تھے۔ ہم جب بھی ملتے تھے اپنی اپنی کتابوں کے بارے میں ضرور باتیں کرتے تھے۔ ان کا انداز ٹھہرا ہوا تھا اور اس ٹھہراؤ میں ایک وقار بھی تھا جو صرف ان کا ہی انداز تھا، جو زندگی بھر ان کے ساتھ لگا رہا۔

جب میں نے آٹھویں کلاس کا امتحان پاس کیا تو انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا تھا اور ان کا داخلہ گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں ہوگیا۔ میں تن دہی سے نویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے چکر میں لگا ہوا تھا۔ مجھے انجینئر بننے کا شوق تھا اور ان کو فزکس پڑھنے کا۔ ان کی وجہ سے مجھے بھی فزکس میں کافی دلچسپی ہوگئی تھی۔ انھوں نے ہی مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ کائنات کے بارے میں فزکس کے قوانین کیا کہتے ہیں؟ ایٹم کے اندر کیا ہوتا ہے اور نیوٹران کو بھی توڑا جاسکتا ہے۔ کائنات کے بارے میں ان کی باتیں سحر انگیز تھیں، جیسے طلسم ہوشربا کی داستان۔ وہ ستاروں کی تخلیق، آسمانوں پر موجود بلیک ہولز اور سورج پر ہونے والے دھماکوں کے بارے میں بے تحاشا اور بغیر رکے بولتے رہتے تھے۔ کائنات ان کے لیے ایک معما تھی، ایک طلسم تھا جس کے بارے میں معلومات جمع کرنے کا انھیں بے حد شوق تھا۔

مجھے گھروں کی کسی تقریب میں ہی پتا لگا تھا کہ خرم بھائی سرخے ہوگئے ہیں اور گورنمنٹ کالج ناظم آباد کے الیکشن میں پیشانی پر سرخ پٹی باندھ کر اُلٹے سیدھے نعرے لگاتے ہیں۔ کسی کے سرخے ہوجانے کی خبر اس زمانے میں بری خبر ہوتی تھی۔ مجھے تو یہی بتایا گیا تھا کہ سرخے سوشلسٹ ہوتے ہیں، وہ مارکس لینن اور اینگلز کو مانتے ہیں۔ اسلامی نظام کے خلاف ہیں اور ملک میں روس والوں کی حکومت چاہتے ہیں۔

مجھے اس خبر پر حیرت ہوئی تھی۔ خرم بھائی بہت سمجھ دار شخص تھے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ ان کا تعلق روس سے کیوں ہوگا؟ وہ کیوں مارکس اور لینن کے غلام ہوں گے؟

ہمارا گھر بہت مذہبی تو نہیں تھا مگر غیر مذہبی بھی نہیں تھا۔ ساری بہنیں پابندی سے نماز پڑھتی تھیں۔ ہم سب نے باضابطہ قرآن پڑھا تھا۔ ہر ایک کے لیے اچھی سی ختم قرآن کی تقریب منعقد کی گئی تھی۔ ہم سب ہی پابندی سے روزہ رکھتے تھے مگر ہم پر بے جا پابندی بھی نہیں تھی۔ ہمارے گھروں کی لڑکیاں اسکول، کالج، یونی ورسٹی بھی جاتی تھیں باضابطہ برقعہ تو نہیں پہنتی تھیں مگر دوپٹے اور ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کے علاوہ میں نے تو کسی کو کچھ اور پہنے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ آج کل کے زمانے کی طرح اسلام اسلام کا نعرہ بہت نہیں لگتا تھا مگر جتنی ایمان داری اس وقت تھی اب اس کی تھوڑی سی

جھلک بھی دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ اب تو مجھے لگتا ہے کہ اندر سے ہماری روحیں بھی گندگی کا شکار ہوگئی ہیں، اوپر سے مذہب کا نعرہ ہے تو کیا فائدہ۔

اگلے ہی ہفتے بڑے ابو کے گھر پر خرم بھائی سے ملاقات ہوگئی تھی۔ وہ بڑے پیار سے ملے تھے، اسی گرم جوشی کے ساتھ جو ان کا وطیرہ رہا تھا۔ انھوں نے اس وقت شوکت صدیقی کی کتاب ''خدا کی بستی'' پڑھی تھی اور مجھ سے کہا تھا کہ ضرور پڑھنا۔ میں نے کہا تھا کہ ہاں ضرور پڑھوں گا مگر امتحانات کے بعد۔

میں نے ان سے پوچھا، سنا ہے کہ وہ سرخے ہوگئے ہیں۔ وہ ہنس دیے تھے۔ نہیں بھائی کوئی سرخا ورخا نہیں ہوئے ہیں۔ کالج میں الیکشن تھے تو ہم دوستوں نے سرخوں کی پارٹی کو سپورٹ کیا تھا، ارے وہی این ایس ایف والوں کو۔ تم بھی کالج میں جاؤ گے تو ان کو ہی سپورٹ کرو گے۔ صحیح کہتے ہیں یہ لوگ۔ تعلیم عام ہونی چاہیے اور مفت ہونی چاہیے، روزگار ہر ایک کو ملنا چاہیے۔ ارے کیا برائی ہے اس میں۔ کیا برائی ہے اگر غربت کا خاتمہ ہوجائے۔ بچے اسکولوں میں جایا کریں، علاج ہر ایک کا ہوجائے۔ سماج میں انصاف ہر ایک کو ملے۔ ایک ایسا نظام ہو جہاں بچے تعلیم سے محروم نہ رہیں اور بڑے روزگار سے بے روزگار نہ ہوں۔''

بات ان کی صحیح تھی۔ مجھے یقین تھا کہ خرم بھائی درست کہہ رہے ہیں۔ میں نے نویں کلاس میں چاروں مضامین میں بڑے اچھے نمبر لیے تھے۔ دسویں بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کرکے آدم جی سائنس کالج میں داخل ہوگیا تھا۔ خرم بھائی نے انٹر کے بعد کراچی یونی ورسٹی میں بی ایس سی میں داخلہ لے لیا تھا۔ ان کو فزکس ڈیپارٹمنٹ میں آسانی سے داخلہ مل گیا تھا۔

شروع میں کالج مجھے اچھا نہیں لگا تھا حالاں کہ کہا جاتا ہے کہ کالج میں تو ایک طرح کی آزادی ہوتی ہے۔ آدم جی سائنس کالج میں آزادی تھی اور نہیں بھی تھی۔ آزادی ہونے کے باوجود پوچھنے والے بہت تھے۔ کالج میں کوئی خاص سیاست بھی نہیں تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آدم جی سائنس کالج کے طلبہ کی دبا کر پوزیشنیں آتی تھیں۔ ہم لوگوں کا مقابلہ ڈی جے سائنس کالج سے تھا۔ کبھی ہماری پوزیشنیں ہوتی اور کبھی ان کی۔ ماحول ایسا تھا کہ ہر ایک کو پڑھنا ہی پڑتا تھا۔

میں کالج میں اچھا جا رہا تھا اور مجھے مزہ بھی آنے لگا تھا۔

خرم بھائی یونی ورسٹی میں بہت خوش تھے۔ ایک دفعہ کالج سے چھٹی کر کے میں ان سے ملنے کراچی یونی ورسٹی گیا بھی تھا۔ کیا خوب جگہ تھی۔ سبزی منڈی سے یونی ورسٹی کی بس میں بیٹھ کر ویرانوں اور جنگلوں سے ہوتے ہوئے جب یونی ورسٹی پہنچے تو ایسا لگا کہ جیسے صحیح معنوں میں کسی پڑھنے لکھنے کی جگہ پر آگئے ہیں۔ اب تو بلڈنگوں، بے ڈھنگی عمارتوں سے گزرتے ہوئے جب یونی ورسٹی آتی ہے تو کوئی خاص احساس نہیں ہوتا ہے بس یہ بھی ایک جگہ ہے، بہت سی جگہوں کی طرح۔ وہی میلی دیواریں، نعرے لکھے ہوئے شاید پڑھائی ابھی بھی ہوتی ہو مگر وہ ماحول اب نہیں ہے۔

خرم بھائی نے تفصیل سے یونی ورسٹی دکھائی تھی۔ ہاسٹل میں ایک دوست کے کمرے میں لے گئے جہاں ان کا بھی سامان رکھا ہوا تھا اور اسی کمرے میں پہلی دفعہ کمرے کی کھڑکی کے اوپر ایک تصویر لگی ہوئی تھی داڑھی والے ایک شخص کی۔ مجھے پتا لگا تھا کہ یہ کارل مارکس کی تصویر ہے۔ میرے ذہن میں مارکس کی دوسری شکل تھی۔ مذہب کو افیون کہنے والے اور خدا کے وجود سے انکار کرنے والے کی شکل پر تو پھٹکار برسنی چاہیے تھی۔ میں نے خرم بھائی سے یہی بات کہہ دی تھی۔

وہ ہنس دیے تھے ''نہیں یار، اس نے کب کہا ہے کہ مذہب افیون ہے اس نے تو صرف یہ کہا ہے کہ دنیا بھر کے غریبوں کو مذہب کا نشہ پلا کر سرمایہ دار اور جاگیر دار ان کو استعمال کرتے ہیں اور مذہب کو افیون کی طرح استعمال کرتے ہیں۔'' پھر وہاں ایک طویل بحث کا آغاز ہوگیا تھا۔

میرے ساتھ نظام تھا۔ ہمارے محلے میں رہتا تھا اور ہم سب لوگوں میں کافی دوستی تھی۔ نظام مولانا مودودی سے بہت متاثر تھا اور اسلامی جمعیت طلبہ کا رکن بھی۔ اس نے کہا تھا نہیں۔ مارکس، اینگلز، لینن، اسٹالن اور ماؤزے تنگ یہ سارے کے سارے دہریے لوگ ہیں اور دُنیا میں لادینیت پھیلانا چاہتے ہیں اور اس طرح سے ان کی تصویر لگانا تو بالکل ہی غیر اسلامی ہے۔ اسلام میں تو ویسے بھی تصویریں جائز نہیں ہیں۔

خرم بھائی اور ان کا دوست اسلم ہنس دیے تھے۔ انھوں نے مجھے کمیونسٹ مینی

فیسٹو کی ایک کاپی اردو میں دی اور ہنس کر کہا تھا، ''تم اور نظام اس کو پڑھنا پھر بتانا کہ کہاں پر خدا کے خلاف، مذہب کے خلاف اور اسلام کے خلاف لکھا ہے۔ یہ تو ایک سیاسی جدوجہد کی بات کرتے ہیں۔ ظلم و ستم کے خلاف اور سرمایہ داری، جاگیرداری کے خلاف اور ان کے خلاف لڑنا تو غیر اسلامی نہیں ہے بھائی۔ جہاں تک مارکس کی تصویر کا تعلق ہے کمرے میں تو آئن اسٹائن کی تصویر بھی لگی ہوئی ہے۔ بڑے آدمی کی تصویر لگائی ہے، کوئی پوجا نہیں کرتے ان کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فزکس کا بادشاہ آئن اسٹائن ہے اور مزدور کا حق مارکس کے دریافت کردہ اصولوں کو سمجھ کر ہی ملے گا۔ وہ بڑا سائنس دان تھا جس نے فزکس کے اصولوں کو سمجھا تھا اور مارکس بڑا فلاسفی تھا جس نے سماجی اصولوں کو سمجھ کر سماج کو بدلنے کی بات کی تھی تاکہ ان لوگوں کو انصاف ملے جو صدیوں سے غلام ہیں، اس میں غیراسلامی کیا ہے، اپنی سمجھ سے باہر ہے۔''

کراچی یونی ورسٹی کے ہاسٹل کے اس کمرے سے میرے ذہن میں پہلی دفعہ سوشلزم اور جماعت اسلامی کی جنگ کا آغاز ہوا تھا۔ پہلی دفعہ مجھے پتا لگا کہ کمیونسٹ پارٹی بھی ہے جو پاکستان میں سوشلزم اور کمیونزم لانا چاہتی ہے۔ پہلی دفعہ نظام نے مجھے سمجھایا کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے اور پاکستان میں صرف اور صرف اسلامی نظام ہی چل سکے گا کیوں کہ پاکستان ہندوؤں سے لڑ کر الگ اسی لیے بنایا گیا تھا کہ یہاں پر اسلام کا اقتصادی، سماجی اور سیاسی نظام ہو، جہاں اللہ کی حکمرانی ہو اور پہلی ہی دفعہ مجھے احساس ہوا تھا کہ خرم بھائی اگر کمیونسٹ نہیں ہیں تو سوشلسٹ ضرور ہیں۔ مجھے اچھا بھی لگا تھا، برا بھی۔ اچھا یہ لگا تھا کہ اگر وہ غریبوں، مزدوروں، کسانوں کی حکومت کی بات کرتے ہیں تو کیا برائی ہے، انصاف تو ہونا چاہیے۔ آخر ہم لوگ غریب کیوں رہیں، کیوں نہ ہم بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور کیوں نہ ہم لوگوں کو عزت سے رہنا نصیب ہو اور برا یہ لگا تھا کہ اگر نظام صحیح کرنا ہے تو آخر مذہب سے دشمنی کی کیا ضرورت ہے، کیا سوشلزم اور انصاف لانے کے لیے مذہب دشمنی ضروری ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب نہیں سکھاتا ہے کہ ظلم کیا جائے۔ حق تو ہر ایک کو ملنا چاہیے اور اسلام تو ہے ہی غریبوں کا مذہب، ان غریبوں کا مذہب جو دھتکارے ہوئے لوگ ہیں۔ سوشلزم اور اسلام ایک دوسرے کے خلاف کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ یہ سارے سوالات میرے ذہن میں آئے

تھے کچھ جوابات ملے تھے اور کچھ جوابات نہیں ملے تھے۔

میں نے اور نظام دونوں نے انٹر فرسٹ ڈویژن نمبروں سے پاس کر لیا۔ میرا داخلہ این ای ڈی انجینئرنگ کالج میں ہوا اور نظام کا داخلہ ڈاؤ میڈیکل کالج میں ہوگیا۔ خرم بھائی یونیورسٹی میں ہی تھے اور ماسٹرز کررہے تھے ساتھ ہی ان کی سیاسی مصروفیات بھی جاری تھیں زور وشور کے ساتھ۔

اس زمانے کا این ای ڈی، یونی ورسٹی تو نہیں تھا مگر شاید آج کی انجینئرنگ یونی ورسٹی سے زیادہ انجینئرنگ اور آج کے انجینئرنگ کے طلبہ سے زیادہ باشعور طلبہ ہوتے تھے وہاں پر۔ سارا سال پڑھائی ہوتی تھی اور خوب ہوتی تھی۔ پڑھنے والے بھی سنجیدہ تھے اور پڑھانے والے بھی سنجیدہ اور جو لوگ پڑھ کر نکلتے تھے ان کے لیے نوکریاں بھی خوب تھیں۔ این ای ڈی میں پڑھنے کا مطلب تھا کہ ایک اچھا مستقبل طلوع ہوگا۔ سال میں ایک دفعہ الیکشن ہوتے تھے، سوشلسٹوں اور غیرسوشلسٹوں میں مقابلہ ہوتا تھا بعد میں یہ مقابلہ پروگریسو اور اسلامی جمعیت طلبہ کے درمیان ہونے لگا تھا مگر کوئی جھگڑا نہیں تھا، کوئی لڑائی نہیں تھی نہ گولیاں چلتی تھیں اور نہ قتل ہوتے تھے۔ اب تو یہ واقعات کراچی یونی ورسٹی، میڈیکل کالجوں اورانجینئرنگ کالجوں میں عام ہوکر رہ گئے ہیں نہ جانے کہاں کھو گئے وہ دن۔ معصومیت سے گزر کر بہیمانہ پن کا آنا ایک بڑا المیہ ہے ہمارے کراچی کا۔

ایک دن ڈاؤ میڈیکل کالج کے کینٹین میں جلسہ تھا، ملک میں جمہوریت کی بحالی کے لیے۔ خرم بھائی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں بھی ضرور اس میں شرکت کروں کون سا دور ہے این ای ڈی کالج ڈاؤ میڈیکل کالج سے۔ میں نے نظام کو بتایا تھا کہ میں بھی جلسہ سننے آؤں گا اور اس کے ساتھ چائے پیوں گا۔

نظام نے کہا تھا ضرور آنا مگر سوشلسٹوں کے جلسے میں آنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ لوگ تو ملک میں سرخ آندھی چلانے کی کوشش کررہے ہیں۔ ارے یہ لوگ پاکستان کو بھی سمرقند و بخارا بنا دیں گے۔ تم کو پتا ہے ہزاروں مسلمانوں کا تاشقند، ازبکستان، تاجکستان میں قتل عام ہوگیا ہے۔ روسی کمیونسٹوں نے پرولتاریوں نے وہاں مسجدوں میں نائٹ کلب کھول دیے ہیں اور شراب پیتے ہیں وہاں بیٹھ کر۔ کروڑوں

مسلمانوں کو لینن اور اسٹالن نے سائبیریا بھیج دیا، آج بھی چین میں اللہ کا نام لینے سے پھانسی لگ جاتی ہے۔ تم کو پتا ہے البانیہ میں تو نکاح کا سسٹم ہی ختم کر دیا گیا ہے۔ سب بن گئے ہیں حرام نسل۔ آنا ضرور مگر یار ان کمیونسٹوں، دہریوں کے چکر میں نہ پڑو تو بہتر ہے۔

میں بہت سادہ تھا۔ مجھے نہ تو سمرقند و بخارا کے بارے میں کچھ پتا تھا اور نہ پرولتاریہ کا مطلب مجھے آتا تھا۔ وہ تو بہت دنوں کے بعد پتا لگا تھا کہ بورژوا کا مطلب وہ طبقات ہیں جو استحصال کرتے ہیں اور پرولتاریہ سے مراد وہ محنت کش لوگ ہیں جن کا استحصال ہوتا ہے۔ بورژوا جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں جب کہ کمیونسٹ پارٹی عوامی جمہوری انقلاب یا دوسرے معنوں میں پرولتاریہ کی آمریت کے لیے کوشاں ہے۔ میرا اکثر دل کرتا ہے کہ اپنے کمیونسٹ دوستوں سے پوچھوں کہ پرولتاریہ کا انقلاب لانے والے اپنے خواب سے جاگ کر بورژوا کیوں بن کر رہ گئے ہیں اور سارے کے سارے امریکا، لندن، یورپ اور آسٹریلیا میں کیوں بس گئے ہیں۔ دل کرتا ہے کہ نظام کو بھی امریکا خط لکھ کر پوچھوں کہ بنگلہ دیش، انڈونیشیا، افغانستان، الجزائر اور ایران میں زیادہ مسلمان مرے ہیں کہ سمرقند و بخارا میں زیادہ مرے تھے۔ کراچی کی سڑکوں پر مسجدوں کے نام پر جو کاروبار ہو رہا ہے وہ تو نظر نہیں آرہا ہے مگر تاشقند کی مسجد میں بننے والا نائٹ کلب الطاف حسین قریشی کی تحریروں میں تو تھا، حقیقت میں کہاں ہے۔ کاش میں پوچھ سکتا۔ نہ وہ دن رہے نہ وہ وحشتیں۔ سب کچھ بدل گیا ہے۔ سب لوگوں نے جوتے بدل لیے اور ٹوپیاں بھی بدل گئی ہیں۔

اس دن ڈاؤ کی کینٹین میں بڑا جلسہ ہوا۔ مزدوروں اور طلبہ کے لیڈروں نے خوب تقریریں کی تھیں، فوج کے خلاف بہت نعرے لگے، جمہوریت کی بحالی کے مطالبات کیے گئے تھے، روٹی کپڑا اور مکان کے خواب جگائے گئے۔ میں نے سوچا تھا خرم بھائی صحیح کہتے ہیں اس ملک کو انقلاب کی ضرورت ہے۔ ہم کو جاگنا چاہیے، ہمیں جاگنا ہوگا۔

نظام تو جلسے میں نہیں آیا تھا مگر جلسے کے بعد اس نے ہمیں چائے پلائی تھی اور مجھے، خرم بھائی اور اسلم کو میڈیکل کالج کا دورہ کرایا تھا۔ مجھے سفید کوٹ میں گھومنے

والی لڑکیاں بہت اچھی لگی تھیں جو لڑکوں کے ساتھ گھوم رہی تھیں۔ اس زمانے میں این ای ڈی میں مشکل سے دس پندرہ لڑکیاں پڑھتی تھیں اور ہم لوگ ڈاؤ میڈیکل کالج اور وہاں کے لڑکے لڑکیوں کے تعلقات کے بارے میں عجیب عجیب قصے گھڑا کرتے تھے۔ نظام ہم لوگوں کو کالج کی عمارت میں پہلے اناٹومی ہال لے کر گیا تھا جہاں بارہ لاشیں ٹیبلوں پر رکھی ہوئی تھیں اور لڑکے لڑکیاں ان کی چیر پھاڑ کر رہے تھے۔ ہم تینوں کے لیے یہ عجیب وغریب قسم کا تجربہ تھا۔ اس کے بعد اس نے ہمیں اناٹومی کا میوزیم بھی دکھایا تھا جہاں کٹے ہوئے ہاتھ، پیر، سینہ، پیٹ اور انسانی جسم اپنے اندرونی رازوں کے ساتھ ہم سب لوگوں پر عیاں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ خرم بھائی نے کہا تھا کہ وہ بھی مرنے کے بعد اپنا جسم اس طرح کے کسی اناٹومی میوزیم میں دینا پسند کریں گے تاکہ طلبہ اس کو دیکھ کر پڑھیں اور تعلیم حاصل کریں۔ قبر میں اتر کر ختم ہوجانے کا کیا فائدہ ہے؟

ہم سب ہی ہنس دیے تھے۔ مگر اسلم نے کہا تھا کہ خرم تمھارا جسم اگر اس طرح جاروں میں سجا کر رکھا گیا تو یاد رکھنا کہ لڑکیاں بھی آکر ان جسموں کو پڑھتی ہیں۔ مرجانے کے بعد تم شرما بھی نہ سکو گے۔

ہم سب دوبارہ ہنس پڑے تھے۔

میڈیکل کالج کا وہ دورہ ایک خواب کی طرح سے مجھے یاد ہے، خاص کر اناٹومی میوزیم، چیر پھاڑ کی جانے والی لاشیں، سفید کوٹ میں لڑکیاں، ان کی آپس کی باتیں، جب بھی سوچتا ہوں ویسے ہی سلوموشن میں ایک فلم چلنی شروع ہوجاتی ہے۔ دھیرے دھیرے بے آواز اور بلیک اینڈ وائٹ۔ مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ پرانی یادیں بلیک اینڈ وائٹ فلموں کی طرح کیوں آتی ہیں؟ دماغ کے پردے پر رنگین فلمیں کیوں نہیں چلتی ہیں۔ وہ رنگین دن، ذہن میں بلیک اینڈ وائٹ فلم کی طرح چلنا شروع ہوجاتا ہے۔

ایک دن یکایک پتا لگا تھا کہ یونی ورسٹی میں این ایس ایف کے دو ٹکڑے ہوگئے ہیں، طلبہ تنظیم مکمل طور پر ٹوٹ کر رہ گئی ہے اور اس طرح سے ٹوٹی ہے کہ خرم بھائی اور اسلم دونوں ہی سوشلسٹ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے الگ ہوگئے

ہیں۔ اسلم روسیوں کے سوشلزم پر یقین رکھتا ہے اور خرم بھائی ماؤسٹ ہوگئے ہیں۔ یہ تو مجھے بعد میں خرم بھائی نے بتایا کہ روسیوں کے حامی دراصل ترمیم پسند سوشلسٹ ہیں جن کا انقلاب سے یقین اٹھ گیا ہے جنھوں نے اسٹالن کے مرنے کے بعد خروشیف کی قیادت میں روس کی کمیونسٹ پارٹی پر سازش کرکے قبضہ جما لیا ہے اور دنیا بھر میں برپا ہونے والے انقلاب کے خلاف سرمایہ دار ملکوں، امریکا، برطانیہ، فرانس وغیرہ کے ساتھ مل کر مزید سازشیں کررہا ہے اور چین کے ماؤزے تنگ، چو این لائی اور البانیہ کے انور ھوژا اس کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ دنیا کے محنت کش ایک اور سازش کا شکار ہوگئے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے پوچھا تھا کہ خرم بھائی چین اور روس کے جھگڑوں میں ہمیں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے ملک کے مسائل کا خروشیف اور چو این لائی سے کیا لینا دینا ہے۔ ہمیں تو اپنے لوگوں کو جگانا چاہیے۔ اب تو ایسا لگ رہا ہے کہ ہم انھیں جگانے کے بجائے ترمیم پسندی اور ماؤ کے انقلاب کا فرق سمجھانے میں لگ گئے ہیں۔ مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ میری بات سمجھ گئے ہیں مگر کچھ مجبوری تھی، کسی سے وفاداری تھی، سمجھنے کا ان کا اپنا عمل تھا کہ انھوں نے میری بات سے اتفاق نہیں کیا تھا۔

پھر مجھے پتا لگا تھا کہ خرم بھائی کا اپنے گھر والوں سے جھگڑا چل رہا ہے۔ خرم بھائی کے سب سے بڑے بھائی کسی انشورنس کمپنی میں کام کرتے تھے اور اچھا کمانے لگ گئے تھے، دوسرا بھائی انجینئر بن کر سعودی عرب چلا گیا تھا۔ تیسرا بھائی کسی بینک میں کام کرنے لگا تھا۔ خرم بھائی کے ابا کا خیال تھا کہ وہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھیں اور سرکار کی سول سروس میں شامل ہوجائیں مگر خرم بھائی نے ایم ایس سی کرنے کے بعد اپنے کچھ اور پروگرام بنا لیے تھے۔ انھیں مقابلے کے امتحان اور سرکاری نوکری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اسی زمانے میں ملک بھر میں ایوب خان مردہ باد کے نعرے لگنے شروع ہوئے تھے۔ پینسٹھ کی جنگ میں ہر کوئی ایوب خان زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا، اب وہی لوگ ایوب خان مردہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ بات چینی کی مہنگائی سے شروع ہوئی تھی اور سارے ملک میں جیسے ہنگامہ برپا ہوگیا تھا۔

مجھے پتا لگا تھا کہ خرم بھائی بھی کچھ اور طالب علم لیڈروں کے ساتھ گرفتار کرلیے گئے ہیں۔ اس رات مجھے نیند نہیں آئی تھی۔ مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ ان سے دوستی ایک طرح سے ان کی محبت میں بدل چکی ہے۔ ہم دونوں میں بہت فرق تھا۔ ہر لحاظ سے، میں سوشلسٹ تھا اور نہ ہی نظام کی طرح اسلام پسند بلکہ سیدھا سادا مسلمان تھا نماز پڑھتا تھا اور روزہ بھی رکھتا تھا اور اپنے معاملات عقل کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں ان کی طرح تن دہی کے ساتھ سیاسی کام تو نہیں کرتا تھا مگر کالج میں پروگریسو کے پینل کی حمایت ضرور کرتا تھا۔ مجھے ان کی گرفتاری سے شدید صدمہ پہنچا تھا۔

دوسرے دن مجھے پتا لگا تھا کہ طلبہ کی گرفتاری کے خلاف ڈاؤ میڈیکل کالج کی کینٹین میں ایک احتجاجی جلسہ کیا جا رہا ہے۔ میں اپنے دوستوں کو لے کر وہاں چلا گیا تھا۔ ایوب خان کی فوجی حکومت اور آمریت کے خلاف خوب نعرے لگے تھے، اس کے بعد لڑکے جلوس کی شکل میں کالج سے باہر نکلے تھے۔ بندر روڈ پر ایک بس کو آگ لگا دی گئی تھی اور این ای ڈی کالج کے پاس برٹش کونسل پر حملہ کردیا گیا تھا۔ پولیس نے لاٹھی چارج کی تھی، آنسو گیس پھینکی تھی اور ہوائی گولیاں چلائی تھیں۔ ہم لوگوں نے بھاگ کر کالج میں پناہ لی تھی۔

شام گئے گھر پہنچا تو نظام سے ملاقات ہوئی تھی۔ نظام ناراض تھا کہ بیوقوفی کے جلسے میں جانے کی کیا ضرورت تھی؟ خرم بھائی کی گرفتاری کا اسے افسوس تھا مگر اس کا خیال تھا کہ اب خرم بھائی نے ایم ایس سی کر لیا ہے انھیں سیاست ویاست کا چکر چھوڑ کر کام وغیرہ کرنا چاہیے۔ اگر یونی ورسٹی میں کام نہیں مل رہا ہے اور انھیں مقابلے کے امتحان میں نہیں بیٹھنا ہے تو کسی کالج میں لیکچرار بن جانا چاہیے۔ ہم لوگ محلے کے ایرانی ہوٹل میں چائے پیتے رہے اور اس دن کے بارے میں باتیں کرتے رہے تھے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس ہفتے اسلامی جمعیت طلبہ، اسلامی نظام تعلیم کا ہفتہ منا رہی ہے اور پورے ملک میں یہ ہفتہ منایا جائے گا، مگر کراچی میں جمعیت بہت منظم ہے۔ یہ بات صحیح بھی تھی کراچی میں تو جمعیت کافی منظم تھی۔ شہر کی دیواروں پر ان کے ہی نعرے لکھے ہوئے تھے اور ناظم آباد میں تو لگتا تھا کہ جماعت اسلامی اور جمعیت کے

علاوہ کسی اور کے بینر تو لگ ہی نہیں سکتے ہیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے پورا کراچی جمعیت کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے بے شمار کارکن دل و جان کے ساتھ کام کرتے تھے بغیر کسی لالچ اور بغیر کسی معاوضے کے۔

میں خرم بھائی سے کراچی سینٹرل جیل ملنے بھی گیا تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ جیل کے باہر کس قدر ہجوم تھا۔ اپنے لوگ بہت سارے رشتے داروں سے ملنے آئے ہوئے تھے جنگلے کے پیچھے سے ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بہت حوصلہ مند اور خوش نظر آتے تھے۔ میری گھبرائی ہوئی شکل دیکھ کر انھوں نے کہا تھا کہ یار کچھ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے یہ سب وقتی بات ہے تھوڑے دنوں میں ہی ایوب خان کا تختہ ہوجائے گا پھر ہم سب چھوٹ جائیں گے۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انھیں اپنے گھر والوں کی طرف سے تھوڑی فکر تھی۔ ان کے ابا جان کافی ناراض تھے۔ ناراض تو بڑے بھائی بھی تھے مگر انھوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

گرفتاری وقتی ثابت ہوئی تھی۔ تھوڑے دنوں میں ہی ایوب خان کو حکومت چھوڑنی پڑگئی تھی اور یحییٰ خان کا مارشل لا لگ گیا تھا۔ پورے ملک میں جیسے طوفان سا آگیا۔ خرم بھائی بھی جیل سے رہا ہوگئے تھے۔ میں ان سے ملا تھا وہ بڑے پرجوش تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اب الیکشن ہوں گے اور ملک بھر میں سوشلسٹوں کی فتح ہوگی، انصاف کا بول بالا ہوگا، مزدوروں کسانوں کی حکومت ہوگی، سرمایہ داری جاگیرداری کا خاتمہ ہوگا اور امریکا برطانیہ کی غلامی سے نجات مل جائے گی۔ ان کا خیال تھا آزادی کے باجود ہمارا ملک ابھی تک بڑی طاقتوں کی غلامی ہی کررہا ہے کبھی بھی اس ملک میں عوام کی حکومت نہیں آئی اور اب وہ خواب پورے ہونے والے ہیں۔

ملک میں سب کچھ ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کفر و اسلام کی جنگ چھڑ گئی ہے ایک طرف تین سوتیرہ عالموں کا فتویٰ تھا کہ سوشلزم کو ماننے والے کافر ہیں اور دوسری طرف مجیب الرحمٰن، بھاشانی، بھٹو، ولی خان کی سیاسی جماعتیں تھیں جو اسلامی سوشلزم کے نعرے لگا رہی تھیں۔ ملک میں ٹریڈ یونینوں کے جلسے ہورہے تھے۔ کسان کانفرنس کا انعقاد کیا جارہا تھا۔ ٹوبہ ٹیک کسان کانفرنس کا تو بڑا غلغلہ اٹھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے لوگ اب آزادی چھین لیں گے، انقلاب آجائے گا، صبح ہوجائے

گی۔ جدوجہد یا مصلحت، انتخاب یا انقلاب ہر طرح کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔

میں انجینئر بن کر نوکری تلاش کر رہا تھا۔ خرم بھائی سے مشکل ہی ملاقات ہوتی تھی کیوں کہ وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ اس وقت کا کراچی مجھے یاد ہے، ایک طرف لانڈھی اور سائٹ کے مزدوروں کا جلسہ ہوتا تھا۔ طلبہ مزدور اور کسان، مل کے بجائیں گے پاکستان کے نعرے لگ رہے تھے۔ کالجوں میں سوشلسٹوں اور اسلام پسند طلبہ میں زبردست انتخابی جنگ ہو رہی تھی۔ شہر بھر میں جماعت اسلامی کا غلبہ سا لگ رہا تھا۔ لوگ انتظار کر رہے تھے کہ جمہوریت آئے گی اور فوجی حکومت کا خاتمہ ہوگا۔ کراچی میں تو جماعت اسلامی جیتے گی مگر ملک بھر میں سوشلسٹ ہی جیتیں گے، پھر زمینیں کسانوں کو ملیں گی، فیکٹریاں مزدوروں کے لیے بھی کمائیں گی، یہ ذلتوں کے مارے لوگ پورے پاکستان میں اچھے دن بھی دیکھیں گے۔

پھر الیکشن ہوئے اور پاکستان ٹوٹ گیا، مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا، فوجی حکومت چلی گئی اور جمہوریت بھی آگئی تھی۔ بھٹو صاحب کی حکومت عوامی حکومت تو تھی مگر عوام کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا۔ مجھے پی آئی اے میں نوکری مل گئی تھی۔ نظام ڈاکٹر بن کر امریکا جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسلم کمیونسٹ پارٹی روس نواز کے ساتھ کام کر رہا تھا اور خرم بھائی کالج میں لیکچرار تو ہوگئے تھے مگر ترمیم پسندوں کے خلاف، جاگیرداروں کے خلاف، سرمایہ داروں کے خلاف، امریکا کے خلاف ان کی جنگ جاری تھی۔ ایک جنگ جو کبھی ختم نہیں ہوئی۔

ایک شام دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہی تھیں۔ انھوں نے تو نہیں بتایا تھا مگر ان کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ شاید وہ کسی خفیہ کمیونسٹ پارٹی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ مزدور، کسان، ہاری سب متحد ہو رہے ہیں۔ طلبہ بھی جاگ چکے ہیں۔ بھٹو حکومت کو ہمارے مطالبے ماننے ہوں گے اور باقی ساری ان ہی پرانے خوابوں کی باتیں تھیں۔

پھر یکایک وہ غائب ہوگئے۔ ملتان کے کالونی ٹیکسٹائل مل میں ہڑتال ہوئی تھی، لاہور میں ریلوے کے مزدور حق مانگ رہے تھے، پشاور میں کسانوں نے متحد ہونا شروع کردیا تھا اور بلوچستان کی پہاڑیوں میں گولیاں چل رہی تھیں۔ لانڈھی میں

مزدوروں نے بغاوت کردی تھی، سائٹ میں ہنگامہ ہوا تھا اور عوامی حکومت سبھوں کو دباتی چلی گئی تھی۔ اسی بے دردی کے ساتھ جو پچھلی حکومتوں کا وطیرہ رہا تھا، اسی بے رحمی کے ساتھ جس کی عوامی حکومت سے تو امید نہیں تھی۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ خرم بھائی بھی غائب ہوگئے؟ انڈر گراؤنڈ ہوگئے تھے وہ۔ کسی کو پتا نہیں تھا کہاں ہیں وہ، کیا کررہے ہیں؟ گھر والے بھی لاعلم تھے۔ اور نہ ہی انھوں نے کسی سے کوئی رابطہ کیا تھا۔

اخباروں سے پتا لگتا تھا کہ پولیس گرفتاریاں کررہی ہے۔ سندھ میں ہاری لیڈر گرفتار ہوئے تھے، لاہور میں مزدوروں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ خرم بھائی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ان کے گھر والوں نے بھی پریشان ہو ہو کر اب لن کے بارے میں فکر کرنا ترک کر دیا تھا۔ ایک طرح سے عاق کردیا تھا انھوں نے۔ وہ پڑھ لکھ کر بھی گھر والوں کے کسی کام نہیں آسکے تھے۔ گھر والوں کو ان کے کام آنے سے غرض نہیں تھی۔ وہ تو یہی چاہتے تھے کہ وہ بھی ایک عام زندگی گزاریں، ان کی بھی شادی ہو، ان کے بھی بچے ہوں، ان کا بھی گھر ہو، مگر خرم بھائی انقلابی تھے۔ ان کا سونا جاگنا، چلنا پھرنا سب کچھ انقلاب تھا۔

ایک رات وہ یکایک ہمارے گھر آئے تھے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ پولیس ان کے پیچھے ہے۔ وہ کراچی آئے تھے کسی میٹنگ کے سلسلے میں اور اب کراچی سے باہر جارہے تھے تو انھوں نے سوچا کہ مجھ سے ملتے چلیں۔ صبح کی ٹرین سے ان کو جانا تھا۔ وہ رات انھوں نے ہمارے گھر میں ہی بسر کی تھی۔ ہم دونوں رات گئے تک باتیں کرتے رہے تھے۔ میں نے انھیں اپنے بارے میں بتایا تھا۔ پی آئی اے کی نوکری کے بارے میں بتایا تھا۔ بتایا تھا کہ کس طرح سے وہاں پر لوٹ مار کا سلسلہ جاری ہے، کس بے دردی سے افسران مراعات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور کس طرح سے ایمپلائز، یونینوں نے لڑ لڑ کر ملازمین اور ادارے کو نقصان پہنچایا ہے۔ افسروں کو اپنی مراعات سے مطلب تھا اور ایمپلائز یونینوں کو ایمپلائز سے زیادہ ان سیاسی جماعتوں کی فکر تھی جن کے لیے وہ کام کرتے تھے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ پورے ملک کا یہی حال ہے، ہر کوئی صرف اپنا مفاد چاہتا ہے، ملک سے اور عوام سے کوئی غرض نہیں ہے ان کو۔ مجھے ڈر سا لگ رہا تھا کہ کس طرح سے یہ ملک چلے گا ہر چیز خرابی کی طرف جارہی ہے۔

وقت اور زمانے نے خرم بھائی کافی سنجیدہ بنا دیا تھا۔ ان کی آنکھوں کی چمک اپنی جگہ تھی مگر چہرہ بتا رہا تھا کہ وقت کے تھپیڑوں نے انھیں کافی زک پہنچائی ہے مگر وہ پراُمید تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک دفعہ جب عوامی جمہوری انقلاب آئے گا تو سب کچھ اچھا ہوجائے گا۔ موجودہ حکومت تو چلی ہی جائے گی مگر ساتھ ہی اچھا وقت بھی آئے گا مگر انھوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ روس کے حامی ترمیم پسند انقلابیوں نے انقلاب کو بھی نقصان پہنچایا ہے اور ان کی وجہ سے دنیا بھر میں سامراجی طاقتوں کو خوب فائدہ پہنچا ہے۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ سوشلسٹوں کے دونوں دھڑوں کی جنگ شدت اختیار کرتی جارہی ہے۔ خرم بھائی جیسا مخلص آدمی بھی اس جنگ میں ایک پارٹی بنا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ جس کمیونسٹ پارٹی کے لیے کام کررہے تھے اس کی طرف سے انھیں کچھ جیب خرچی بھی ملتی ہے اور وہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ تعلیمی اداروں میں ہونے والی سرگرمیوں کے انچارج تھے اور اپنی تمام تر ایمان داری اور اخلاص کے ساتھ اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ وہ کام جو کمیونسٹ پارٹی نے ان کے ذمے کیا تھا۔ ملک بھر کے طالب علموں کو منظم کرنے کا کام تاکہ وہ انقلاب کے لیے کام کرسکیں اور وہ اس کام میں خلوص دل کے ساتھ منہمک تھے۔

پھر وہ چلے گئے۔ بہت دنوں تک ملاقات نہیں ہوئی، شادی کی ایک تقریب میں ان کے بڑے بھائی کے منھ سے یہ سنا تھا کہ خرم کا کیا ہے اگر جیل میں نہیں ہوں گے تو کسی جگہ لیڈری کررہے ہوں گے۔ بڑی بددلی سے انھوں نے ان کا ذکر کیا تھا اور بڑی بے شرمی کے ساتھ سارے لوگ ہنس بھی دیے تھے۔ مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ اپنے کام میں مخلص تھے، بہت سے لوگوں سے زیادہ مخلص جو اس وقت وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ زیادہ تر لوگوں کے دو چہرے تھے دکھانے کا کچھ اور اندر سے کچھ اور، مجھے اندازہ تھا اس بات کا۔ مجھے نفرت سی ہوگئی تھی ان سب سے۔

اسی زمانے میں ملک بھر میں الیکشن ہوئے تھے اور الیکشن سے پہلے بہت سے لوگ گرفتار ہوگئے تھے۔ مجھے پتا لگا تھا کہ اس دفعہ خرم بھائی گرفتار ہوکر جیکب آباد کی جیل میں رکھے گئے ہیں۔ مجھے تو یہی پتا تھا کہ جیکب آباد اور سکھر جیل دونوں ہی بہت خوف ناک ہیں دونوں جگہوں پر بدترین سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ دونوں ہی جگہ پر

قیدیوں کی جسمانی انا کے ساتھ روحانی انا بھی ختم کردی جاتی ہے۔ میں دل ہی دل میں افسوس کے علاوہ اور کر بھی کیا کرسکتا تھا۔

عوامی حکومت بھی ایک اور فوجی حکومت کے آنے کا باعث بن گئی تھی۔ وہی مارشل لا اور وہی آمریت، نہ جانے کیا تھا ہمارے ملک کی قسمت میں۔

خرم بھائی بہت دنوں تک جیل میں ہی رہے تھے۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد تھوڑے دنوں تک کراچی میں رہے تھے پھر کچھ دنوں تک ان کی کوئی خبر نہیں آئی۔

نئی حکومت نے قوم سے کیے ہوئے ہر وعدے کو پامال کیا تھا۔ جماعت اسلامی سے مل کر حکومت کی باگ ڈور سنبھالی ہوئی تھی اور نہ جانے کیا کیا ہو رہا تھا۔ نظام نے امریکا سے خط لکھا تھا کہ جماعت اسلامی جس طرح سے فوجیوں کی بی ٹیم بن گئی ہے اس پر سوائے حیرت اور افسوس کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ کہاں کا اسلام؟ اور کیسی جمہوریت؟ جماعت اسلامی بھی مسلم لیگ ہی نکلی تھی۔ بھٹو نے داڑھی منڈوا کر، نہا دھو کر عزت کے ساتھ پھانسی کے پھندے کو پہن لیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے صرف اس بات پر ہی بھٹو کے بہت سے گناہوں کو معاف کردیا تھا۔ اس کے عوام نے اسے اپنے من میں بسایا تھا، عوام تو ایسے ہی ہوتے ہیں، ان کے معیار الگ ہوتے ہیں اور وہ چیزوں کو مختلف طرح سے دیکھتے ہیں۔

ایک بار پھر ملک میں تحریک چل رہی تھی ملک کو پھر خون کا، جانوں کا نذرانہ چاہیے تھا۔ پھر انھی دنوں مجھے پتا لگا تھا کہ خرم بھائی نے جمہوریت کی بحالی کے لیے گرفتاری دے دی ہے۔ ہر روز کچھ لوگ گرفتار ہو رہے تھے۔ گرفتاریاں بڑھتی گئی تھیں، لوگ مرتے رہے تھے، عوام کے گھروں پر ملٹری کے بوٹوں کی دھمک تھی، سندھ میں گاؤں جل رہے تھے اور رہنما عیش کررہے تھے۔ افغانستان میں بھی جنگ کا آغاز ہوچکا تھا۔ ایک ایسی جنگ جو نہ جانے کس کی تھی۔ ایک ایسا جہاد جس کا کوئی مقصد نہیں تھا، دو بڑے ہاتھیوں کی جنگ میں ہم لوگ اپنی مرضی سے پس رہے تھے اور اس کی قیمت چکانے کے لیے بھی عوام تھے، پاکستان کے اور افغانستان کے۔ وہاں سے مہاجر پاکستان آرہے تھے، اسلحہ عام ملنا شروع ہوگیا تھا، چرس ہیروئن بھی عام ملنی شروع ہوگئی تھی، سکون صرف سکون، نہیں تھا ہم لوگوں کی قسمت میں۔

خرم بھائی کی یہ گرفتاری سب سے زیادہ خوفناک ثابت ہوئی تھی۔ تشدد کی انتہا کردی گئی تھی۔ برف کے سلوں پر لٹایا گیا تھا، ناخنوں کو کھینچ لیا گیا تھا، راتوں کو جگایا گیا تھا۔ ہر رنگ کے سیاسی قیدیوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں گرفتاریوں کا سلسلہ بند ہوا ہی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ مارشل لا حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی جہاں بہت سارے سیاسی قیدی رہا ہوئے تھے تو خرم بھائی کو بھی رہائی نصیب ہوئی تھی۔

ان کے والد کا انتقال ان کی قید کے دنوں میں ہی ہوگیا تھا۔ ایک ماں تھیں جو ان کے آنے کا راستہ دیکھ رہی تھیں۔ بھائی بہن تو اپنے کاموں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ میری بھی ان سے ملاقات ہوئی تھی، آنکھوں کی وہی چمک تھی مگر مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ جسم ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ میں بہت دیر تک ان کے ساتھ بیٹھا رہا، سوچتا رہا کہ یہ جنگ وہ کب تک لڑیں گے؟ سوشلزم کی جنگ، ترمیم پسندوں سے جنگ، انقلاب کی جنگ، فوجیوں سے جنگ، سماج سے جنگ۔ عوام کی بھلائی کے لیے جنگ، وہ یہ جنگ لڑتے رہیں گے اور انقلابی ان کی جنگوں کا سودا کر کر کے اپنی زندگی کو بدلتے رہیں گے۔ میں سوچتا رہا، ان سے کہہ نہیں سکا۔ اس کے اصول الگ تھے اور میری سوچ مختلف۔ انھیں صرف دکھ ہی ہوتا۔

نظام امریکا میں خوب ڈالر بنا رہا تھا۔ اسلم بھی پیرس میں رہ رہا تھا اور بہت سارے سیاسی لوگ پاکستان کے علاوہ دنیا میں ہر جگہ رہ رہے تھے۔ جو پاکستان میں تھے انھوں نے بھی اپنی اپنی قیمت وصول کرلی تھی۔ دائیں بازو کے ہر فرقے کے لوگوں نے، بائیں بازو کے ہر دھڑے نے۔ ان کے پاس اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ ان کی ایمان داری ان کے ساتھ تھی۔ وہ ابھی تک ایسے ہی تھے، کراچی یونی ورسٹی کے خرم بھائی۔

مجھے اندازہ تھا کہ ان کی کمیونسٹ پارٹی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوچکی ہے۔ پھر کچھ اور لوگ ٹوٹ کر الگ ہو کر اپنی ایک اور پارٹی بنا چکے ہیں۔ انھوں نے مجھے کچھ بتایا نہیں تھا مگر مجھے پی آئی اے میں ہونے والی سرگرمیوں سے اندازہ ہوجاتا تھا کہ کون کہاں پر کس طرح سے کیا کر رہا ہے؟ کمیونسٹ پارٹی کی ٹوٹ پھوٹ نیچے تک

جاتی تھی، طالب علموں سے لے کر مزدور یونین اور ایمپلائز یونین تک، جہاں بھی جو ہوتا تھا، وفاداری توڑتا تھا۔

وہ پھر غائب ہوگئے تھے کبھی پتا لگتا تھا کہ وہ ملتان میں ہیں، کبھی لاہور میں تو کبھی کوئٹہ میں ہیں۔ ان کی وہی مصروفیت تھی۔ ان کی وہی قربانی تھی مگر بدل کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ صرف چہرے بدل رہے تھے، بار بار کبھی ایک چہرہ، کبھی دوسرا چہرہ۔ ظلم و جبر کے راج کو بدلو...... چہرے نہیں سماج کو بدلو والا نعرہ کسی دیوار پر تو لکھا ہوا تھا مگر ہماری قسمتوں میں نہیں تھا... میں نے بھی سنجیدگی سے سوچنا شروع کردیا تھا کہ اب پاکستان چھوڑ دینا چاہیے۔ پھر یکایک مجھے خبر ملی تھی کہ خرم بھائی کراچی کے سول ہسپتال میں داخل ہیں اور شدید بیمار ہیں۔

میں انھیں دیکھنے گیا تھا۔ وہ شدید بیمار تھے۔ بہت دنوں کے بعد دیکھا تھا ان کو میں نے۔ جسم بہت دُبلا پتلا ہوگیا تھا۔ دھنسی ہوئی آنکھیں اور چوڑی پیشانی صرف یہی نظر آتا تھا۔ مجھے پتا لگا تھا کہ انھیں دماغ اور ریڑھ کی ہڈی کا ٹی بی ہوگیا ہے۔ بہت قیمتی دوائیں دی جارہی تھیں ان کو مگر مجھے دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ اب وہ بچنے والے نہیں ہیں۔ ان کی زندگی کے دن پورے ہوگئے ہیں۔ انھوں نے میری آواز سن کر آنکھیں کھولی تھیں مجھے غور سے دیکھا تھا اور میرے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔ بہت دیر تک تھامے رہنے کے بعد پھر آہستہ آہستہ بولے تھے، یاد ہے اب تک مجھے انھوں نے کیا کہا تھا اپنے جسم کے بارے میں، مرنے کے بعد اسے اناٹومی میوزیم میں کاٹ کاٹ کر شیشے کے جار میں رکھوا دینا۔ میں نے ڈاکٹر کو بھی کہا ہے اور ایک وصیت بھی کردی ہے، وہ شاید آخری دفعہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے تھے، ''آخر کب تک موہنی، کرشن، جان ولیم کی ہی لاشوں پر طلبہ پڑھیں گے ایک میراثھی کا جسم بھی تو ہے۔'' ایک سفید لفافہ ان کے سرہانے رکھا ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں میں یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا مجھ پر بھروسا تھا کہ میں ان کے کہنے پر عمل کراؤں گا، ایک مرنے والے کی آرزو تھی کہ ان کا کہا پورا کیا جائے گا، میں نے سوچا تھا کہ اس اعتماد کو میں برباد نہیں ہونے دوں گا۔

ہم ہسپتال آتے جاتے رہے، دوائیں لاتے رہے تھے، جو ممکن تھا وہ کر رہے

تھے کہ وہ یکایک مر گئے۔ ٹی بی نے ان کے جسم کے خلیوں کو اندر سے چاٹ لیا تھا۔ ایک دن جسم دھڑام سے گر گیا۔

مجھے ان کے مرنے کا افسوس نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس بیماری کی تکلیف سے ان کا مر جانا ہی اچھا تھا۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ ان کی خواہش پر کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ میں آخر تک ان کے بھائی سے التجا کرتا رہا کہ ان کی وصیت کے مطابق ان کی لاش ڈاؤ میڈیکل کالج کے اناٹومی میوزیم کو دی جانی چاہیے تاکہ اس کا speciemen بنا کر وہاں اناٹومی میوزیم میں شیشوں کے جار میں رکھ دیا جائے اور میڈیکل کے طالب علم اس سے اپنی پڑھائی کریں۔ مگر کسی نے نہیں سنا تھا بلکہ مجھے سختی سے کہہ دیا گیا تھا کہ میں وارثوں میں نہیں ہوں، لہٰذا مجھے بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وصیت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وارث وہی کریں گے جو وہ مناسب سمجھیں گے۔ مجھے زیادہ بولنے بلکہ بولنے کی ہی کوئی ضرورت نہیں ہے، میں رشتہ دار تھا، وارث نہیں تھا۔

وارث انھیں، ان کی مرضی کے خلاف ہسپتال سے گھر لائے، مردہ جسم کو نہلایا گیا، جنازہ اٹھایا گیا، قبرستان میں لے جا کر منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا۔ وارثوں کا اپنا بنایا ہوا فرض پورا ہوگیا تھا۔ آہستہ آہستہ مٹی پھینکی جا رہی تھی۔ زندگی ایک بار پھر موت سے ہار گئی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ کیا بگڑ جاتا اگر ان کی بات مان لی جاتی؟ یہ کیسے لوگ ہیں؟ زندہ آدمی اگر مختلف ہو تو اس کے جسم کو چور چور کر دیتے ہیں اور اگر مردہ ہوجائے تو بھی اس کی خواہش پوری نہیں کرتے ہیں۔ کب کریں گے عزت ہم لوگ مرنے والوں کی، اپنے پیاروں کی۔ زندگی میں تو حق دیتے نہیں ہیں، نہ بولنے کا حق، نہ مانگنے کا حق، نہ عزت سے زندہ رہنے کا حق، نہ اپنی مرضی سے جینے کا حق اور جب آدمی مرجاتا ہے، لکھ کر جاتا ہے کہ اس کے جسم کے ساتھ کیا کیا جائے تو وہ وارث جنھیں سب سے زیادہ احترام کرنا چاہیے، وہی اس وصیت کی دھجیاں بکھیر دیتے ہیں، ہم مردہ جسم کا احترام نہیں کرسکتے تو زندہ لوگوں کا کیا احترام کریں گے؟

وارث نہ جانے کیا دعا مانگ رہے تھے مگر میرے کانوں میں آواز گونج رہی تھی۔

مرغ گویم
باہر نکلم
چیل جھپٹم
جان کھویم
مرغ گویم مرغ گویم مرغ گویم...

□

شاید کوئی نہیں!

اتنی شان دار عورتیں میں نے کم ہی دیکھی ہیں۔ پینتالیس سے زیادہ ہی عمر ہوگی اُن کی۔ اچھی سی خوب صورت ساڑھی میں بہت ہی خوب صورت انداز سے لپٹی لپٹائی بیٹھی تھیں وہ۔نہ بازو کھلے ہوئے اور نہ کسے ہوئے بلاؤز میں سے گوشت تھل تھل کر کے لٹک رہا تھا۔ چہرہ اتنا سادہ تھا کہ نگاہیں بار بار جا کر چہرے پر رُک جاتی تھیں... اور گہری سیاہ آنکھوں میں روشنی اس طرح سے ٹمٹمارہی تھی جیسے بغیر چاند کی گہری سیاہ راتوں میں ستارے ٹمٹماتے ہیں۔وہ اکیلے ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔

ایک دن پہلے میں نے انھیں بنگلہ دیش کے گروپ کے ساتھ دیکھا تھا۔ گروپ میں چھ خواتین تھیں اور پورے گروپ میں وہ سب سے نمایاں تھیں۔ بنگالیوں کی طرح سے ساڑھی باندھے ہوئے، بنگالیوں کی طرح سے بنگالی بولتے ہوئے، بنگالیوں کی طرح پیار سے مگر تیز تیز بولتے ہوئے... مگر سارے بنگالیوں سے مختلف کچھ تھا ان میں۔ ہال کے کونے میں بیٹھی ہوئی وہ ناشتا کر رہی تھیں اور مجھے ایسا لگا جیسے پورے حال پر اُن کا سحر چل گیا ہے۔ بنگال کا مشہور سحر... کالا جادو۔

میں نے اپنا ناشتا لیا اور سیدھا اُن کی ٹیبل کی طرف چلا گیا تھا۔ ''ایکسکیوز می، کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' میں نے انگلش میں پوچھا۔

''اوشیور۔'' انھوں نے مسکراتے ہوئے انگلش میں ہی جواب دیا تھا۔

میرے بیٹھنے کے ساتھ ہی بنگلہ دیش کے گروپ کے دو اور لوگ بھی آ گئے تھے اور ہم لوگ گزشتہ دن کی کارروائی پر بات چیت میں مشغول ہوگئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں سری لنکا اور انڈونیشیا کے لوگ بھی ہماری باتوں میں شامل ہوگئے۔

یہ میٹنگ بنکاک میں ہورہی تھی۔ ایشین ڈویلپمنٹ بینک کی جانب سے اس میٹنگ کا اہتمام کیا گیا تھا اور ایشیا کے ترقی پذیر ممالک کے لوگ یہاں جمع ہوکر بچوں کی مزدوری، بچوں کے استحصال اور بچوں سے ہونے والی زیادتیوں پر بات چیت کررہے تھے۔ پاکستان سے بھی بہت سارے لوگ آئے تھے۔ حکومت پاکستان کی نمائندگی کے لیے اسلام آباد سے دو قومی اسمبلی کے ممبر اور وزارت محنت کے ایک افسر موجود تھے جب کہ مجھے کراچی میں بچوں کی بہبود کے لیے کام کرنے والی ایک تنظیم نے بھیجا تھا۔ چار دن کی میٹنگ بنکاک کے ایک بڑے ہوٹل میں ہورہی تھی اور بچوں کی محنت اور بچوں سے لی جانے والی بیگار سے متعلق اور ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے بارے میں ایک لائحۂ عمل طے کرنا تھا۔ اُن بچوں کے بارے میں بات کرنی تھی جو بچے ہونے کے باوجود بچے نہیں رہتے ہیں، جن کے بچپن میں ہی جوانی اور بڑھاپا شروع ہوجاتا ہے، جو اسکولوں، مدرسوں میں نہیں جاتے ہیں، جو کھیت کھلیانوں میں کھیلتے نہیں ہیں، جو کھیل کے میدانوں میں دوڑتے بھاگتے نہیں۔ جنھیں نہ تتلیوں کا پتا ہوتا ہے، جو نہ ہی پتنگ، گلی ڈنڈا، کرکٹ اور ہاکی سے آشنا ہوتے ہیں۔ انھوں نے کیرم بورڈ، ڈرافٹ، اسکریبل نہیں دیکھا ہوتا۔ انھیں نہ کمپیوٹر کے کھیلوں کا پتا ہوتا ہے اور وہ نہ جدید بچوں کی طرح رات گئے تک کمپیوٹر پر چیٹ کر رہے ہوتے ہیں۔ انھیں صبح اُٹھنا ہوتا ہے، کام پر جانا ہوتا ہے، مزدوری کرنی ہوتی ہے اور جب شام کو وہ گھر آتے ہیں تو ان کی وجہ سے ان کے گھروں کے چولھوں میں آگ جلتی ہے۔ یہ وہ بچے ہوتے ہیں جنھیں محنت مشقت کے باوجود ان کی محنت سے کم معاوضہ ملتا ہے نہ جانے کتنوں کی محنت کا استحصال ہوتا ہے اور نہ جانے کتنے جسمانی اور جنسی ہوس کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ ہمارے سارک ملکوں کے بچوں کی قسمت پر ماتم کرنے کے لیے یہ اجلاس بلایا گیا تھا۔

ایشین ڈویلپمنٹ بینک نے جہاں حکومتوں کے نمائندوں کو بلایا تھا وہاں

حکومت کے باہر کے لوگوں کو بھی دعوت دی تھی۔ میں بڑی تیاری سے اس میٹنگ میں شرکت کرنے آیا تھا۔

میٹنگ کے پہلے دن حاضری ہونے کے بعد ہر ایک نے اپنا تعارف کرایا تھا۔ پھر اجلاس کے اغرض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی تھی اور بینک کے نمائندے نے یہ بتایا تھا کہ ایشین بینک ایشیا میں بچوں کے استحصال کا مکمل خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ بینک کا یہ نمائندہ انڈونیشیا کا رحمٰن بولکابا تھا جس نے بڑی جذباتی تقریر کی اور ایشیا میں بچوں کی صورت حال کی بڑی دردناک تصویر پیش کی تھی۔ میں سوچتا رہا تھا کہ اس قدر اچھی باتوں اور نیتوں کے باوجود ایسا کیوں ہے کہ ہمارے ملکوں کے بچے نہ اسکول جا سکتے ہیں، نہ ان کے پیروں میں چپل ہے اور نہ بدن پر کپڑا ہے۔ وہ سڑکوں پر بھیک مانگتے ہیں اور جب بچے ہی ہوتے ہیں تو اپنی معصومیت کو قربان کر کے محنت مزدوری میں لگ جاتے ہیں۔

میں نے سوچا تھا کہ اس کانفرنس کا ضرور کوئی نتیجہ نکلے گا۔ پاکستان کے وفد میں ایک قومی اسمبلی کے ممبر پنجاب سے تھے اور دوسرے کا تعلق سندھ سے تھا۔ صبح کی چائے کے بعد یہ دونوں حضرات غائب ہوگئے تھے، لاؤنج میں یا ریسٹورنٹ میں تو میں نے انھیں خال خال دیکھا تھا مگر میٹنگ میں شرکت کا فرض وزارت محنت کے افسران ادا کررہے تھے۔ میں غیرسرکاری حیثیت سے موجود تھا، میں نے ان افسران سے پوچھا بھی تھا کہ عوام کے دونوں نمائندے اجلاس میں کیوں نہیں ہیں تو انھوں نے مسکرا کر جواب دیا تھا، ''بھائی! یہ بنکاک ہے یہاں کی طوائفوں کے بارے میں آپ کو کچھ پتا نہیں ہے کیا؟''

میں بھی درد بھری ہنسی ہنس دیا تھا۔ پاکستان کے بچوں کا مستقبل یہاں کی طوائفوں کے مستقبل سے بھی زیادہ تاریک ہے۔ ان طوائفوں کے لیے ہمارے ملک کا زرمبادلہ ہے، جن کے پاس ہمارے رہنما اپنی ہوس کی آگ بجھا رہے ہیں اور ہمارے بچے اپنی آگ میں جل رہے ہیں۔ یہ سوچ سوچ کر بہت دیر تک میں پریشان رہا تھا۔

آج کی میٹنگ میں پہلے بھارت والوں نے اپنے ملک کے حالات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ وہاں بچوں کی کیا صورت حال ہے۔ حکومت کے نمائندے کے مطابق

صورت حال کافی بہتر ہو رہی تھی اور حکومت اس معاملے میں کافی سنجیدہ تھی۔ مگر بمبئی کے راجیش پراوان نے بتایا کہ حکومت کے دعوؤں کے باوجود صورت حال بڑی خوف ناک ہے، ہر شہر میں بچے کام کررہے ہیں، گاؤں دیہاتوں میں بچوں کو کھیت کھلیانوں میں کام کرنا پڑتا ہے اور بڑے شہر جیسے دہلی، کلکتہ، بمبئی میں بچوں کا منظم جنسی استحصال ہوتا ہے۔ وہ فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں، ان کے لیے کوئی قانون نہیں ہے اور بچے جب بچے ہی ہوتے ہیں تو ساتھ ہی بڑے بھی ہوجاتے ہیں۔ حکمرانوں کے پاس ان کے لیے وقت ہے اور نہ ہی رقم۔ ہندوستانی حکومت کے نمائندے رنجن گوئل نے راجیش کو بڑے غصے سے دیکھا تھا جب راجیش نے کہا تھا کہ پنڈت نہرو کا حقیقی بھارت اور اندرا گاندھی کا ایٹمی انڈیا بھوکے اور جاہل بچوں کا بھارت ہے۔ اس کی تقریر کافی جذباتی تھی اور حقیقت پسندانہ بھی۔

بھارت کے بعد نیپال والوں نے نیپال کے حالات پر روشنی ڈالی تھی۔ وہاں کی صورت حال بھی کافی دکھ بھری اور خراب تھی۔ نیپال کی کملا پانڈے نے بتایا کہ ابھی تک آٹھ اور نو سال کے بچوں کی شادی ہوتی ہے اور بچے بچے ہی ہوتے ہیں جب بچوں کے ماں باپ بننا شروع کر دیتے ہیں۔ حیرت اس پر ہوئی حکومت اور غیر سرکاری نمائندوں نے مل کر ایک ہی بات کی تھی۔

پاکستان کی باری تھی، میری امید کے مطابق وزارت محنت کے افسر حامد کھوسہ صاحب نے یہی بتایا کہ پاکستان کے حالات اتنے برے نہیں ہیں۔ بچوں کے کام کو عنقریب ختم کر دیا جائے گا۔ ہر کارخانے میں اسکول کھولے جارہے ہیں، بچوں کی تعلیم لازمی کر دی گئی ہے۔ اور جہاں تک بچوں کے جنسی استحصال کا تعلق ہے تو وہ پاکستان میں بالکل بھی نہیں ہے۔ ہمارا ملک اسلامی ہے اور اسلامی ملک میں یہ بیہودگی نہیں ہوتی ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔

اپنی باری آنے پر میں نے پہلے مشتاق گندر کی بنائی ہوئی فلم دکھائی تھی جس میں کراچی کے ان بچوں کو دکھایا گیا تھا جو راتوں کو سڑکوں پر پھول کے ہار بیچتے ہیں۔ پھر میرے پاس بتانے کو بہت کچھ تھا، سیاسی لٹیروں اور بددیانت افسروں کے بارے میں... جہاں جو ایٹم بم تو بن چکا تھا مگر جہاں کے ننھے منھے بچوں کے ہاتھوں میں گدائی

کا کاسہ تھا، جو محنت فروشی بھی کرتے ہیں اور جسم فروشی بھی کرتے ہیں، جہاں غربت کے مارے والدین اپنے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے فروخت کر دیتے ہیں جو دبئی، بحرین، شارجہ اور ابوظہبی کے شیخوں کے اونٹوں کے دوڑ میں زبردستی دوڑائے جاتے ہیں۔ میں نے کہا تھا پاکستان میں حکومت خواہ کسی کی ہو، ان کا مقصد عوام کو لوٹنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ میں نے بتایا تھا کہ لاہور میں ایک وحشی جاوید اقبال نے سو سے زائد بچوں اغوا کر کے جنسی طور پر پامال کیا پھر ان کو ذبح کرکے ان کے جسم کے ٹکڑوں کو تیزاب میں ڈال دیا۔ میں نے بتایا کہ کراچی میں ایک بچے سے جنسی زیادتی کے بعد مال دار ملزموں نے اس کی آنکھیں پھوڑ دیں تاکہ وہ ملزموں کو پہچان نہ سکے۔ میں نے اخبار کی خبر دکھائی کہ کراچی میں کس طرح ایک بچے کو انگوٹھی چوری کرنے کے الزام میں مالکان نے قتل کرکے لاش سمندر میں پھینک دی۔ میں نے تصویریں دکھائیں کہ صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ اور پنجاب کے شہروں میں، کوڑے کے ڈھیر پر چھ چھ سات سات سال کے بچے کچرا جمع کرنے کے بیگار میں لگے ہوئے ہیں۔ میرے پاس جو کچھ بھی تھا وہ میں نے بغیر جھجک اور ڈر کے اجلاس کے سامعین کے سامنے پیش کر دیا۔

سبھوں نے بھرپور تالیاں بجا کر مجھے داد دی تھی مگر وہ اٹھ کر میرے پاس آ گئی تھیں۔ ''بہت اچھا بولے آپ، بالکل یہی حال بنگلہ دیش کا بھی ہے۔'' بڑی صاف اردو میں انھوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

میں نے شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی مجھے بڑی خوش گوار سی حیرت ہوئی کہ انھیں اردو بھی آتی ہے۔ میں نے سوچا بعد میں ان سے بات کروں گا۔ میں نے اچٹتی ہوئی نظر ڈالی تھی ان کے بیج کے اوپر۔ مہرالنسا بدرالدین نام تھا ان کا۔ میرے بعد سری لنکا کے نمائندے سری لنکا میں بچوں کے حالات کے بارے میں بتا رہے تھے۔

عجیب بات تھی ان تمام ملکوں کے حالات تقریباً ایک جیسے تھے۔ بچے جو ہمارا مستقبل ہوتے ہیں جن پر آئندہ کا دار و مدار ہوتا ہے اگر ان کو زندگی کچھ نہیں دے گی، اگر ان کا حال ایسا ہوگا تو مستقبل اپنے دامن میں کیا لے کر آئے گا۔ دنیا اتنی کٹھور کیوں ہے؟ یہ لوگ سمجھتے کیوں نہیں، اتنی سادہ سی بات، اتنا سیدھا سا حساب؟ میں سوچ سوچ کر رہ گیا۔

شام کو تھائی لینڈ کی وزارت محنت کی جانب سے ایک پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔چھوٹی موٹی تقریروں کے بعد کھانا پینا ہوا تھا وہاں پر بھی مجھے مہرالنسا بدرالدین سے ذرا تفصیلی ملاقات کا موقع مل گیا تھا۔

''ارے، آپ تو بہت ہی اچھی اردو بولتی ہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ مجھے پتا تھا کہ سابقہ پاکستان میں مشرقی پاکستان کے بہت سارے لوگ کام کرتے تھے، یہ بھی اپنے والدین یا شوہر کے ساتھ وہاں رہی ہوں گی، میں نے اندازہ لگایا تھا کہ شاید اسی وجہ سے ان کی اردو اتنی اچھی ہے۔

وہ ہنس دی تھیں۔ ''آپ کا تعلق شاید کراچی سے ہے؟'' انھوں نے پوچھا تھا۔

''جی! میں کراچی کا ہی ہوں۔'' میں نے جواب دیا تھا۔

''میں نے سنا ہے بہت برا حال ہوگیا ہے کراچی کا۔'' انھوں نے سنجیدگی سے دوسرا سوال کیا تھا۔

حال تو برا ہی ہوگیا تھا ، میں نے انھیں کراچی کی صورت حال پر ایک لمبی چوڑی تقریر سنا ڈالی تھی پھر یہ بھی کہا کہ بڑے شہروں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

''ضروری تو نہیں ہے کہ بڑے شہروں میں ایسا ہی ہو۔'' انھوں نے حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دہلی، بومبے، نیویارک، لندن سے بڑا تو نہیں ہے کراچی۔''

بات وہ صحیح کر رہی تھیں۔ مجھے ان سے اختلاف کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

''آپ کہاں رہتی تھیں کراچی میں؟'' میں نے ان سے پوچھا تھا۔

''کلفٹن میں رہتے تھے ہم لوگ۔'' ان کی بڑی سیاہ رات جیسی گہری آنکھوں میں گہری اداسی کی جیسے ایک لہر سی آ کر گزر گئی۔ انھوں نے رک رک کر پوچھا تھا، ''آپ کہاں رہتے ہیں وہاں؟''

''میں تو ناظم آباد میں رہتا ہوں، ناظم آباد نمبر چار میں، آپ نے سنا ہوگا۔'' میں نے جواب دیا تھا۔

''ہاں سنا تو ضرور ہے، لیکن وہاں جانا کبھی نہیں ہوا تھا۔ چلو چلتے ہیں۔'' انھوں نے بے تکلفی سے کہا تھا پھر اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ''کل بڑا ضروری ورکشاپ ہے۔ اس کی تیاری کرنی ہوگی۔'' عجیب قسم کی دھیمی سی مسکراہٹ تھی ان کی۔ بنگال کی

ساڑھی میں لپٹی لپٹائی مجھے وہ ہندو دیومالا کی کسی کہانی کا ایک کردار سا لگیں۔ کچھ تھا ان کے چہرے پر، دوسرے بنگالیوں سے مختلف۔ مجھے لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہیں لیکن کہہ نہیں پائی ہیں۔ ہم لوگ اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے تھے۔

دوسرا دن بھی بہت مصروف تھا۔ ہم لوگوں کو مختلف گروپوں میں بانٹ دیا گیا بچوں کے مسائل سے متعلق ہم لوگوں کو تمام ملکوں کے لیے بنیادی سفارشات بنانی تھیں۔ یہ سفارشات ایشین ڈویلپمنٹ بینک کو ان ممالک کو کوئی بھی قرض دینے سے پہلے دینا تھیں اور قرض اسی وقت جاری ہونا تھا جب حکومتیں ان سفارشات پر دستخط کرکے عمل درآمد کی حامی بھریں۔ بہت مصروف دن کے بعد ہم لوگ بہت تھک گئے تھے۔ شکر ہے کہ دوسرا دن کسی کام کے لیے مخصوص نہیں کیا گیا تھا بلکہ آرام کا دن تھا اور شاپنگ کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

دوسرے روز دن بھر شہر میں گھومنے گھامنے کے بعد جب میں ہوٹل پہنچا تھا تو لابی میں مہرالنسا بدرالدین سے ملاقات ہوگئی تھی۔

''ارے! مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے، کہاں جارہے ہو۔'' انھوں نے کہا۔

''کچھ خریداری کرکے واپس آیا ہوں اور کمرے کی طرف جارہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کہیے کیا بات ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''جاؤ فریش ہوکے آجاؤ، ساتھ ہی چائے پیتے ہیں۔'' میں تمھارا انتظار کرتی ہوں، انھوں نے جواب دیا۔

میں ہاتھ منھ دھوکر واپس آیا تو وہ ہوٹل کے ڈیپ گرین ریسٹورنٹ کے ایک کونے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھیں۔

انھوں نے مسکرا کر مجھے دیکھا، وہ مجھے ایک دفعہ پھر بہت ہی حسین لگی تھیں۔ بہت ہی خوب صورت ساڑھی تھی ان کی اور ان کے خوب صورت چہرے پر اس کی چمک پڑنے سے چہرہ مزید حسین لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا یہ اب اتنی خوب صورت ہیں جوانی میں کتنی حسین ہوں گی اور کیا کیا نہ قیامت ڈھائی ہوگی انھوں نے، مجھ سے رہا نہیں گیا تھا اور بے اختیار میں نے کہہ دیا تھا کہ بہت ہی حسین لگ رہی ہیں آپ۔

وہ مسکرا دی تھیں۔ ایک رنگ سا چہرے پر آیا اور چلا گیا۔ ''اپنے حسن کی

تعریف سننے کے لیے میں نے تمھیں یہاں نہیں بلایا ہے،'' انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بولو کچھ پیو گے یا کچھ کھاؤ گے؟''

''نہیں گرم گرم چائے اور بنکاک کا سموسہ منگوالیں، کافی ہوگا۔ کہیے میں کیا کام آسکتا ہوں آپ کے۔''

وہ تھوڑی دیر خاموش رہیں پھر بولیں، ''آج دن بھر بازار میں گھومتی رہی اور دو چیزیں خریدی ہیں اور یہ دونوں چیزیں تم میری بہن کو دینا۔ اسے تمھیں تلاش کرنا پڑے گا۔ وہ سانگھڑ میں رہتی ہے، بہت مشہور آدمی کی بیوی ہے مگر ایک مسئلہ ہے۔ اس کے شوہر کو بالکل پتا نہیں چلنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی تھیں۔

میں بھی خاموشی سے ان کو دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں۔ میں کچھ کہنے کی کوشش ہی کررہا تھا کہ وہ پھر سے بولیں، ''حیرت سے مت دیکھو، میں تمھیں سمجھاتی ہوں، تمھارے سوال پڑھ لیے ہیں میں نے۔ کہو کروگے یہ میرا چھوٹا سا کام؟''

''ضرور کروں گا اگر کرسکا تو۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ آپ کی بہن وہاں کیوں ہے؟ آپ یہاں کیوں ہیں اور اگر کچھ بھیجنا بھی ہے تو ان کے شوہر سے چھپانے کی کیا بات ہے؟ میں ضرور مدد کرنے کی کوشش کروں گا بلکہ میں ضرور آپ کی مدد کروں گا مجھے بتائیں تو سہی مسئلہ کیا ہے؟'' میں حیران سا ہو کر کئی سوال کر بیٹھا تھا۔

وہ تھوڑی دیر خاموش سوچتی رہی تھیں، جیسے سوچ رہی ہوں کہ کہاں سے شروع کرنا ہے پھر آہستہ سے بولی تھیں:

''یہ پرانی بات ہے تقریباً بیس بائیس سال پرانی بات۔ میں نے کراچی کے ڈاؤ میڈیکل کالج سے نیا نیا ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا تھا اور انتظار میں تھی کہ شادی کے بعد شاید حیدرآباد میں رہنا پڑے گا کیوں کہ میرے ہونے والے شوہر کی زمین حیدرآباد کے علاقے میں تھی۔ میرا خیال تھا کہ حیدرآباد میں رہوں گی اور حیدرآباد کے سول ہسپتال میں ہی کام کروں گی۔ شادی تو میری کالج کے زمانے میں ہی ہونے والی تھی مگر میرے سسرال والوں کی طرف سے دیر ہورہی تھی۔ وہ تو مجھے بعد میں پتا لگا تھا کہ صفدر

حیدرآباد کی کسی طوائف کو بھی اپنی ایک حویلی میں لے آئے تھے اور مجھے بھی وداع کرا کر لے جانا چاہتے تھے مگر ان کے خاندان میں شاید اس وجہ سے کوئی مسئلہ ہوا تھا جس کی وجہ سے دیر ہو رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میرے خاندان والوں کو اس بات کا پتا نہیں تھا۔ لیکن یہ بات غلط تھی، انھیں سب کچھ پتا تھا مگر سب کچھ قابل قبول تھا۔ مرد تو ایسا کرتے ہیں، مردوں کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ یہ مجھے بہت بعد میں پتا لگا تھا کہ جاگیرداروں کے اصول الگ ہوتے ہیں، ان کے گھروں میں مرد اور عورت کے درمیان بڑا فرق ہوتا ہے۔ وڈیرا سب کچھ کرسکتا ہے، مگر وڈیرے کی بہن کو وہی کرنا ہوتا ہے جس میں خاندان کی عزت ہوتی ہے۔ وڈیرے کی بیٹی کے لیے الگ قانون ہوتا ہے اور وڈیرے کے بیٹے کے رہنے کے قاعدے الگ ہوتے ہیں۔ ایک عورت ہے، ایک مرد۔ عورت کا کام ہے کہ عزتوں کی حفاظت کرتی رہے، مرد عزتوں کی پامالی میں لگے رہیں۔ آکسفورڈ اور ہارورڈ بھی اس نظام کو نہیں بدل سکتے ہیں۔

میں کچھ نہ جانتے ہوئے صرف انتظار میں تھی کہ یکایک ناصر بیچ میں آ گیا۔ ناصر میری کلاس فیلو زرینہ کا بھائی تھا۔ پاکستان ایئرفورس میں پائلٹ۔ پینسٹھ کی جنگ میں خوب بمباری کی تھی اس نے ہندوستان پر۔ خوب انعامات دیے گئے تھے اسے۔ وہ لوگ سب کراچی میں ہی رہتے تھے۔ میں ہاؤس جاب کررہی تھی اور ایک دن زرینہ کے ساتھ اس کے گھر جانا ہوگیا تھا۔ وہیں ناصر نے دیکھ لیا تھا مجھے۔"

وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہوگئی تھیں۔ پھر دھیرے سے مسکرائی تھیں۔ "تم صبح کہہ رہے تھے میں بہت خوب صورت تھی۔ سندھو دریا کا پانی اور سندھ دھرتی کی مٹی میں بڑی خوب صورتی ہے۔ وہاں کی لڑکیوں کو تم نے دیکھا ہوگا، موہنجوڈرو کی ناچتی سمبارہ سے لے کر آج کی اس مہرالنسا تک سب ہی خوب صورت ہوتی ہیں۔ ان کا صدیوں پرانا حسن برقرار ہے۔ شہر کھنڈر بن گئے مگر سندھ کی مٹی کا جادو جیسا پہلے تھا ویسا ہی اب بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پانچ ہزار سال پہلے شاید وہ آزاد تھیں اور اب کی یہ لڑکیاں غلام ہیں۔"

میں چھن سے رہ گیا تھا "تو آپ سندھی ہیں؛" میں نے بڑبڑا کر کہا تھا۔ "میں پہلے دن سے سوچ رہا تھا کہ آپ مختلف ہیں، بنگال کی ان لڑکیوں سے بہت

مختلف ہیں۔" بہت فرق ہے آپ میں اور آپ کے گروپ کی دوسری بنگالی عورتوں میں۔ اب میری سمجھ میں آیا تھا کہ بنگال کی اس ساڑھی میں سندھ کا جادو کیوں جگمگا رہا تھا۔

"جب زرینہ نے مجھ سے پوچھا تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا، یہ کیسے ممکن ہے؟ میری تو منگنی ایک وڈیرے سے ہوئی ہے۔ بڑا ہنگامہ ہوجائے گا۔ نہیں یہ ناممکن ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اس دن کے بعد جب بھی میں نے ناصر کو دیکھا مجھے وہ اچھا لگا۔ لانبا قد، مٹی کے رنگ جیسا اس کا رنگ اور ایئرفورس کے کالے چشمے کے پیچھے چھوٹی چھوٹی چبھ جانے والی سیاہ آنکھیں۔

میرے ابو بہت پہلے مر چکے تھے زمیں داری اور سرداری میرے چچا کے پاس تھی میں نے سنا ہے ابھی تک وہی سردار ہیں۔ بہت رعب داب ہے ان کا اور ان کی وجہ سے میں نہیں چاہتی ہوں کہ میری بہن کے شوہر کو پتا لگے کہ میں زندہ ہوں اور یہاں ہوں۔ وڈیرہ شاہی کے اصولوں کے مطابق میں نے بڑا گناہ کیا ہے۔ اس سے بڑا گناہ کیا ہو سکتا ہے کہ اس نظام کو ہلانے کی کوشش کی ہے جو صدیوں پرانا ہے۔ وہ عورت بننا چاہا ہے جو خود بھی فیصلے کر سکتی ہے۔ اس نظام میں سب کچھ قابل قبول ہے مگر لڑکی یا عورت فیصلے نہیں کرسکتی ہے، فیصلہ صرف سردار کا ہوگا۔ اس کا فیصلہ اٹل ہے، وہی قانون ہے اور وہی مذہب۔"

کہانی بہت دلچسپ اور سنجیدہ ہوگئی تھی۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا، پاکستان سے باہر میری ملاقات کسی ایسی سندھی عورت سے ہوجائے گی جو اس طرح سے مجھ پر اپنے اعتبار اور اعتماد کا اظہار کرے گی۔ میں نے کہا، "آپ بالکل بے فکر رہیں یہ بات میرے ساتھ قبر میں جائے گی۔"

انھوں نے لمبی سانس لی، پھر کہا، "میں نے ڈرتے ڈرتے اپنی ماں کو زرینہ کے بھائی کے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے لگا تھا جیسے میں نے انھیں کسی کی موت کی خبر دی ہے۔ انھیں چپ لگ گئی تھی مگر وہ بہادر عورت تھیں۔ بڑی بہادری سے انھوں نے اپنی بیوگی میں اپنی بھی حفاظت کی تھی، ہم لوگوں کو بھی پالا تھا۔ جتنی میں خوب صورت ہوں اس سے کہیں زیادہ میری ماں خوب صورت تھی۔ میرے باپ کے مرنے کے بعد

بڑی کٹھن زندگی گزاری ہے انھوں نے۔ ہم دو بہنوں کی ماں بن کر نہ صرف اپنی حفاظت کی بلکہ ہم دونوں کو بھی اپنے سائے میں رکھے رہیں۔ انھیں صفدر کے بارے میں پتا تھا کہ اس نے ایک طوائف بھی رکھی ہوئی ہے مگر صفدر کے والد بڑے وڈیرے ہیں۔ میرے چچا کی مرضی اگر یہی تھی کہ میری شادی اس سے ہونی ہے تو اس سے ہی ہوگی، وہ کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ انھیں صفدر کے بارے میں پتا تھا اور انھوں نے کچھ نہیں کہا تھا، صرف اپنی خوب صورت آنکھوں کو اٹھا کر مجھ سے کہا تھا، بیٹی! خاموش رہ کچھ نہ بول۔ تجھے کچھ بھی تو پتا نہیں ہے۔

مجھے کچھ بھی پتا نہیں تھا۔ مجھے تو عید کی چھٹیوں پر پتا لگا تھا جب ہم سب لوگ عید منانے کے لیے اپنی زمینوں پر گاؤں گئے تھے۔

عید کا دن گزر چکا تھا۔ شام کا وقت تھا کہ مجھے میرے چچا نے بلایا تھا اور مجھ سے بات کرتے کرتے حویلی کے بالکل آخر میں جہاں زمینیں شروع ہوتی تھیں، جہاں ہم لوگوں کے خاندان کا قبرستان تھا، چلے گئے تھے۔ بڑی اور چھوٹی قبروں کے قریب پہنچ کر عجیب سا لگا تھا۔ میں اپنی ماں کے ساتھ کئی دفعہ یہاں دعا پڑھنے آئی تھی۔ میری ماں وہاں بیٹھ کر نماز پڑھتی تھیں اور روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ نہ جانے کیا کیا دعا مانگتی رہتی تھیں۔ میں نے چاہا تو کئی دفعہ مگر پوچھا نہیں تھا کہ وہ کیوں اس قدر بے حال ہوجاتی ہیں؟ اس جگہ پہ میرے چچا بھی رک گئے تھے۔ دیکھو وہ سامنے کس کی قبر ہے؟ انھوں نے پوچھا تھا۔

میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ انھوں نے کہا تھا، یہ میرے بھائی کی قبر ہے، تمھارے باپ کی قبر ہے اور وہ ساری قبریں ہمارے بزرگوں کی ہیں اور کچھ نہیں ہے ہمارے پاس۔ یہ حویلی، یہ زمین، یہ قبرستان اور ہماری عزت۔ غور سے.دیکھو بالکل آخر میں جو قبر ہے وہ تمھاری بہن کی قبر کی ہے۔ میری بیٹی کی قبر ہے۔ اس کو میں نے اور تمھارے باپ نے دونوں نے مل کر مارا تھا اور اس کے ساتھ ہی اسے بھی مار دیا تھا جس کے ساتھ یہ بھاگنے والی تھی۔ عزت بچالی تھی ہم دونوں نے اس خاندان کی، اس حویلی کی، اس قبیلے کی۔ یہی دستور ہے ہمارا، یہی رواج ہیں ہم سب کے۔ تمھارے باپ اور میری تعلیم انگلستان میں ہوئی ہے، وہاں پڑھا ہے ہم لوگوں نے۔ وہاں تعلیم

حاصل کی بے عزت نہیں بنے ہیں۔ سندھ کی روایات کو نہیں چھوڑا ہے، اپنے پرکھوں کی عزت کو تاراج نہیں کیا ہے۔ دنیا کتنی بھی بدل جائے، لوگ بھلے آسمانوں پر پہنچ جائیں جب تک سندھو دریا میں پانی ہے جب تک یہ رسم، یہ رواج، یہ قانون چلتا رہے گا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی ماری تھی۔ تیرے باپ نے، میرے بھائی نے ساتھ دیا تھا میرا۔ میں قرض دار ہوں اس کا۔ بے عزتی نہیں ہونے دی تھی۔ یہی رواج ہے ہم لوگوں کا، یہی رسم ہے ہماری، یہی طور ہے یہی طریقہ ہے۔ ہزاروں سال سے یہی ہورہا ہے اور ہزاروں سال تک یہی ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ رک گئے پھر میری کلائی کو اپنے ہاتھ سے زور سے پکڑ کر بولے، صرف اور صرف صفدر سے شادی ہوگی تمھاری... خاندان کی عزت کی قسم کھاتا ہوں تمھارے باپ کی قبر کے سامنے... اس کی روح اوپر شرم سار نہیں ہوگی۔

میں چکرا کر گر گئی تھی، ہلکی سی بے ہوشی میں، میں نے دیکھا کہ وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتے ہوئے حویلی کی تاریکیوں میں کھوگئے ہیں۔

کراچی واپس آکر میں نے فیصلہ کرلیا تھا مجھے نہ تو صفدر سے شادی کرنی ہے اور نہ اس حویلی کے رسوم و رواج کا قیدی بننا ہے۔ زرینہ نے میری مدد کی تھی اور اپنی ماں سے اجازت لے کر ایک دن خاموشی کے ساتھ میں پی آئی اے کے جہاز سے ڈھاکا پہنچ گئی تھی۔ مجھے ابھی تک یاد ہے میری ماں نے ڈوبتی آنکھوں سے مجھے رخصت کیا تھا۔ کچھ زیور مجھے دیے، کچھ پیسے میرے بیگ میں ڈالے، میرے ماتھے کو چوما تھا، میرے پلکوں کو چوما تھا، میری آنکھوں کو چوما تھا، میرے ہونٹوں کو چوما تھا، مجھے سینے سے لگا کر دُعا دی تھی۔ بیٹی! جہاں رہنا خوش رہنا۔ جیسی میری گزری ہے ویسی تیری نہیں گزرنی چاہیے۔ میں تجھے قرض سے آزاد کرتی ہوں۔

ڈھاکا میں ہی ہمارا نکاح ہوا تھا اور میں مہرالنسا بدرالدین بن گئی تھی، ناصر بدرالدین کی بیوی۔ جب تک مشرقی پاکستان بنگلہ دیش نہیں بنا تھا میں گھر میں رہتی رہی اور بنگلہ دیش بننے کے بعد مجھے بھی آزادی مل گئی تھی۔ میری گردن سے بھی رسم و رواج اور نام نہاد عزت کا وہ طوق اتر گیا تھا جو ابھی تک سندھو دریا کے ساتھ ساتھ بہتا ہے۔ میرے سندھ میں رہنے والی میری بہنوں کے گلے میں پڑی ہوئی ایک زنجیر۔"

وہ سانس لینے کے لیے رکی تھیں پھر آہستہ سے بولی تھیں، ”یہ بنگالی ہیں ناں۔ تم کو دبلے، پتلے، کالے، بونے لگتے ہوں گے۔ ان کے دلوں میں اُتر کے دیکھو، ہر ایک کے خون میں قاضی نذر الاسلام دوڑ رہا ہے۔ میں یہاں آزاد ہوں... بالکل آزاد تو نہیں مگر اپنی اس بہن سے زیادہ آزاد جس سے میں نہیں مل سکتی ہوں، جو سانگھڑ کی ایک حویلی میں قید ہے۔

اور ایس نجانے کتنی حویلیوں میں اور کتنی حویلیوں سے باہر، کتنی ہی میرے سندھو دریا کی بیٹیاں سونے کی زنجیروں سے بندھی ہوئی، روایات کی غلام بنی ہوئی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی تھیں۔ میں بھی خاموش تھا۔ حقیقت انسان کے اندر جب ایک ہی وقت میں شدید دکھ، سفاکی اور بے چارگی کا احساس جگادے تو پھر کہنے سننے کو رہ بھی کیا جاتا ہے۔ بہت دیر چپ سادھے رہنے کے بعد ہم لوگ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ میں نے چلتے ہوئے مہرالنسا سے وہ پیکٹ لیا اور انھیں اطمینان دلایا کہ پیکٹ اسی طرح خاموشی کے ساتھ ان کی بہن تک پہنچ جائے گا جیسے وہ پہنچانا چاہتی ہیں۔ یکایک ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اور چہرہ جیسے کھلا گیا۔ میں نے اس سے پہلے انھیں ایسی کیفیت میں نہیں دیکھا تھا۔ میرا دل بوجھل ہوگیا۔ میں نے اجازت لی اور چلا آیا۔ واپسی پر میں نے سوچا، انسان بھی عجیب چیز ہے...اپنوں میں رہتا ہے تو ان کی قربت کے دکھ اٹھاتا ہے اور دور چلا جاتا ہے تو ان کی دوری کا احساس اسے کچوکے لگاتا رہتا ہے۔ چین کہاں ہے؟ سکھی کون ہے؟!

کوئی نہیں ہے۔

شاید کوئی بھی نہیں ہے۔

ناسور

لاڑکانہ تو شہر ہی وزیروں، وزیراعلاؤں اور وزیراعظموں کا تھا اور اس کے ساتھ ہی موہنجوداڑو کا رومانس، ہزاروں سال پرانی تہذیب کے آثار جس کے بارے میں، میں نے بہت کچھ سنا تھا اور پڑھا بھی تھا۔ اسی لاڑکانہ آنے کی دعوت نے مجھے یکایک مسحور سا کرکے رکھ دیا تھا۔

سالوں پہلے ڈاکٹر بننے کے بعد پاکستان چھوڑ کر جب میں لندن آکر آباد ہوا تو پھر پاکستان جانا نہیں ہوسکا تھا۔ واقعات بھی کچھ اس طرح سے ہوتے چلے گئے تھے کہ پاکستان سے تمام رابطے ختم ہوکر رہ گئے تھے۔ میں ڈاؤ میڈیکل کالج کے تیسرے سال میں ہی تھا کہ میرے والد نے اعلان کردیا کہ میری شادی نجمہ سے ہوگی۔ نجمہ بڑے ابو کی بیٹی تھی، میری ہم عمر ہی تھی مگر مجھے کبھی بھی کسی بھی قسم کی دلچسپی اس سے نہیں رہی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شادی وادی کے بارے میں، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میرے والد صاحب کو اپنے بڑے بھائی سے بلا کی عقیدت تھی۔ شاید اس زمانے میں بھائیوں ایسا ہی تعلق ہوتا تھا کہ اولاد ان کی خواہش کے آگے سر جھکا دیتی تھی اور ان کا احترام خاندان کی دوسری روایات اور رشتوں سے برتر معلوم ہوتا تھا۔ ایک طویل سرد جنگ کے بعد میں نے جھوٹا وعدہ کرلیا کہ شادی نجمہ سے ہی کروں گا اور پھر ڈاکٹر بننے کے بعد مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ روانہ ہوگیا تھا۔

لندن پہلے ہی دن سے میرے دل کو بھا گیا۔ چھوٹے گھر، سردی اور بہت سارے بے حس لوگوں کے باوجود میں لندن کے ہر رنگ کو پسند کرنے لگا تھا۔ میں آیا تو سرجن بننے کے لیے تھا مگر نہ جانے کیا ہوا کہ ہیمر اسمتھ ہسپتال میں کام کرتے کرتے مجھے عورتوں کے امراض سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عورتوں کے شعبے کا ایک ڈاکٹر نیل کوئن اتنا اچھا تھا کہ میں خود بھی اس سے متاثر ہوگیا اور باتوں باتوں میں ہی اس نے مجھے آمادہ کرلیا کہ سرجری کے بہ جائے گائنی کا امتحان دے ڈالوں۔ میں نے امتحان بھی دیا اور پاس بھی ہوگیا۔ اس کے بعد سے مجھے نوکریاں ملتی ہی چلی گئی تھیں۔ کوئن شارلیٹ، کنگس کالج اور سینٹ جارجیز ہسپتال میں ٹریننگ لیتا ہوا میں بھی گائنا کالوجسٹ بن گیا تھا۔

نجمہ کے خوف اور اباجان کی ضد سے ڈر کر میں لندن میں ہی ٹکا ہوا تھا اور کنسلٹنٹ کی نوکری تلاش کررہا تھا کہ تھوڑے دنوں میں ہی سرے کے علاقے میں مستقل نوکری مل گئی تھی۔ نوکری کے شروع دنوں میں ہی شیوان سے ملاقات ہوئی تھی۔

زندگی میں بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے آپ کسی سے ملتے ہیں، کسی کو دیکھتے ہیں اور یکایک بے وجہ وہ آپ کے وجود کو تسخیر کرلیتا ہے، آپ کے اوپر چھاجاتا ہے اور مکمل طور پر آپ کو مسحور کرلیتا ہے۔ میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ شیوان یکایک میری زندگی میں بغیر کسی پلاننگ کے آئی تھی اور پہلے ہی دن میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میری زندگی کی باگ ڈور شیوان کے ہاتھ میں ہوگی۔

یہ فیصلہ بڑا مشکل تھا، میرے لیے بھی اور شیوان کے لیے بھی۔ مجھے پتا تھا کہ یہ فیصلہ اس لیے بھی کرنا ضروری تھا کہ جب تک میں کنوارا تھا نجمہ بھی کنواری رہے گی، میرے فیصلے کے بعد ہی بڑے ابو اور اباجان نجمہ کے لیے کوئی رشتہ تلاش کریں گے۔

میرے خط اور فیصلے کا دھماکا خیز جواب آیا تھا۔ مجھے عاق کر دیا گیا تھا اور تاکید کی گئی تھی کہ اپنی منحوس شکل کے ساتھ کبھی بھی اپنے والدین کے سامنے نہ آؤں۔ میں ان کے لیے زندہ درگور ہوگیا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے والدین اپنی اکلوتی اولاد کے ساتھ ایسا بھی کرسکتے ہیں۔ میرا قصور ہی کیا تھا... صرف اپنی پسند کی شادی۔

وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے جب مجھے خط ملا تھا تو شیوان میرے ساتھ ہی تھی۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ میں کس قدر شدید جذباتی اتھل پتھل کا شکار ہو کر رہ گیا ہوں۔ نہ مجھ سے بولا جارہا تھا نہ میں سوال سن رہا تھا اور نہ ہی جواب دینے کے قابل تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں اس کی بانہوں میں پڑا سسکتا رہا تھا، بلکتا رہا تھا۔

شیوان کے والدین ایک ''پاکی'' کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کو ناپسند کرنے کے باوجود راضی ہوگئے تھے اور وہ میری زندگی کی خزاں میں بہار کی طرح آکر چھا گئی تھی۔ وہ اسکول میں پڑھاتی تھی۔ بہت ہی دردمند دل کی مالک تھی۔ تمام زندگی اس نے ترقی پذیر تیسری دنیا کے لیے ہی کام کرتے ہوئے وقت گزارا تھا۔ کینیا کے کالون کے اسکول میں رضاکارانہ طور پر وہ پڑھاتی رہی تھی۔ ساؤتھ افریقا کی آزادی کی جنگ کے لیے لندن میں ہونے والے مظاہروں میں وہ آگے آگے رہی تھی۔ تنزانیہ کے جوزف نریرے نے جب برطانیہ کی چائے کی کمپنیوں کے خلاف بغاوت کرکے خود ہی چائے برطانوی عوام تک پہنچانے کا فیصلہ کیا تو شیوان دل و جان کے ساتھ لندن کی ایکشن کمیٹی میں سرگرم ہوگئی تھی۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی وہ سرگرم رکن تھی۔ عدلیس آبابا میں ڈاکٹر ہملن کے فسٹیولا ہسپتال کے لیے وہ سارا سال چندہ جمع کرتی رہتی تھی۔ شیوان ایک خوب صورت عورت ہی نہیں تھی بلکہ ایک خوب صورت دل و دماغ کی بھی مالک تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یورپ میں ایک تیسری دنیا کی عورت پیدا ہوگئی تھی۔ ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں۔

پاکستان سے میرا تعلق ختم ہی ہوگیا تھا۔ مجھے نجمہ کی شادی کی خبر ملی تھی۔ اباجان اور امی کا انتقال ہوا تھا پھر کراچی سے، پاکستان سے تمام رشتے ٹوٹ گئے۔ رشتوں کے ٹوٹنے کے باوجود پاکستان سے ایک رشتہ قائم تھا۔ ریڈیو پر پاکستان کے بارے میں خبریں آتیں تو میں سنتا ضرور تھا، ٹیلی وژن پر پاکستان کے بارے میں پروگرام ضرور دیکھے جاتے تھے اور اخبارات کی خبریں اور تجزیے پابندی سے پڑھتا تھا۔ بھارت اور پاکستان کی جنگ ہوئی، مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا، ہندوستان ایٹم بم کا دھماکا کر بیٹھا، پاکستان بھی بم بنارہا ہے، پاکستان میں فوج آگئی وغیرہ، ہر خبر کی اہمیت تھی۔ رشتوں کے ٹوٹنے کے بعد ایک اور ہی عجیب قسم کا رشتہ قائم ہوگیا تھا۔ کبھی کوئی

پرانا کلاس فیلو ملتا تھا تو پاکستان کی باتیں ہوتی تھیں۔ کشمیریوں کے حقوق کی باتیں اور دنیا کی ناسمجھی کا رونا کہ پاکستان پر پابندی ہے، اسرائیل تو بم بناسکتا ہے مگر پاکستان کو اجازت نہیں تھی۔ پاکستان سے رشتہ دلچسپ بھی تھا اور عجیب بھی۔ ایٹمی جنگ کے خلاف ہونے کے باوجود اس وقت میرا خیال تھا کہ ہندوستان کے ساتھ ساتھ پاکستان کے پاس بھی ایٹم بم ہونا چاہیے۔

میں اور شیوان زندگی کا بھرپور لطف اٹھارہے تھے۔ دو بچے تھے ہمارے، زندگی کامیاب تھی، خوشیاں جیسے ہمارا مقدر بنی ہوئی تھیں۔ زندگی سے مزید کچھ اور مانگا نہیں جا سکتا تھا۔

سال میں دو چھٹیاں ہم لوگ ضرور مناتے تھے، ایک دفعہ تیسری دُنیا کے کسی غریب ملک میں اور ایک دفعہ یورپ امریکا کی کسی خوب صورت جگہ پر۔ شیوان کا خیال تھا کہ بچوں کو ہر طرح کی جگہ دکھانی چاہیے۔ اس دفعہ ہم لوگ عدیس آبابا گئے تھے، عدیس آبابا کا ہزاروں سال پرانا شہر جہاں ڈاکٹر ہملٹن کا فسٹیولا کا ہسپتال بھی تھا۔ یہ ہسپتال افریقا کی ٹھکرائی ہوئی عورتوں کی پناہ گاہ تھی۔ افریقا کے ان علاقوں میں جہاں نہ ڈاکٹر ہیں نہ مڈوائف نہ ہسپتال ہیں اور نہ ہی زندہ رہنے کی سہولتیں۔ غربت کا ناگ ہے جس کے ڈسے ہوئے لوگ زندگی گزارتے نہیں بھگتاتے ہیں۔ ایسی جگہوں سے جہاں جوان لڑکیاں شادی کے بعد حمل کے دوران بچے جنم دینے میں ناکام ہوجاتی ہیں اور جب مرا ہوا سڑا ہوا بچہ کئی دنوں کے بعد پیدا ہوتا ہے تو پیشاب کی تھیلی میں سوراخ بھی کر ڈالتا ہے۔ پھر تھوڑے دنوں بعد ہر وقت پیشاب رستی ہوئی یہ لڑکیاں، گھروں سے نکال دی جانے والی بیویاں نہ جانے کن کن راستوں سے ہوتی ہوئی اور کیا کیا فاصلے طے کرکے اس ہسپتال میں آتی ہیں اور یہاں ان کا فسٹیولا، یہ سوراخ صحیح کیا جاتا ہے۔ میں نے ایسی ہی لٹی ہوئی لڑکیوں کو آتے ہوئے دیکھا، ان لٹی ہوئی لڑکیوں کے چہروں کی چھنی ہوئی مسکراہٹوں کو بھی واپس آتے ہوئے دیکھا۔ وہ تجربہ بہت حسین تھا۔ مجھے پہلی دفعہ شدید احساس ہوا کہ شیوان کتنا بڑا کام کر رہی ہے۔ اس ہسپتال کے لیے پیسہ جمع کرنے سے بڑی کوئی عبادت کیا ہوسکتی تھی؟ مجھے اس پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

پھر شیوان کے اسکول کی چھٹیوں میں ہم ہر سال ایتھوپیا جاتے تھے۔ دو ہفتے رضاکارانہ طور پر میں بھی اس ہسپتال میں کام کرتا تھا۔ روزانہ پانچ چھ آپریشن میں بھی کرلیتا تھا۔ سال کے دو ہفتے کا یہ کام جتنی خوشیاں دے کر جاتا تھا، انگلستان میں سارا سال کام کرکے نہیں ملتی تھی۔ پھر انگلستان میں فسٹیولا کا مسئلہ تو تھا ہی نہیں۔ تیس پینتیس سال انگلستان میں گزارنے کے باوجود میں نے ایک بھی ایسا مریض یہاں نہیں دیکھا تھا۔ انگلستان اور یورپ کی عورتیں ذلت کی اس بیماری سے سالوں پہلے نجات حاصل کرچکی تھیں۔ یہ بیماری تو افریقا اور ایشیا کے ان ملکوں کی عورتوں کا مقدر تھا جہاں دولت ہونے کے باوجود غربت ہے۔ جہاں کے میرے جیسے ڈاکٹر جو یہ آپریشن کرسکتے ہیں مگر وہ لندن میں کسی شیوان، کسی جوزفین کے ساتھ سکھ چین کی زندگی گزار رہے ہیں۔ انگلستان نے مجھے بہت کچھ دیا تھا، شیوان میری زندگی تھی مگر نہ چاہنے کے باوجود یہ خیالات میرے دماغ میں آجاتے تھے، اپنے ملک سے باہر رہ جانے والوں کا رشتہ کبھی ٹوٹتا نہیں ہے۔ یہ جیسے ناف کا رشتہ ہے جس کا نشان ساری زندگی کے بنیادی رشتے کی یاد دلاتا رہتا ہے۔

ایک دن ہسپتال میں نذیر سومرو ملنے آیا تھا۔ پاکستان کا یہ ڈاکٹر لندن یونی ورسٹی میں ایک کورس کررہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ لندن میں ہی پاکستانیوں سے پیسے جمع کرکے لاڑکانہ کے ہسپتال میں فسٹیولا کے آپریشن کے لیے ایک میڈیکل کیمپ لگا رہا تھا۔ مجھے پہلی دفعہ پتا لگا تھا کہ پاکستان میں بھی لڑکیاں اس مرض کا شکار ہوتی ہیں۔ وہ اسی سلسلے میں مجھ سے ملا تھا۔

نذیر نے بتایا تھا کہ سندھ کے دیہاتوں میں کتنی ہی لڑکیاں ہیں جو فسٹیولا کے اس عذاب کے ہاتھوں زندہ درگور ہیں۔ نذیر کو پتا چلا تھا کہ میں ہر سال عدیس آبابا جا کر یہ آپریشن کرتا ہوں۔ اس نے مجھے دعوت دی تھی کہ میں تھوڑے دنوں کے لیے لاڑکانہ کے اس کیمپ میں مدد کروں۔ شیوان کا بھی یہی خیال تھا کہ ہمیں ضرور وہاں جانا چاہیے اور پھر ہم دونوں ہی نے اس کام کی حامی بھرلی تھی۔ مجھے اس فیصلے کے بعد بڑی خوشی ہوئی تھی بالکل ایسی ہی خوشی جیسی کسی بہت اچھے دوست کا بہت پرانا قرض اُتار کر ہوتی ہے۔

میرا اب پاکستان میں کوئی نہیں تھا۔ اباجان، امی اور بڑے ابو کے انتقال کے بعد نجمہ سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ وہ اب کہاں ہے؟ دوست پاکستان میں کوئی رہا نہیں تھا۔ میڈیکل کالج میں میری کلاس کے دوست امریکا میں تھے یا انگلستان میں اور خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ پاکستان سے صرف خبروں کا تعلق تھا۔ ریڈیو کا ایک رشتہ اور ٹیلی وژن کا ایک واسطہ۔ پاکستان کے بارے میں بہت سی باتوں کا اندازہ تھا مگر میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہاں بھی لڑکیاں حمل کے دوران انھیں تکالیف کا شکار ہوتی ہیں جو ایتھوپیا، تنزانیہ اور یوگنڈا کی عورتوں کا مقدر ہے۔ یہ تو قحط زدہ ملک ہیں، یہاں تو یہ ممکن ہوتا ہوگا، پاکستان میں ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں افریقا کے صحراؤں اور جنگلوں سے آنے والی عورتوں کا علاج کرتا رہا اور سمجھتا رہا کہ پاکستان ہندوستان غریب ممالک ضرور ہیں مگر وہاں یہ حال تو نہیں ہوگا۔ یہ خطۂ زمین تو بہت پرانا ہے۔ موہنجوداڑو کے کھنڈروں سے لے کر اجنتا کے غاروں تک۔ افریقا کے وحشیوں سے بہت پرانی تہذیب ہے ہماری۔ ہندوستان کے پاس تو ایٹم بم بھی تھا اور پاکستان کی تیاریاں بھی مکمل تھیں۔ یورپ میں ہر ایک کو پتا تھا۔ اس کے باوجود افریقا جیسا حال... میں نے تھوڑی دیر کے لیے سوچا کہیں نذیر جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے۔

میں نے اور شیوان نے بھرپور تیاریاں شروع کردی تھیں۔ میں واپس کراچی جارہا تھا جہاں میں اسکول اور کالج گیا تھا۔ اسکول کے زمانے میں مجھے موہنجو داڑو کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ میں نے اس وقت بھی سوچا تھا کہ ایک دن ضرور لاڑکانہ جا کر ہزاروں سال پرانے کھنڈرات دیکھوں گا۔ اب یہ پرانا بہت پرانا خواب تعبیر پارہا تھا۔ اب میں نہ صرف یہ کہ کراچی جا رہا تھا بلکہ موہنجو داڑو اور لاڑکانہ بھی جا رہا تھا۔ اسی پاکستان میں جس کی جنگ سبھی پاکستانی پاکستان سے باہر لڑتے ہیں۔

کراچی کا کانٹی نینٹل ہوٹل ویسا ہی تھا۔ ویسا ہی صاف ستھرا، وہی دوستانہ ماحول ویسے ہی لذیذ کھانے۔ کالج کے زمانے میں کسی دوا کی کمپنی کی طرف سے ہونے والی دعوتوں میں، میں نے وہاں کھانا کھایا تھا یا کبھی چائے پی لی تھی مگر اس دفعہ ہم لوگ ٹھہرے ہی وہاں تھے۔ مہمان نوازی کا مزہ آ گیا تھا۔

دو دن کراچی میں رہنے کے بعد ہم لوگ لاڑکانہ چلے گئے تھے۔ موہنجوداڑو ایئرپورٹ، موہنجو داڑو کے ساتھ ہی بنا ہوا تھا۔

موہنجوداڑو میری اور شیوان کی توقعات سے کہیں زیادہ شان دار تھا۔ شیوان تو موہنجوداڑو کے بارے میں بہت ساری کتابیں پڑھ کر آئی تھی۔ اس کے ساتھ مجھے بھی یہ کھنڈرات دیکھنے کا بہت مزہ آیا تھا۔ ہزاروں سال پرانی تہذیب اپنی تمام تر شان و شوکت کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود تھی۔ وہ لوگ بہت عزت و شان کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے گھر، ان کے اسکول، ان کی عبادت گاہیں، ان کا پانی کا نظام، ان کے گندگی کے نکاسی کے طریقے، ان کی عدالتیں، ان کے بازار، ان کا رہن سہن، ان کا طریق زندگی ہزاروں سال پہلے وہ اتنے ترقی یافتہ تھے، میں اش اش کر اُٹھا تھا۔

لاڑکانہ اتنا ہی خراب تھا۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس شہر سے تھوڑے سے فاصلے پر ہزاروں سال پہلے رہنے والوں نے جو شہر بسایا تھا یہ ان کے ہی بچوں کا دوسرا شہر ہے۔ گندگی کے ڈھیر، ابلتے ہوئے گندے پانی کے نالے، مکانوں کی بے سمت اور بے ترتیب قطاریں، ایک وہ شہر تھا جس کے کھنڈروں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہاں رہنے والوں کے نظام میں انصاف کو فوقیت رہی ہوگی اور لاڑکانے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ غربت اور ناانصافی اس شہر کی بنیادوں میں شامل ہے۔ مجھے پاکستان آکر یہ پرلا دھچکا لگا تھا۔ وزیراعظموں، وزیراعلاؤں اور وزیروں کا شہر تھا یہ۔ بھکاریوں سے اٹا ہوا ننگے پیر بھیک مانگتے ہوئے چھوٹے بچے، دبلی پتلی فاقہ زدہ لڑکیوں، عورتوں کا ہجوم جو سرکاری ہسپتال میں بے عزت ہونے کے لیے آتے ہیں۔ اتنی غربت... میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ اسی ملک کے وزیراعظم کا شہر تھا جس کی فوج امریکا سے کروڑوں ڈالر کے جنگی طیارے خریدتی ہے، جو فرانس سے عربوں روپوں کی جنگی آبدوزیں بنواتی ہے، جس کے کتنے ہی سربراہ دنیا کے امیر ترین لوگ ہیں۔ اس ملک کے اس شہر میں غربت و افلاس کا ننگا رقص دیکھ کر شیوان کے آنسو نکل آئے تھے۔ ایتھوپیا سے بدتر تھے لاڑکانہ کے غریب۔ اس نے مجھ سے پوچھا تھا، کیوں... کیوں اس شہر کے وزیراعظم نے ایٹم بم بنانے کا فیصلہ کیا تھا؟ کیوں اس ہیبت ناک پروگرام کا آغاز کیا تھا جس کی جنگ ابھی

تک جاری ہے؟ اسے یہ بدحالی، یہ غریب، یہ مظلوم نظر نہیں آتے تھے۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

پچاس سے زائد جوان لڑکیوں کو جمع کیا ہوا تھا، نذیر نے آپریشن کے لیے۔ حمل کے دوران علاج نہ ہونے کی وجہ سے سب کی پیشاب کی تھیلیوں میں سوراخ ہوگئے تھے۔ ان سب کو گھروں سے نکال دیا گیا تھا۔ سب کی سب غریب تھیں۔ ذلتوں کی ماری ہوئی بے وقعت عورتیں، فاحشہ عورتوں سے بدتر... پیشاب رِستی ہوئی جادوگرنیاں۔ مجھے نذیر بہت اچھا لگا تھا جس نے پیسے جمع کیے تھے، لوگ جمع کیے تھے اور ان قسمت کی ماری ہوئی عورتوں کے آپریشن کا انتظام کیا تھا۔

صرف چار عورتوں کے علاوہ جن کے فسٹیولا اتنے بڑے تھے کہ ان کا آپریشن ممکن ہی نہیں تھا، باقی سب کے صبح سے شام تک روزانہ سات آٹھ آپریشن کرکے جتنے بھی سوراخ بن جانے کے قابل تھے، ان کو ہم لوگوں نے بنادیا تھا۔ زلیخا آخری مریضہ تھی، مشکل سے پندرہ سال عمر ہوگی اس کی۔ لاڑکانہ شہر سے چالیس پچاس میل دُور ایک اور شہر ہے شہداد کوٹ۔ شہداد کوٹ کے چاروں جانب چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں حاکم شاہ، بہرام، نوڈیرو، رتوڈیرو اور پناہ شیخ... انھیں کے آس پاس سے آئی تھی وہ اپنی ماں کے ساتھ۔ دُبلی پتلی کم زور چہرہ جو کبھی بہت خوب صورت رہا ہوگا، ہڈیوں کا ڈھانچا ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ کسی بچی کی اتنی ویران آنکھیں میں نے آج تک نہیں دیکھی تھیں۔ درد کی ایک ٹیس تھی جو میرے سینے میں اُٹھی تھی اور میری روح کو زخمی کرتے ہوئے، دُور تک مجھے گھسیٹتی ہوئی لے گئی تھی۔ وہ بارہ سال کی تھی تو اس کی شادی پینتیس سال کے اس زمیں دار سے کر دی گئی تھی جس کے پہلے ہی چھ بچے تھے۔ کچھ پیسوں کے عوض کچھ قرضے معاف کرانے کے لیے اس کے باپ نے اسے اس زمیں دار کے حوالے کردیا تھا۔ بارہ سال کی یہ گڑیا جس کے خود گڑیا سے کھیلنے کے دن تھے یکایک اپنے سے تین گنا عمر کے وحشی کی بیوی بن گئی تھی۔ تیرا سال کی عمر میں وہ تین دن تک گاؤں کی حویلی کے ایک کمرے میں حمل کے درد سے تڑپتی رہی تھی، سسکتی رہی تھی، بلکتی رہی تھی۔ تین دن تک گاؤں کی دائیاں اس کے ساتھ وہ سب کچھ کرتی رہیں جو جانوروں کے ساتھ بھی نہیں

ہوتا ہے۔ تین دن کے بعد ایک مرا ہوا متعفن بچہ پیدا ہوگیا تھا۔ پانچ دن کے بعد سے اس تیرہ سال کی بچی کا اپنے پیشاب پر اختیار ختم ہوگیا تھا۔ اس کا پیشاب مسلسل بہنا شروع ہوگیا۔ اسے فسٹیولا ہوگیا اور پھر زمیں دار نے اسے گھر سے نکال دیا۔ اب وہ اس کے قابل نہیں رہی تھی۔ گاؤں والوں کے خیال میں اس پر کسی جن کا سایہ تھا، وہ ناپاک تھی، اچھوت، نہ چھونے کے قابل۔

تیرہ سال سے پندرہ سال کی عمر تک اس کا پیشاب مسلسل بہتا رہا تھا۔ زندگی اس کے لیے نہ ختم ہونے والا ایک ڈراؤنا خواب بن کر رہ گئی تھی۔ صرف اس کی ماں اس کے ساتھ تھی... اس کے جنم کے گناہ کا بوجھ لیے ساتھ ساتھ ہر جگہ ذلتوں کا شکار ہونے کے لیے۔

دو گھنٹے کے معمولی آپریشن کے بعد وہ صحیح ہوگئی تھی۔ دوسرے دن وہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے کپڑے اور بستر بالکل خشک تھے، اس کی فاقہ زدہ خوب صورت چہرے کی ویران آنکھوں سے خوشی کے موتی چھلکنے کے لیے بے قرار سے تھے۔ شیوان نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کامیاب آپریشن کیا ہے۔

تین دن کے بعد ہم لوگ کراچی واپس آگئے تھے۔ سارے ہی مریض ٹھیک تھے مگر مجھے سب سے زیادہ خوشی زلیخا کی تھی۔ چھ دن اور اس کو ہسپتال میں رہنا تھا، پھر اس کے بعد وہ اپنی زندگی کی خود مالک ہوگی۔ ایک نارمل لڑکی کی طرح جس کا جسم مکمل ہوتا ہے۔ کانٹی نینٹل ہوٹل سے ہی میں نے چھ دن بعد لاڑکانہ فون کرکے زلیخا کا حال پوچھا تھا۔ وہ ٹھیک تھی، زخم بھر چکے تھے۔ وہ گھوم پھر رہی تھی، پیشاب رسنا بند ہوگیا تھا۔ اس کی خوشی کا اندازہ ہر کوئی نہیں کرسکتا ہے۔

شام شیوان کے ساتھ مارکوپولو میں بیٹھے ہوئے تازہ پھلوں کے رس کی چسکی لیتے ہوئے ہم دونوں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے کہ خنجر کے زخم کی طرح وہ خبر آئی تھی اور ہم دونوں کو چھلنی کرتے ہوئے چلی گئی... پاکستان نے چاغی میں اپنے ایٹم بم کا دھماکا کر دیا تھا... پوکھران کے جواب میں۔ کراچی کے کسی اخبار کا سپلیمنٹ ریسٹورنٹ کے میز پر پڑا ہوا تھا۔ شیوان کا فق چہرہ سامنے تھا، میں نے آنکھیں بند

کرلی تھیں۔

زلیخا جیسی ہزاروں لڑکیاں گرد و طوفان کے اس بادل کے پیچھے چاغی کے پہاڑوں پر سسکتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ یہ بم تو اپنی قیمت وصول کرے گا، بہت ساری زلیخاؤں کو پامال کرے گا، بارہ سال کی بچیاں لٹتی رہیں گی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ بم کا دھماکا نہیں تھا، بارہ سالہ بچیوں کی عروسی رات کی دل خراش چیخیں تھیں۔ وہ چاغی کا پہاڑ نہیں تھا بلکہ پاکستان کی دھرتی پر بننے والا ایک بہت بڑا فسٹیولا تھا۔ بے بسی اور شدید دُکھ کا ایک احساس مجھ پر اُمڈتا آ رہا تھا۔

□

ٹک روتے روتے سو گیا ہے

میں ہڑبڑا کر اُٹھ گیا۔ رات کے دو بجے رونے کی آواز تھی جس نے مجھے جگا دیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے ابو کی آواز ہے۔ میں گھبرا کر اپنے کمرے سے نکل کر تیز تیز ان کے کمرے کی طرف گیا۔ یہ ان کی ہی آواز تھی۔ میرا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ ایسا لگا کہ جیسے شدید درد سا اُٹھ رہا ہے اور گلا بالکل ہی خشک ہوکر رہ گیا تھا۔ وہ کیوں رو رہے ہیں، ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں نہ جانے کیا کیا خیالات میرے ذہن میں آئے اور گڈمڈ ہوکر رہ گئے۔ ان کا کمرہ کھلا ہی رہتا تھا۔ بھڑے ہوئے دروازے کو آہستہ سے دھکا دے کر میں کمرے میں داخل ہوگیا۔ دھیمے سے سبز رنگ کے زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں وہ تکیے کو اپنے سینے سے لگائے کروٹ لیے دھیرے دھیرے سسکیاں لے رہے تھے۔ مجھے ایسی تکلیف کبھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ایسا لگا جیسے سینہ اندر سے خالی ہوگیا ہے ایک عمیق سی گہرائی ایک عجیب سا کھوکھلا پن ایک اضطراب جو میری پور پور میں اٹد رہا تھا۔

میرا چھوٹا بیٹا دیوار سے گر گیا تھا اور اس کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ شبانہ نے گھبرا کر مجھے بلایا تھا۔ ہم لوگ اسے فوراً ہی ہسپتال لے گئے تھے۔ مجھے سخت غصہ آیا تھا، مجھے اس کے درد کا احساس تھا مگر میں نے اسے ڈانٹا تھا۔ کیوں چڑھا تھا دیوار پر بے وقوف۔ جتنے دنوں اس کا بازو پلاسٹر میں جکڑا رہا تھا، میں اس کی دل جوئی کرتا رہا

تھا درد کے لیے دوائیں بھی دی تھیں مگر دل میں جو چبھن سی ہوئی تھی وہ اس وقت محسوس ہو رہی تھی۔

شبانہ کا آپریشن ہوا تو ارم پیدا ہوئی تھی۔ شبانہ مجھے جان سے پیاری تھی، زمانے سے لڑ کر حاصل کیا تھا میں نے اسے۔ آپریشن کے بعد کمرے میں وہ درد سے کراہ رہی تھی۔ میں آج تک یہ فیصلہ نہیں کرسکا ہوں کہ میں شبانہ کے کراہنے سے رو دیا تھا یا شبانہ کے بازو میں کپڑوں میں پھنسی ہوئی ارم کو دیکھ کر آنسو چھلک گئے تھے۔ شبانہ کے کراہنے اور درد سے بے قابو ہوجانے پر پریشان سا ہو جاتا تھا۔ پھر مجھے ارم کے کانوں کی چھدائی بھی یاد ہے۔ وہ چھوٹی سی تھی، سات سال کی۔ شاید کسی لڑکی کی یہی عمر ہوتی ہے جب اپنے باپ کو وہ سب سے اچھی لگتی ہے پھر ارم بلا کی ذہین تھی، ہر وقت الٹے پلٹے سوالات۔ جتنی دیر میں گھر میں ہوتا تھا کوشش کرتا تھا وہ میری نظر کے سامنے رہے۔ وہ ابھی تک میری کم زوری ہے۔ میں اس کی کوئی بات ٹال ہی نہیں سکتا ہوں۔ کانوں کی چھدائی کے بعد اس میں انفیکشن ہوگیا تھا۔ حالاں کہ یہ چھدائی میں نے شبانہ پر زور دے کر امی کی مرضی کے خلاف ہسپتال میں ڈاکٹر سے کرائی تھی۔ پورے تین دن تک اس کا دایاں کان پھولا رہا، اسے بخار آگیا اور اینٹی بائیوٹک سے اس کا علاج کرنا پڑ گیا تھا۔ وہ درد کی شدت سے بار بار روتی تھی۔ میں اور شبانہ پریشان سے ہوجاتے تھے۔ مگر ٹھیک تھا ایسا نہیں ہوا تھا کہ جیسے دل اُمڈ آیا ہو۔

ابو جان کو روتا دیکھ کر ایسا ہی لگا تھا۔ شاید میں یہ احساس الفاظ میں کبھی نہیں بتاسکوں گا۔ نہ اردو میں نہ انگلش میں... وہ الفاظ، وہ جملے میرے پاس ہیں ہی نہیں جن کے جامے میں ان جذبات کا اظہار کرسکوں۔ وہ اپنے بستر پر تکیے کو اپنے سینے سے لگائے دیوار کی طرف منھ کرکے سسکیاں لے رہے تھے۔ میرا دل کٹ کٹ کر ہر جگہ سے رسنے لگا تھا۔

میں دھیرے سے ان کے بستر پر بیٹھ گیا۔ ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تھا۔ کیا ہوا ابو! خیریت تو ہے؟

وہ یکایک خاموش ہوگئے۔ انھیں میرے کمرے میں آنے کا احساس ہوگیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا وہ اپنے آنسو پونچھ رہے ہیں۔ اپنے سر کو موڑے بغیر دھیرے سے

بولے تھے، ''نہیں کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔''

میرے دل میں جیسے آیا تھا کہ میں انھیں پکڑ کر اُٹھا لوں، ان کے سینے سے لگ جاؤں۔ ان کے سر کو اپنے کاندھوں پر رکھوں پھر وہ روئیں اور میں بھی رو دوں۔ مگر میں کچھ نہیں کر سکا۔ بے انتہا محبتوں کے باوجود اس قسم کے تعلقات نہیں تھے ہم میں۔ صرف اپنے آنسوؤں کو ضبط کر سکا تھا میں۔ اتنی شدت سے رونا مجھے کبھی نہیں آیا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرے گالوں کے اوپر آنکھوں کے گرد جو ہڈی ہے وہ چیخ جائے گی۔

میں نے پھر ہمت کرکے پوچھا تھا، ''ابو کیا ہوگیا ہے۔ مجھے بتائیں تو سہی۔'' انھوں نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ جلا دیا تھا اور آہستہ سے اٹھ بیٹھے تھے۔

''نہیں کچھ نہیں بیٹے، گھبراؤ مت، جاؤ سو جاؤ۔''

ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، چہرہ دھلا ہوا تھا۔ وہی مانوس چہرہ، وہی مہربان آنکھیں، وہی لب جو مجھے بچپن میں چومتے نہیں تھکتے تھے۔ میرے ابو بڑے خوب صورت آدمی تھے۔ لانبا سا قد تھا ان کا، سرخ تانبے جیسا رنگ۔ وہ زیادہ تر سفید قمیص کے ساتھ خاکی پتلون پہنتے تھے۔ کسی تقریب میں، کبھی کسی شادی میں وہ کوٹ کے ساتھ ٹائی بھی لگا لیتے تھے۔ میں نے امی کی کئی سہیلوں کو انھیں نظر بھر کے دیکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ انگلی پکڑ کر ان کے ساتھ ساتھ چلنے میں مجھے بہت مزہ آتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اتنے بڑے بڑے قدم کیوں لیتے ہیں، جیسے میں چلتا ہوں آخر وہ ایسے کیوں نہیں چل سکتے ہیں، وہ تو مجھے بڑا ہو کر پتا چلا کہ وہ میرے لیے کتنے آہستہ آہستہ چلتے تھے۔

انھوں نے پھر کہا تھا، ''جاؤ بیٹے سو جاؤ یہ تو ایسے ہی ہوگیا گھبرانے کی بات نہیں ہے۔'' میں ان سے بول نہیں سکا۔ کچھ کہہ کر بھی کچھ کہہ نہیں سکا۔ انھوں نے ایسی ہی نظر سے دیکھا تھا۔

میں نے کہا تھا، ابو لیٹ جائیں، میں چادر اوڑھا دیتا ہوں۔ وہ جلدی سے لیٹ گئے، میں نے انھیں چادر اوڑھائی۔ ٹیبل لیمپ بجھایا اور دروازے کو بھیڑ کر پریشان پریشان اپنے کمرے میں آگیا تھا۔

سارا گھر سناٹے کی چیخ میں بے خبر سو رہا تھا۔ ابو پچھتر سال کے تھے۔ آٹھ ماہ

پہلے امی جان کی ذیابیطس ذرا سی بگڑی تھی اور پھر نہ جانے کیا ہوا تھا کہ ان کی طبیعت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ میں دفتر کے کسی کام سے فرانس گیا ہوا تھا وہاں فون پر مجھے پتا لگا تھا کہ امی کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ شہر کے بہت بڑے پرائیویٹ ہسپتال میں داخلے کے باوجود اور لاکھوں روپے خرچ ہونے کے بعد وہ آئی سی یو میں رہ کر دھیرے دھیرے دیکھتے دیکھتے انتقال کر گئی تھیں۔ میں کئی دنوں تک سوچتا رہا تھا کہ شاید یہ اس وجہ سے ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں تھا۔ شاید میں ہوتا تو ایسا نہیں ہوتا، شاید میں کچھ کرلیتا، شاید ان کی جان بچ جاتی، میں اپنے آپ کو مورد الزام ٹھہراتا رہا تھا گو کہ میرے ڈاکٹر دوستوں نے کہا بھی تھا کہ پاکستان میں تو یہی ہوتا ہے یہاں کے نظام میں کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا ہے۔ پرائیویٹ ہو کہ سرکاری ہسپتال۔

ان کی لاش گھر آئی۔ نہلا دھلا کر انھیں قبر میں اتار دیا گیا۔ ابو نے بڑے حوصلے کا مظاہرہ کیا۔ خاموشی سے لوگوں کی باتیں سنتے رہے تھے۔ میں نے ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے تھے۔ دس پندرہ دن یہی کچھ ہوتا رہا پھر ہر کوئی اپنے کاموں میں لگ گیا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ میری دونوں چھوٹی بہنیں کراچی سے باہر رہتی ہیں، دونوں آئی تھیں کئی دن رہیں مگر ابو نے انھیں جلد ہی واپس بھیج دیا۔ جتنا میں سوچتا تھا اتنا کڑھتا رہتا تھا۔ اب تو میں کہیں جا کر اس قابل ہوا تھا کہ اپنی ماں کے دامن کے لیے کچھ خوشیاں خرید سکتا، مگر زندگی اتنی بے وفا ہوگی مجھے اندازہ نہیں تھا۔

میں نے سوچا شاید ابو کے یہ آنسو اب آرہے ہیں اب وہ اکیلے ہوگئے ہیں، اب انھیں احساس ہو رہا ہے کہ پینتالیس سال کی رفاقت ٹوٹ گئی ہے۔ بڑا ہونے کا بوجھ سماج اور رشتے داروں کے سامنے آنسوؤں کا نہ نکلنا غم کا اظہار نہ کرنا... شاید اب انھوں نے محسوس کیا ہے کہ ان کا سب کچھ کھوگیا ہے۔ میں سوچتا تھا کہ کیوں غم کے اظہار کے راستے بند کر دیے جاتے ہیں، میں تو بری طرح سے رویا تھا۔ بکھر بکھر کے بے قراری کے ساتھ بار بار۔ ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد کرکے وقت بے وقت کسی بھی وقت گھر میں دفتر میں، قبر کے سامنے کسی پرانی تصویر کو دیکھ کر۔ میں اپنے آپ کو بہت پرسکون محسوس کرتا تھا۔ احساس جرم کے باوجود۔

میں آہستہ سے اپنے بستر پر لیٹ گیا تھا۔ شبانہ بے سدھ اپنے خوابوں سے بھی

بے خبر سو رہی تھی۔ دن بھر کی تھکی ہاری، گھر کے کام، بچوں کے مسائل، رشتے داروں کے شکوے اور نہ جانے کیا کیا۔ بدن تھک کر چور ہو جاتا ہوگا۔ شبانہ میری پسند کی شادی تھی۔ امی ابو دونوں ہی کی مرضی کے خلاف۔ نہ جانے کیوں دونوں نے ہی یہ سوچا ہوا تھا کہ میرے لیے ان کا انتخاب ہی سب سے اچھا ہوگا۔ ٹھیک ہے وہ مجھے جتنا اچھا اور بہتر جانتے ہیں شاید میں خود بھی اپنے آپ کو اتنا اچھا نہیں سمجھتا ہوں گا۔ بہت سی باتیں انھوں نے سوچی ہوں گی۔ بہت کچھ انھوں نے سمجھا ہوگا۔ مگر وہ یکایک چھم سے میری زندگی میں آگئی تھی، میری مرضی کے خلاف کسی بھی قسم کے پلاننگ کے بغیر۔ خود شبانہ کے والدین بھی راضی نہیں تھے۔ وہ کسی ایسے گھر میں بیٹی نہیں بھیجنا چاہتے تھے جہاں کے مکین راضی نہ تھے۔ مگر آہستہ آہستہ تین سال کے طویل انتظار کے بعد میری بہنوں کی کوششوں سے دوستوں اور رشتہ داروں کی اچھی بری کاوشوں کے بعد پہلے میری ماں نے ہاں کہا تھا، پھر ابو بھی مان گئے تھے۔ شبانہ کے ماں باپ آخر کب تک نہ مانتے پھر نہ مانتے ہوئے بھی انھیں ماننا پڑ گیا تھا۔ عام طور پر میں نے ضد کا انجام برا ہی دیکھا ہے مگر یہ شاید واحد ضد تھی جس پہ مجھے کبھی بھی ندامت نہیں ہوئی تھی۔ شبانہ ہمارے گھر آتی تھی پھر ہمارے گھر کی ہی ہوگئی تھی۔ ہر کوئی اس سے راضی تھا ہر کوئی اس سے خوش۔ ابو جان تو اسے بہت ہی عزیز رکھتے تھے۔ میں نے سوچا بھی کہ اسے جگا کر بتاؤں مگر پھر اپنا ارادہ ملتوی کرکے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ بھٹکی ہوئی نیند پھر آگئی تھی۔

صبح ابو ٹھیک تھے۔ اخبار پڑھتے ہوئے مجھے کن انکھیوں سے دیکھ کر تھوڑی سی جھینپ کے ساتھ مسکرائے بھی تھے، میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ شام جلد واپس آؤں گا، یہ بوڑھا آدمی زندگی کے پچھتر سال کے بعد کچھ توجہ چاہتا ہے۔ میری دونوں بہنیں مشکل سے کراچی آپاتی تھیں۔ میرا چھوٹا بھائی کینیڈا میں جاکر کھو سا گیا تھا۔ فون آتے تھے مگر وہاں کی زندگی کے اپنے مسائل ہیں۔ پھر اگر شادی بھی وہاں کرلی گئی ہو تو یہاں کے لحاظ سے وہاں کے مسائل کچھ اور ہی الجھ جاتے ہیں۔ میں کئی سال امریکا میں رہ کر یہ سمجھ گیا تھا مگر مجھے پتا تھا کہ امی اور ابو دونوں ہی اسے شدت سے یاد کرتے رہتے ہیں۔

اس دن کے بعد سے میں ان کے اور قریب آگیا تھا۔ رات سونے سے قبل

ان سے مختلف موضوعات پر باتیں کرنے بیٹھ گیا۔ شبانہ یہ سمجھ رہی تھی کہ آخرکار میں نے اس کی بات مان لی ہے اور کچھ وقت ابو کے لیے نکال لیا ہے، میں اور وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے تھے۔ پھر وہ خود ہی بولے، بیٹے گھبراؤ مت میں ٹھیک ہوں۔ بس کچھ ہوگیا تھا میں اپنی آواز پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔

میرا دل جیسے ساکت سا ہوگیا تھا یعنی وہ دھیرے دھیرے چپکے چپکے خاموشی سے نہ جانے کب سے آنسو بہا رہے ہیں۔ ایک بار پھر جیسے میرا دل کٹ سا گیا تھا۔ میں نے ان کا بازو پکڑ کر کہا تھا، ''ابو مجھے آواز دے لیتے۔ مجھے بلا لیتے، کچھ بات کرلیتے کچھ دل بہل جاتا، یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ شبانہ ان کے لیے دودھ کا گلاس لے کر آگئی تھی۔ انھیں سنٹرم کی وٹامن کی گولی دی گئی اور وہ دودھ پی کر سونے کی تیاری کرنے لگے۔

ان کا دروازہ کھلا چھوڑ کر، بتی بجھا کر اور زیرو پاور کی سبز بتی جلا کر ہم دونوں اپنے کمرے میں آگئے۔ بچوں نے کمرے میں سخت دھماچوکڑی مچا رکھی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ اور خوش ہوگئے۔ میں نے سیما کو ایک اوٹ پٹانگ سی کہانی سنائی تھی اور وہ اونگھنے لگی۔ پھر میں نے ساجد، رحمان اور ارم سے پوچھا تھا کہ وہ لوگ دادا جی سے کہانی کیوں نہیں سنتے ہیں؟ وہ ہنسنے لگے۔ شبانہ نے بتایا تھا کہ وہ لوگ تو تقریباً سارا وقت ہی دادا جی کے ساتھ گزارتے ہیں۔ ان کے ساتھ لان پر یا ان کے کمرے میں یہاں تک کہ وہ بھی ان کے ساتھ کارٹون کی فلمیں دیکھتے ہیں۔ میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوا تھا۔

بچوں کے سونے کے بعد شبانہ کو میں نے رات کا واقعہ بتایا۔ وہ پریشان سی ہوگئی۔ روہانسی ہوکر اس نے کہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم ان کی دیکھ بھال اچھی طریقے سے نہیں کرپا رہے ہیں۔ یاخدا، وہ اچھے رہیں ان کا سایہ ہم پر قائم رہے۔ میں نے روتی ہوئی شبانہ کو تسلی دی، مگر وہ بے چین ہوگئی تھی۔ خاموش، روئی روئی سی اور بے حال، پھر تھوڑی دیر بعد ہم دونوں بھی سوگئے۔

رات دو بجے پھر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں آہستہ سے بستر سے اُٹھ کر ابو کے کمرے میں گیا تھا۔ وہ سو رہے تھے۔ ان کی چادر میں نے درست کی، تھوڑی دیر کھڑا

ان کو دیکھتا رہا۔ پھر خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔

دوسرے دن میں سہ پہر کو ہی واپس آ گیا۔ اپنے ساتھ اپنے دفتر کے الیکٹریشن کو بھی لے کر آیا تھا۔ میں نے ایک بذر اپنے کمرے میں لگایا جس کا بٹن ابو کے بستر کے سرہانے لگوا دیا تاکہ اگر انھیں کوئی ضرورت ہو تو وہ ہمیں بلالیں۔ پہلے تو انھوں نے منع کیا، پھر میری ضد کے ہاتھوں مان تو گئے، مگر شاید یہ سوچ کر کہ بٹن دبائے گا کون؟ تم خوش ہولو۔ مجھے تھوڑا سا اطمینان سا ہوگیا تھا۔

رات پھر ہم باتیں کرتے رہے تھے۔ شبانہ بھی تھوڑی دیر ہمارے ساتھ بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی مجھے تھوڑا سا احساس ہوتا تھا کہ جیسے وہ افسردہ ہیں مگر شاید یہ شک کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ رات گئے میں نے شبانہ سے پوچھا تو اس نے بھی یہی کہا تھا کہ اسے بھی لگتا ہے کہ ابو غم زدہ سے ہیں۔ اس رات کو بھی میں آخری پہر میں اُٹھ کر ان کے کمرے میں گیا تھا۔ وہ سو رہے تھے سبز روشنی میں۔ میں مطمئن سا ہو کر اپنے کمرے میں واپس آ گیا تھا۔

اگلے روز میں نے جلال کو فون کیا تھا کہ دوپہر کا کھانا میں اس کے پاس کھاؤں گا۔ جلال میرا بچپن کا دوست اور شہر کا مانا ہوا سائیکاٹرسٹ تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ ڈپریشن کسی بھی آدمی کو کسی بھی وقت ہوسکتا ہے۔ بڑھاپے میں جب آدمی اکیلا سا ہوجاتا ہے تو ڈپریشن کا حملہ ہوسکتا ہے کیوں کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ توجہ سے محروم ہے، گھر کے دوسرے لوگوں کے پاس وقت کم ہوتا ہے جو وہ بوڑھوں کے ساتھ نہیں گزارتے ہیں۔ ''تمھارے والد کو بھی شاید یہی مسئلہ ہے۔ تھوڑا وقت دو ان کو اکاؤنٹینٹ صاحب! بہت ڈالر کمالیے آپ نے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

تھوڑے ہی دنوں میں ہم باپ بیٹے کے تعلقات بدل سے گئے تھے۔ روزانہ میں ان سے باتیں کرتا تھا۔ اکثر شبانہ بھی ساتھ بیٹھی ہوتی تھی، بچے بھی آتے جاتے رہتے تھے، ان کے جھریوں زدہ چہرے کی ایک ایک تفصیل سے آہستہ آہستہ میں آگاہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے پہلے کبھی بھی اتنے غور سے ان کے چہرے کو نہیں دیکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہر جھری میں ایک کہانی ہے۔ ہم لوگ ہر طرح کی باتیں کرتے تھے زیادہ تر باتیں میرے بچپن کے حوالے سے ہوتی تھیں۔ مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ مجھے اپنے

باپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں پتا تھا۔ ان کا بچپن، ان کی جوانی، ان کے ماں باپ، ان کا خاندان یہ سب کچھ میرے لیے ایک خالی صفحہ تھا۔

وہ اور میری ماں ہم لوگوں کو اپنی زندگی کے لمحات بانٹتے رہے تھے۔ محبت دی، پیار دیا، تعلیم کا بندوبست کیا، ہماری ضدوں کے آگے سر جھکاتے رہے، ہماری چھوٹی چھوٹی پریشانیوں کو سلجھانے میں الجھے رہے اور جب ہماری پریشانیوں سے سنبھلے تو ہمارے بچوں کے مسائل میں الجھ گئے۔ ہماری چھوٹی چھوٹی باتوں کی فکر کرتے رہے جو صرف ہمارے مسئلے تھے، بالکل ذاتی مسئلے۔ مجھے اپنی خودغرضی کا شدید احساس سا ہونے لگا تھا۔ میں نے دونوں بہنوں کو فون کر کے کہا تھا کہ وہ تھوڑے دنوں کے بعد وقت نکال کر بچوں کے ساتھ ابو کے پاس آجایا کریں۔ وہ دونوں آتی بھی تھیں ابو کو اپنے ساتھ لے جانا بھی چاہتی بھی تھیں مگر وہ ان کے ساتھ نہیں جاتے تھے۔

زندگی اپنے ہی طریقے سے دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ میرے معمولات میں صرف یہ فرق پڑا تھا کہ میں شام کو جلد از جلد کام ختم کر کے گھر آجانا چاہتا تھا۔ تقریباً ہر رات کے پچھلے پہر میں اٹھ کر ان کے کمرے میں ضرور جاتا تھا۔ انھیں بھی اس کا احساس ہوگیا تھا۔ وہ اپنی چادر اوڑھے سو رہے ہوتے، بلکہ شاید میرے آنے سے قبل اپنی چادر خود ہی درست بھی کر چکے ہوتے تھے۔ مجھے ان کے رونے کی آواز تو نہیں آتی تھی مگر اب مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ ان کے اندر ایک غم ہے، کہیں سے ٹوٹے ہوئے ہیں، باتوں باتوں میں یکایک ایسا لگتا تھا کہ وہ کہیں چلے گئے ہیں، کسی اور دنیا میں، کسی دوسری سڑک پر کسی اور پگڈنڈی پر کسی اور کے ساتھ ان کی شکل روہانسی سی ہو جاتی تھی اور آنکھوں میں آنسو جھلملا اٹھتے تھے۔ گال اور لب ایسے پھڑپھڑاتے تھے کہ جیسے وہ بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پا رہے ہیں۔ میں ان کا ہاتھ پکڑ لیتا تھا پھر وہ مسکرا دیتے تھے۔ ارے کچھ نہیں، پتا نہیں کیا ہوگیا تھا مجھے۔ میں کچھ نہیں کہتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ کیا ہوگیا تھا انھیں امی یاد آتی ہوں گی پینتالیس سالوں کا ساتھ لمبا ساتھ ہوتا ہے۔ مجھے بھرے گھر میں شدید تنہائی کا احساس ہوتا تھا۔ پھر مجھے ان کے چہرے پر اللہ اللہ کے پیار آتا تھا۔ وہ میرے باپ تھے، میری ماں کے شوہر۔ میں سوچتا تھا کہ اوپر والے کا کیا بگڑ جاتا اگر وہ دونوں تھوڑی دیر اور ساتھ ساتھ زندہ رہ لیتے۔ اب تو انھیں فرصت ملی تھی مگر اوپر والے

کے اصول اوپر والا ہی سمجھ سکتا ہے۔

اس رات میں بڑی دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا تھا، اسی وقت کینیڈا سے امجد کا بھی فون آیا۔ وہ بھی کافی دیر ان سے باتیں کرتا رہا۔ وہی معمول کی باتیں، بچوں کی باتیں، گھر کی باتیں، ادھر ادھر کی باتیں۔ پھر شاید اس نے کچھ کہا ہوگا کہ مجھے ایسا لگا جیسے ابو تھوڑے افسردہ سے ہوگئے ہیں۔ فون کی ہزاروں لاکھوں میل لمبی تاروں کے دونوں طرف کے لوگوں پر کیا گزرتی ہے، فون ایجاد کرنے والے نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔ جذبوں کا طوفان، جذبات کی شدت، یادوں کی رقت، رشتوں کا گہرا پن، آنسوؤں کی کسک فون کی یہ تاریں بھلا کیا سمجھتیں ہوں گی۔

فون بند کر کے وہ خاموش سے بیٹھ گئے۔ میں چائے لے کر آیا تھا تو یکا یک وہ سوال کر بیٹھے تھے۔

''تمھاری ماں یاد آتی ہے تمھیں؟'' ایک سوالیہ نشان تھا ان کے چہرے پر۔ میں چونک سا گیا تھا، یہ کیسا سوال ہے؟ کسے یاد نہیں آتی ہے اس کی ماں، مجھے بھی یاد آتی ہے بے تحاشا یاد آتی ہے ان کو میں نے جواب دیا تھا۔

''روتے ہو یاد کر کے انھیں؟'' انھوں نے پھر پوچھا تھا۔ میں جھینپ سا گیا تھا مگر بولا، ''اکثر و بیشتر جب بھی سوچتا ہوں ان کے بارے میں آنسو چھلک جاتے ہیں۔ ابھی تو یہاں تھیں وہ ہمارے پاس کبھی اِس جگہ، کبھی اُس جگہ، کبھی اِس کمرے میں، کبھی اُس کمرے میں، کبھی میرے لیے پریشان، کبھی بچوں کے لیے پریشان کیسے بھول سکتا ہوں میں انھیں۔

وہ دھیرے سے مسکرائے تھے۔ ''مجھے بھی یاد آتی ہے تمھاری ماں، مگر معلوم ہے میں کیوں روتا ہوں۔'' مجھے انھوں نے غور سے دیکھا تھا۔ ''مجھے میری ماں یاد آتی ہے، میں نے انھیں مار ڈالا تھا...''

میں چونک گیا تھا۔ ان کا چہرہ جیسے ڈوب رہا تھا آنکھوں کے چاروں طرف کی لکیروں نے سمٹ کر ان کی نظروں کو اپنے گرفت میں لے لیا تھا۔ تھوڑی دیر رُک کے پھر وہ آہستہ سے بولے تھے ''جب میں پیدا ہوا تھا تو میری ماں مرگئی تھی۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ میری دو بہنیں اور ایک بھائی اور بھی تھے، مجھے تو میری نانی نے پالا تھا۔ ایک دن

میری ایک خالہ نے مجھے بچپن کی شرارت پر ڈانٹا تھا تو مجھے پتا چلا تھا کہ پیدا ہوتے ہی میں نے اپنی ماں کی جان لے لی تھی اور میرے علاوہ میرے تمام بھائی بہن بکھر کر رہ گئے تھے۔ مجھے تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ میرے باپ نے دوسری شادی کرلی تھی۔ سوتیلی ماں نے میری بڑی بہن کی شادی دولت کے چکر میں ایک امیر پاگل سے کردی۔ وہ بھی تین بچوں کو جنم دے کر مرگئی۔ دوسری بہن یکایک مرگئی تھی اور بڑا بھائی گھر سے بھاگا تو پھر کبھی بھی واپس نہیں آیا تھا۔ پتا نہیں زندہ رہا کہ مرگیا۔ اتنی بری پیدائش تھی میری، اتنا منحوس تھا میں... میں کبھی بھی اپنی ماں کو دیکھ نہیں سکا، صرف سوچا ہے ان کے بارے میں۔ وہ میری نانی کی طرح سے ہی ہوں گی۔ ویسی ہی خوب صورت، ویسی ہی مہربان۔ میری نانی نے ہی تمھاری ماں کو تلاش کیا تھا میرے لیے۔ وہ بھی ایسی ہی تھی اور اب اس کے مرجانے کے بعد میں تو بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔" ان کی آنکھیں ڈبڈبا سی گئی تھیں۔ وہ پھر رک رک کر بولے تھے۔ رات کو جب مجھے اپنی ماں یاد آتی ہے تو میں رودیتا ہوں، پھر وہ آتی ہے خوابوں میں، اپنی بانہوں کو پھیلائے، اپنے ہاتھوں کے پیالے سے میرے منھ کو دھلانے، آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے۔ "تم کیوں فکر کرتے ہو۔ مجھے رونے دیا کرو۔" انھوں نے اپنی آنکھیں بندکرلی تھیں، "مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔"

مجھے لگا تھا جیسے پچھتر سال کا بوڑھا بچہ اپنی ماں کی آغوش میں سو رہا ہے۔

ایک دن یکایک وہ مر گئے تھے نہ دل کا دورہ، نہ سر میں درد، نہ کوئی ایمرجنسی، نہ کوئی ہسپتال کیزولٹی۔ سوتے سوتے ان کی جان نکل گئی تھی۔ بڑے دکھے دل کے ساتھ میں نے انھیں دفنایا تھا۔ اب تو ان سے دوستی ہوئی تھی میری۔ اب تو انھیں جانا تھا میں نے۔ اب تو وہ قریب آئے تھے میرے، سب کچھ گیلی مٹی کے ڈھیر میں مل گیا تھا۔

اب بھی رات کو کروٹ بدلتے ہوئے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کوئی رو رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ابو ہوں گے۔ اب سو جائیں گے، روتے روتے، اپنی ماں کی بانہوں میں سکون کے ساتھ۔ پھر میں بھی مسکراتا ہوا گہری نیند میں کھوجاتا ہوں۔

□

اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

عامر بیٹے!

جب تک تمھارا فون نہیں آیا، میں بے قراری کی حالت میں رہا۔ تمھارے جہاز کے بارے میں عجیب وغریب خیالات دماغ میں آتے رہے۔ کبھی کچھ سوچتا تھا اور کبھی کچھ۔ عابد کی موت کے بعد سے تمھاری ماں کی نڈھالی نے مجھے بے بس سا کردیا ہے مگر تمھارے فون کے بعد ایک بار پھر تمھاری ماں کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر سی آئی، مگر پھر وہی بے چارگی، وہی بے اطمینانی اور پھر وہی دھواں سا چہرہ اور آنسوؤں کی لڑی۔ نہ جانے وہ کب تک روتی رہیں گی، نہ جانے ہم سب کب تک روتے رہیں گے؟

پچیس سال کی عمر مرنے کی تو نہیں ہوتی ہے، ابھی تو صرف خواب بنتے ہیں، آرزوئیں جگتی ہیں، موت کے بارے میں اور ایسی موت کے بارے میں کون سوچتا ہے؟ مگر ہم سب کو سوچنا پڑ گیا مجھ کو، تمھاری ماں کو، تم کو، نسیم کو، شہلا کو، نازیہ کو اور ہمارے سارے خاندان کو۔ خدا نے مجھے نہ جانے کس گناہ کی یہ سزا دی ہے؟

میں یہ سمجھتا تھا کہ سارے بچوں میں، میں تم کو سب سے زیادہ چاہتا ہوں۔ یہ سوال کسی نے اٹھایا نہیں لیکن پھر بھی کبھی کبھی ذہن میں، دل میں کہیں پر تم سب سے اوپر ہوتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب زندگی کا سفر شروع ہوا تھا اور کراچی

کے نئے نئے شہر میں مصیبتوں، تکلیفوں اور غربت میں تو مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا کہ میں تمھیں وہ سب کچھ نہیں دے سکا جو تمھارے دادا نے مجھے دے دیا تھا۔ مشکل کی اس زندگی میں صرف تمھیں پیار ہی دے سکا۔ وہ بھی ایسا کہ اس کا اظہار بہت نمایاں نہیں تھا اور نہ اس کا وقت مل سکا تھا۔ تم بڑے تھے اور سب سے زیادہ عزیز تھے۔ تمھارے پانچویں کلاس کے امتحان سے لے کر میٹرک، انٹر اور انجینئرنگ کالج میں داخلے تک ہر ہر لمحہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔

جب تم انجینئر بن گئے اور امریکا چلے گئے تو بہت دنوں تک بہت بے قرار سی زندگی رہی۔ مجھے پتا تھا کہ تم مشکل میں ہو۔ کہیں نہ کہیں سے پتا چل ہی جاتا تھا۔ لوگوں نے، تمھارے دوستوں نے ہی بتایا تھا کہ شروع کے دن بڑے خراب ہوتے ہیں۔ کبھی ڈپارٹمینٹل اسٹور میں کام کرنا پڑتا ہے، کبھی پیٹرول پمپ پر اور کبھی ٹیکسی ڈرائیوری بھی کرنی ہوتی ہے۔

پھر نیویارک سے پاکستانی ٹیکسی ڈرائیوروں کے قتل ہونے کی خبر آتی تھی تو میں بے چین ہوکر تمھارے فون کا انتظار کرتا تھا۔ شکاگو سے کسی پاکستانی کے مرنے کی خبر آتی تھی تو نہ جانے کس کس طرح سے اسے میں تم سے منسلک کردیتا تھا کہ تم شاید کسی دوست کے ساتھ وہاں چلے گئے ہوگے، پھر خدانخواستہ ایسا ہوگیا ہوگا، ویسا ہوگیا ہوگا۔ امریکا، لندن، سعودی عرب، جرمنی ہر جگہ سے پاکستانیوں کی کسی حادثے میں، کسی جرم میں مرنے کی خبر آتی تھی اور میں سوچتا تھا کہ چلو میرا تو ایک ہی بیٹا امریکا میں ہے، باقی سب تو یہاں خیر سے ہیں۔ پھر نسیم ابوظہبی چلاگیا تھا تو اس کے بارے میں بھی ایسے ہی خیالات آتے رہتے، پریشان کرتے رہتے تھے۔ تم لوگوں کے خط فون آتے رہے، تم لوگ دیارِ غیر میں زندہ سلامت رہے اور یکایک عابد کی موت کراچی میں ہوگئی۔ وہ ہمارے ساتھ تھا اور ہم اس کی حفاظت نہیں کرسکے۔ خدایا میں مرجاتا، اس جوان کو مارنے کی کیا ضرورت تھی۔

تم سب لوگ جمع ہوگئے، پورا خاندان سہارا دینے کے لیے آگیا، پورا محلّہ کاندھا دینے کے لیے جمع ہوگیا۔ سب لوگوں کا پیار، اداس چہرے، جھکی نگاہیں، کوئی بھی اسے واپس نہیں لاسکا۔ میری تو جیسے کمر ٹوٹ کر رہ گئی ہے۔

تمھارا ابو

نسیم بیٹے!

خدا تمھیں جہاں رکھے، خوش رکھے۔ میں اس کے علاوہ اور کیا دُعا مانگ سکتا ہوں۔ میری نظروں کے سامنے عابد مر گیا، اس قدر دردناک موت۔ نہ جانے میں نے کیا کیا تھا، کس کو ناخوش کیا تھا، کس کا دل توڑا تھا، کس کی بددعا لگی ہے، میں تو ساری زندگی اپنے تئیں ایمان داری سے کام کرتا رہا، بہت کچھ نظروں کے سامنے ہوا، بہت کچھ لوگوں نے کرنے کو کہا اور بہت کچھ میں کر بھی سکتا تھا، مگر خدا کا ڈر مجھے روکتا رہا اور خدا گواہ ہے کہ اپنے اختیار کا کبھی بھی کوئی ناجائز فائدہ میں نے نہیں اُٹھایا اور نہ ہی اٹھانے دیا۔ پچاس ہزار روپے کی رشوت جو تھانے میں عابد کو چھڑانے کے لیے جمع کرائی تھی وہی میری زندگی کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ تمھاری ماں کی روتی صورت، اہل محلہ اور تمھارے چچا جان کی رائے سے مجبور ہو کر میں نے یہ کیا تھا۔ شاید خدا نے اس کی ہی سزا مجھے دی ہے۔ کاش کہ یہ بھی میں نے خدا پر ہی چھوڑ دیا ہوتا۔ کس کس طرح سے نوازا تھا اس نے مجھے۔ میرے جیسے غریب آدمی کے سارے ہی بچوں کو تعلیم مل گئی۔ حلال کے پیسوں سے، میں نے اپنا مکان بنا لیا۔ بچیوں کی شادی اچھے لڑکوں سے ہوگئی، زندگی آرام سے ہی گزر رہی تھی، سب کچھ ٹھیک ہوگیا، تو مجھے اتنا بڑا گناہ کرنا پڑ گیا، اس کی اتنی بڑی سزا بھی مجھے مل گئی۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ مالک میرے اس بچے کا کیا قصور تھا؟ اس کی تو ابھی مسیں بھیگی تھیں، ابھی تو اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ یہ کیا ہوگیا؟ یہ کیا ہوگیا؟ کیا ہوجاتا اگر وہ کچھ اور دن زندہ رہ لیتا... اس کی بھی شادی ہوتی، اس کے بھی بچے ہوتے۔ عام سی زندگی گزار کر وہ عام لوگوں کی طرح مر جاتا ایک فطری عمر گزارنے کے بعد۔ کس کی نظر کھا گئی اسے؟ جان دینے والے نے جان لیتے ہوئے مجھ بوڑھے کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ مالک تو ہی سمجھ سکتا ہے اپنے اصول، میں تو جیتے جی مر چکا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کیا کروں؟

تمھارا ابو

نازیہ!

شہلا ابھی تک یہاں ہے، تین دفعہ اس نے جانے کا پروگرام بنایا مگر پھر رُک گئی۔ احمد تو بچوں کو لے کر تمھارے سامنے ہی چلے گئے تھے۔سب کا اسکول ہے

سب کے کام ہیں، زندگی تھوڑی رک جاتی ہے۔ ہزاروں عابد بھی مرجائیں تو کون کسی کے لیے رکتا ہے، یا کون کسی کے لیے رکا ہے، زندگی کا کاروبار تو چلتا ہی رہتا ہے، اسے چلتے ہی رہنا چاہیے۔ شہلا تمھاری ماں سے بہت قریب ہے اور میرے خیال میں یہ دونوں عورتیں عابد سے ہم سب سے زیادہ محبت بھی کرتی تھیں۔ ان دونوں کے آنسو رکتے ہی نہیں ہیں۔ شہلا بے چاری اپنے بچوں کا سوچ سوچ کر پریشان ہوتی ہے اور جانے کا پروگرام بناتی ہے۔ لیکن تمھاری ماں کی نڈھال حالت دیکھ کر اس سے جایا بھی نہیں جاتا ہے۔ سلمیٰ بڑی ہے، سب کو دیکھ رہی ہوگی اور خود احمد بھی بہت اچھے ہیں مگر کب تک۔ عابد کی موت نے تو سارا نظام ہی خراب کرکے رکھ دیا ہے۔ تم ابھی دس دن ہی ہوئے ہیں کہ گئی ہو لیکن اگر ایک ہفتے کے لیے آجاؤ تو بہت اچھا ہوگا۔ تمھاری موجودگی میں شہلا گھر چلی جائیں گی پھر تم بھی چلی جانا۔ زندگی کا کاروبار تو چلانا ہی ہوگا۔ شہلا کا اپنے گھر جانا ضروری ہے۔ اس کے بچے بہت پریشان ہو رہے ہیں۔ بار بار احمد کا فون بھی آ رہا ہے۔

مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میری عمر ہزاروں سال کی ہوگئی ہے۔ اتنا بڑا تو میں نے کبھی بھی اپنے آپ کو محسوس نہیں کیا تھا۔ عجیب دنیا ہے، عجیب نظام ہے، بچے مرجاتے ہیں، بوڑھے مزید بوڑھے ہی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ خودکشی حرام ہے، موت کی دعا مانگنا حرام نہیں ہے۔ دعا کرو اس عذاب سے جلد چھٹکارا مل جائے۔ اب کسی کام میں دل نہیں لگتا ہے۔

تمھارا ابو جانی

عامر!

کل نازیہ آگئی، کہہ رہی ہے کہ تین ہفتے رہے گی۔ یہ بڑا اچھا ہوگیا۔ اب میں شہلا کو کہوں گا کہ اپنے گھر چلی جائے، بچے اکیلے بور ہوگئے ہوں گے، احمد آفس بھی دیکھ رہے ہوں گے اور گھر کے کام میں بھی الجھ رہے ہوں گے۔ آخر کب تک؟ انسان تھک جاتا ہے۔

تمھاری امی کی طبیعت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا ہے، تمھارا فون آتا ہے تو فون کے بعد پھر رونا شروع کردیتی ہیں، عابد کا کوئی دوست، کلاس فیلو آتا ہے یا کسی

کی خبر آتی ہے تو بھی بے قرار ہوکر رونا شروع کردیتی ہیں، نہ جانے کس کیے کی سزا ملی ہے ہم لوگوں کو۔ اس عمر میں اس عذاب سے گزرنا۔ نہ میں نے سوچا تھا نہ میں یہ deserve کرتا ہوں۔

عابد یکایک غائب ہوگیا تھا، تین دن کے بعد خبر ملی تھی کہ وہ تھانے میں ہے، ہم لوگ پریشان اور ہراساں تھانے پہنچے تو دیکھا کہ عابد اور ارسلان دونوں ہی بند ہیں، ارسلان کو تو تم جانتے ہی ہو۔ ہمارے محلے کا پرانا لڑکا ہے۔ عابد کا پرانا دوست بھی ہے۔ بچپن سے ساتھ تھا دونوں کا۔

تھانے دار نے بتایا کہ رات کو دونوں کو اسکوٹر پر پکڑے گئے ہیں اور دونوں ہی اسلحے سے لیس تھے۔ مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ عابد اس طرح کے کسی معاملے میں کیسے ملوث ہوسکتا تھا؟ اُس کا اسلحہ سے کیا تعلق، وہ کیسے ان دھندوں میں جاسکتا ہے؟

ہماری بڑی کوششوں کے باوجود انھیں رہا نہیں کیا گیا۔ عدالت نے پولیس کو ریمانڈ دے دیا تھا، اور ضمانت بھی نہیں ہوسکتی تھی۔

پولیس والے تو عجیب طرح کی باتیں کررہے تھے کہ عابداور ارسلان دونوں دھماکوں، قتل اور اغوا میں ملوث ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ ہماری سوچ نے کام بند کردیا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے عابد سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔ نہ کوئی خاص بات کی اور نہ کوئی جواب دیا۔ گھنٹوں ہم لوگ تھانے میں بیٹھے رہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کریں اور کس طرح سے کریں؟

بیٹے! کراچی میں تو نوکریاں بڑی مشکل سے مل رہی ہیں۔ شہر کے حالات ایسے ہیں کہ پرائیویٹ کام بند ہوتے چلے جارہے ہیں ، ساتھ میں پرائیویٹ نوکریاں بھی ختم ہوتی جارہی ہیں۔ سرکاری نوکریوں میں تو کراچی کا جتنا کوٹہ ہے اس کا تو تم کو پتا ہی ہے، اگر نوکریاں مل رہی ہوتیں تو تم امریکا کیوں جاتے؟ نسیم کیوں گھر بار چھوڑ کر نکل جاتے؟ یہ تو نظام ہی خراب ہوگیا ہے۔ ایسے میں بچوں کو سمجھانا بڑا مشکل ہے۔ لگتا ہے عابد اور ارسلان بھی بے روزگاری سے تنگ آکر الٹے سیدھے کاموں میں لگ گئے تھے۔

مگر الٹے سیدھے کاموں کی عابد کو کیا ضرورت تھی؟ کیا کمی تھی اس کو۔ گھر

تھا، ہم سب محبت کرنے والے خاندان کے لوگ تھے۔ کبھی پیسوں کی کمی نہیں ہونے دی تھی اسے۔ جو اس نے چاہا تھا اسے ملا تھا۔ تکلیف تو تم نے اُٹھائی تھی۔ مسائل کا شکار تو تم ہوئے تھے۔ تم نے گولی نہیں چلائی اور عابد ان چکروں میں پڑ گیا۔

کراچی کیسا شہر ہوگیا ہے؟ بچے باپ سے چھپتے ہیں اور والدین کو پتا نہیں ہوتا ہے کہ ان کے گھروں میں ہی آگ لگی ہوئی ہے۔

مزید بعد میں لکھوں گا، اب تو خط لکھنے سے بھی تھک جاتا ہوں۔ اپنا خیال رکھو۔ ہم سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔

تمھارا ابو

آپا اور دولھا بھائی!

آپ دونوں خوش رہیں، آپ دونوں کے خط ملے، میں معافی چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کو خبر تک نہیں کرسکا کہ گھر پر کیا حادثہ گزر گیا ہے۔ عابد کی موت اتنی یکا یک ہوئی کہ ہم سب لوگوں کے ہوش اڑ گئے تھے۔ دن گزر جانے کے باوجود ابھی تک فاطمہ کا برا حال ہے اور اس عالم میں نہ میں خط لکھ سکا اور نہ فون کر سکا۔

ہندوستان فون کرنا تو ویسے بھی آسان نہیں ہے، پھر سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی کہ کس منھ سے فون کرکے آپ لوگوں کو بتاؤں کہ عابد مرگئے ہیں۔ آپ لوگوں نے تو عابد کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ ہم لوگ جب بلند شہر آئے تھے، اس وقت عابد پیدا نہیں ہوئے تھے۔ وہ بڑا جوان لڑکا تھا دولھا بھائی۔ ہر وقت ہنسنے ہنسانے والا، اچھے نمبروں سے امتحانات پاس کیے تھے اس نے، اور نوکری تلاش کر رہا تھا۔ نوکریوں کا تو آپ کو پتا ہے۔ اچھی نوکریاں نہ وہاں ملتی ہیں اور نہ یہاں ملتی ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ عابد تھوڑا کمپیوٹر وغیرہ سیکھ لیں تو پھر انھیں بھی عامر کے پاس امریکا بھیج دوں گا یا مڈل ایسٹ میں کہیں نوکری مل جائے گی۔ ایک دفعہ مہاجر ہوگئے تو مہاجر ہوگئے، مڈل ایسٹ ہو کہ امریکا ہو! بلند شہر چھوٹ گیا تو پھر کوئی بھی شہر ہو، اجنبی ہی ہوگا۔

میں گزشتہ دنوں بار بار سوچتا رہا کہ آپ کے ابو نے شاید صحیح فیصلہ کیا تھا کہ بلند شہر چھوڑ کر پاکستان نہیں آئے۔ وہاں اگر مسلمان کا قتل ہوتا ہے تو کم از کم مسلمانوں

کے ہاتھوں سے تو نہیں ہوتا ہے۔ کافر مارتے ہیں، ہندو مسلمان کو اور مسلمان ہندو کو۔ مسلمان کے ہاتھوں مسلمان صرف پاکستان میں ہی مارے جاتے ہیں۔ نہ جانے میں کیا کیا کچھ لکھتا چلا جارہا ہوں۔ آپ لوگوں کے پیار بھرے خط کا بہت شکریہ۔ ہم دونوں نے آپ کا خط بار بار پڑھا ہے اور بار بار روئے ہیں، بار بار پڑھتے ہیں، بار بار روتے ہیں، دعاؤں میں یاد رکھیں۔ اور دعا کریں کہ ہمیں صبر آ جائے۔

آپ کا چھوٹے میاں

رضی خوش رہو!

تمھارا خط ملا، سعودی عرب بھی خبر پہنچ گئی کہ عابد قتل ہوگئے ہیں۔ تمھاری محبت، تمھاری تعزیت کا بہت شکریہ، رضی صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے مگر صبر کرنا کتنا مشکل ہے، اس کا اندازہ تم نہیں لگاسکتے ہو۔ خدا نہ کرے کہ اس صورت حال کا کسی دشمن کو بھی سامنا کرنا پڑے۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ صبر کی تلقین کرنا کتنا آسان ہے اور صبر کرنا کتنا مشکل۔ اس کا اندازہ صرف صبر کرنے والے ہی لگاسکتے ہیں۔

کبھی کبھی مجھے اتنا شدید غصہ آتا ہے کہ تم اندازہ نہیں کرسکتے ہو، جی کرتا ہے کہ سارے پولیس اسٹیشنوں کو آگ لگادوں، ساری سیاسی جماعتوں کے آفسوں کو آگ لگادوں، ان کے لیڈروں کو پھانسی پر چڑھادوں۔ مگر دل کا کیا ہے، غصے میں اس طرح کی باتیں کرنے سے ہمارا عابد تو واپس نہیں آئے گا نا... جو چلا گیا سو چلا گیا۔ اب اس درد اور اس غم کے ساتھ زندگی کا عذاب سہنا ہی ہوگا۔ ہم کو نہ جانے کب تک زندہ رہنا ہی ہوگا۔

نہ جانے کیا ہوگیا ہے ہم کراچی والوں کو۔ سارا ملک کراچی میں آ کر کماتا تھا۔ سرکاری نوکری پہلے کب ملتی تھی مہاجروں کو۔ اس پر تو پنجابیوں کا ہی قبضہ تھا، اب سندھیوں کا ہے، مگر کم از کم پرائیویٹ نوکریوں پر مہاجر ہی ہوتے تھے، چاہے پاکستان ٹوبیکو ہو، گلیکسو ہو، لیور برادرز ہو یا جنرل ٹائر، مگر اب تو ان جگہوں پر بھی مہاجروں کو نوکری نہیں ملے گی کیوں کہ گزشتہ دس برس میں کراچی کا تعلیمی نظام بھٹو، ضیاء الحق اور اب ایم کیو ایم کی وجہ سے بالکل ہی تباہ و برباد ہوگیا ہے۔ نہ اسکولوں میں پڑھانے والے ہیں، نہ یونی ورسٹیوں میں تعلیم ہے اور تو اور ابھی اخبار میں چھپا تھا کہ

ڈاؤ میڈیکل کالج کے امتحانوں میں بھی خوب گھپلے ہو رہے ہیں اور وہاں کے پروفیسر بھی سیاسی بنیادوں پر لوگوں کو پاس کر کے ڈاکٹر بنا رہے ہیں، تعلیم سے تو ہم لوگ گئے ہی تھے، اب ایسے ڈاکٹر بھی کراچی کے لوگوں کا علاج کریں گے۔ میں تو اب صرف امان، امان باللہ کی ہی دعا مانگتا ہوں۔

رضی پیارے! عابد بڑا اچھا لڑکا تھا۔ ابھی تو بس جوان ہی ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں چمکی تھیں، دل دھڑکا تھا۔ ابھی تو اس نے وہ سب مزے بھی نہیں کیے تھے جو ہم نے اپنی جوانی کے دنوں میں کراچی میں کیے تھے۔ یاد ہے کلفٹن کا میلہ، سینڈز پٹ پر رات، ہالی جی لیک پر دن بھر ستانا اور تاش کھیل کر، خریدی ہوئی مچھلی لے کر گھر آنا۔ عیدگاہ کی مارکیٹ میں راتوں کو قوالی سننا۔ کراچی کے سینما گھروں میں فلم دیکھنا۔ مجھے ابھی تک تمہارے ساتھ پیلس سینما جو میٹروپول ہوٹل کے ساتھ تھا جہاں ہم دونوں نے "Shock Corridor" دیکھی تھی اور نشاط سینما میں فلم ''ارمان'' دیکھی تھی اور وہ گانا ''اکیلے نہ جانا مجھے چھوڑ کر تم'' گنگناتے رہے تھے۔ وہ سب ختم ہوگیا ہے اور جو کچھ اس شہر میں رہ گیا تھا وہ بھی اب عابد کے چلے جانے کی وجہ سے نہ اچھا لگتا ہے نہ بھلا لگتا ہے۔ پورا شہر جیسے Shock Corridor میں بدل گیا ہے اور وہ ہم سب کو اکیلا چھوڑ کر قتل ہوجانے والے سیکڑوں مہاجر، پنجابی، سندھی، کراچی کے بچوں کے مجمعے میں کھو گیا ہے۔

کیا سوچا تھا، کیا ہوگیا رضی۔ فاطمہ کا رو رو کر برا حال ہے۔ راتوں کو جاگتی رہتی ہے۔ خدانخواستہ اسے کچھ ہوگیا تو میں کیا کروں گا؟ تمہارے پیار بھرے خط کا شکریہ۔

تمہارا دوست اکبر علی

سرفراز!

ہمیشہ خوش رہو۔

تمہاری باجی کچھ سنبھلی ہیں مگر ابھی بھی برا حال ہے۔ تم نے بار بار فون کیا تمہارا بہت شکریہ۔ مجھے پتا ہے کہ کینیڈا سے فون کتنا مہنگا ہوتا ہے۔ شاید عام حالات میں، میں تم سے یہ التجا کرتا بھی نہیں مگر بہت مجبوری کی حالت میں تم سے استدعا کرتا

ہوں کہ اگر ہو سکے تو تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی، ہفتے میں ایک دو دفعہ اپنی باجی کو ضرور فون کرلو۔

تمھیں تو پتا ہے ان کو تم سے کتنا لگاؤ ہے! اپنے بچوں سے زیادہ نہیں تو اتنا ہی تمھیں بھی پیار کرتی ہیں۔ تمھاری چھوٹی چھوٹی باتوں کو بار بار بتانا، بچوں کو بار بار سرفراز ماموں کے بچپن کے کارنامے سنانا اور نہ جانے کیا کیا کچھ تم سے منسوب کیا ہوا ہے فاطمہ نے۔ تمھارے بڑے بھائی تو آتے ہی رہتے ہیں اور باقی لوگوں نے جس طرح سے اس غم کے موقعے پر میرا ساتھ دیا ہے اس کی تو کوئی مثال بھی شاید نہیں ہوگی۔ مگر نہ جانے کیوں فاطمہ نے اس نقصان کو مستقل طور پر اپنی جان سے لگا لیا ہے۔

خط لکھتے رہنا اور فون بھی کرتے رہنا۔ تمھیں شاید اندازہ بھی نہ ہو کہ تمھارے فون کتنے اہم ہیں۔

تمھارا دولھا بھائی

شہلا!

ہمیشہ سکھی رہو، اور خدا تمھیں ہر خوشی سے مالا مال کرے۔

مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی۔ عابد کے کمرے میں جاکر عابد کے کچھ پرانے کپڑے اٹھا کر باہر لے جانے لگا تو تمھاری امی نے بھی دیکھ لیا، انھوں نے آ کر اتنی شدت سے میرے ہاتھوں سے کپڑے چھین لیے کہ تم اندازہ بھی نہیں کرسکتی ہو۔ میں وہ کپڑے باہر کسی فقیر کو دینا چاہ رہا تھا۔ فاطمہ نے چیخ چیخ کر اپنا اور میرا حال برا کردیا، ''تم بھی یہ سمجھنے لگے ہو کہ وہ مرگیا ہے۔ وہ نہیں مرا ہے، وہ واپس آئے گا۔ اسی گھر کے اسی کمرے میں، اسی بستر پر، اپنی پینٹ قمیص میں ہی سوجائے گا۔ میں جگاؤں گی اسے۔ شلوار قمیص دوں گی اور تم اس کے کپڑے بانٹ رہے ہو۔''

شہلا! میں ایک اور صدمے میں چلا گیا ہوں، بیٹے کی موت کے ساتھ ساتھ فاطمہ بھی اس غم سے ختم ہو رہی ہے۔ تمھاری ماں نے ابھی تک اس کی موت کو قبول نہیں کیا ہے۔ سارے گھر میں کچھ بھی ہو رہا ہو وہ عابد کے کمرے میں روزانہ خود سے صفائی کرتی ہیں، اس کے بستر کو صحیح کرتی ہیں، اس کے کپڑے دوبارہ تہہ کرتی ہیں، اس کے باتھ روم کو اپنے ہاتھوں سے دھوتی ہیں۔ اس کے بستر پر بیٹھ کر ہنس دیتی ہیں اور

اس کی کرسی پر بیٹھ کر گھنٹوں ٹکٹکی باندھے اس کے خالی بستر کو تکتی رہتی ہیں۔ شام کو دروازے کی ہر دستک پر ایسے کھڑی ہوجاتی ہیں جیسے عابد دروازے کے باہر کھڑے ہیں۔

میں نے فاطمہ کو بہت سمجھایا مگر ان کا غصہ کم نہیں ہوا۔ انھیں میں نے الماری کھول کر دکھائی کہ دیکھو عابد کی ہر چیز محفوظ ہے، ویسی کی ویسی۔ وہ وہیں بیٹھ گئی تھیں پھر کہنے لگیں آخر اتنے دن ہوگئے عابد آیا کیوں نہیں ہے؟ پھر وہ عابد کی تصویر کو چوم چوم کر روتی رہیں، نہ جانے کس طرح سے میں اپنے آنسوؤں کو پیتا رہا۔

تمھاری دوست رعنا جو سائیکاٹرسٹ ہیں، میں ان کے کلینک میں چلا گیا تھا۔ بڑے اخلاق سے ملیں۔ انھیں عابد کی موت کا کچھ پتا نہیں تھا۔ میں نے بتایا، اسی شام کو وہ خود ہی گھر آگئیں۔ بہت دیر تک تمھاری امی سے باتیں کرتی رہیں۔ مجھے انھوں نے کہا ہے کہ فاطمہ سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ عابد اور عابد کے دوستوں، اس کی عادتوں، اس کی شرارتوں، اس کے بچپن کے قصے، جتنی بھی اور جو بھی بات کرنا چاہتی ہیں، ان سے بات کریں۔ رعنا نے ایک دوا بھی دی ہے جس کے بعد سے تمھاری امی کافی سکون میں ہیں۔ میں پہلے کوشش کرتا تھا کہ عابد کے بارے میں کچھ بات نہ کروں، تاکہ وہ آہستہ آہستہ بھول جائیں مگر میرا یہ خیال غلط تھا۔ جب میں اسے نہیں بھول سکتا ہوں تو تمھاری امی کیسے بھولیں گی؟ رعنا نے بڑی اچھی باتیں بتائیں اور بہت محبت سے تمھاری امی کو دیکھا ہے، شکریے کا ایک خط میری جانب سے ضرور لکھ دینا۔

اُمید ہے کہ تم اور بچے ٹھیک ہوگے۔ جب بھی موقع ملے اور فرصت ہو تو بچوں سمیت ہی کچھ دنوں کے لیے آجانا۔

تمھارا ابوجان

عامر بیٹے! خوش رہو۔

تم فون پر بار بار پولیس کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ بیٹے پولیس کیا کرے گی؟ پولیس کی ہی وجہ سے تو سب کچھ ہوا ہے۔ تمھارے امریکا کی پولیس شاید مجرموں کو پکڑتی ہوگی، یہاں کراچی میں بھی مجرموں کو ہی پکڑتی تھی... تھا ایک ایسا وقت

، اب تو ایسا نہیں ہے۔ کراچی کے تھانے نیلام ہوتے ہیں اور تھانے دار اور پولیس والوں کی مرضی سے جرائم ہوتے ہیں۔ جتنی ان پولیس والوں کی تنخواہ ہوتی ہے، اس تنخواہ میں تو گزارہ ممکن نہیں ہے۔ گزارے کے لیے یہ لوگ مجرموں کو پیسے لے کر پناہ دیتے ہیں، ڈکیتیوں میں شامل ہوتے ہیں اور جرائم کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔ کراچی میں پولیس سے آنکھ مچولی چل رہی ہے۔ جہاں لوگوں کو موقع لگتا ہے وہ پولیس والوں کو مار دیتے ہیں، جہاں پولیس والوں کا بس چلتا ہے وہ مقابلے میں مہاجر لڑکوں کی موت دکھادیتے ہیں۔ پچھلے دنوں پی آئی بی کالونی، لیاقت آباد، ناظم آباد، اورنگی ہر جگہ پولیس والوں کی لاشیں ملی ہیں اور ساتھ میں ہی علاقے کے لڑکوں کی موت بھی واقع ہوئی ہے۔ ایسے میں پولیس کیا کرے گی بیٹے؟ سارا نظام ہی الٹا ہو کر رہ گیا ہے۔ جن بچوں کو کرکٹ کھیلنا چاہیے وہ گولیاں چلا رہے ہیں، جن پولیس والوں کو جانوں کی حفاظت کرنا چاہیے وہ لوگوں کی جانیں لے رہے ہیں۔

میں تو پولیس والوں کو رشوت دینے کے حق میں تھا بھی نہیں۔ میرا خیال تھا کہ اگر عابد اسلحے کے ساتھ گرفتار ہوئے ہیں تو ان پر قانون کے مطابق ہی مقدمہ چلے گا۔ پھانسی تو نہیں دی جائے گی ناں۔ انھوں نے کون سا قتل کیا تھا مگر فیصلہ یکایک کرنا پڑ گیا تھا۔ دوسرے دن ہی ارسلان کی موت کی خبر آئی تھی۔ تھانے میں ہی وہ مر گیا تھا۔ پولیس والوں نے کہا تھا کہ اس نے خودکشی کرلی ہے اور ہم سب کو پتا تھا کہ اس پر تشدد کیا گیا تھا۔ پولیس والوں نے بہت سارے قتل اور اغوا کے الزامات اس پر لگائے تھے اور اس کی ہی تحقیقات چل رہی تھیں۔

پھر تھانے کا ایک آدمی گھر آیا تھا کہ اگر پچاس ہزار رشوت دی جائے تو عابد رہا ہو سکتے ہیں۔ پولیس مزید پریشان نہیں کرے گی، سب لوگ ارسلان کی موت سے بری طرح سے ڈر گئے تھے، تمھاری امی نے رو رو کر اپنے آپ کو ہلکان کر لیا تھا۔ مجھے یہ راستہ صاف نظر آیا تھا اور زندگی میں پہلی دفعہ میں نے رشوت دے کر عابد کو رہا کرایا تھا۔

عابد رہا ہوکر خوش نہیں ہوئے تھے، ڈرے ڈرے سے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان پر ارسلان کی موت کا کافی اثر ہوا ہے، آخر ارسلان ان کا بچپن کا دوست تھا۔ محلے

کے اچھے شریف لڑکوں میں اس کا شمار ہوتا تھا، یکایک موت سے تو آدمی ہل ہی جاتا ہے۔ وہ بھی کسی بچپن کے دوست کی موت جس کے ساتھ بچپن اور جوانی کے دن گزرے ہوں، راتیں بتائی ہوں۔

عابد تو رہا ہونے کے بعد سے گھر سے باہر نکلے ہی نہیں تھے، اپنے کمرے میں خاموش نہ جانے کیا کرتے رہتے تھے۔ تیسرے دن کئی دفعہ ان کے لیے فون بھی آئے جو انھوں نے سنے تھے اور لگا تھا جیسے تھوڑے غصے میں آگئے ہیں اور کچھ ڈرے ڈرے سے بھی ہیں۔ اسی رات گھر میں کچھ لوگوں نے گھسنے کی کوشش کی تھی۔ مگر محلے والے جاگ گئے اور وہ لوگ اپنی گاڑیوں میں فرار ہوگئے تھے۔

دوسرے دن صبح صبح عابد نے جلدی جلدی کچھ فون کیے اور کچھ کہے بغیر گھر سے چلے گئے کہ وہ تھوڑے دنوں کے بعد آئیں گے اور بتائیں گے کہ مسئلہ کیا ہے؟ تمھاری امی نے ڈانٹا بھی مگر وہ رکے نہیں تھے، ان کے کوئی دوست گاڑی لے کر آئے تھے اور وہ اس کے ساتھ نکل گئے تھے۔

بیٹے! میں تو سیدھا سادا آدمی ہوں، زندگی سے بہت کم امیدیں باندھی تھیں اور شاید امید سے زیادہ ہی کامیابیاں مل گئی تھیں۔ اچھی خاصی نوکری تھی، اچھے بچے تھے، سب نے تعلیم حاصل کرلی تھی، سب ہی محنتی اور کام کے شوقین تھے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا تھا، کسی سے کوئی شکایت تھی نہ کسی کو شکایت کا موقع دیا تھا، مگر نہ جانے کیوں یہ سب کچھ ہوگیا ہمارے ساتھ۔ نہ جانے عابد کن مسائل میں الجھ کر رہ گیا۔ مجھے آج تک پتا نہیں چلا کہ اس رات کیا ہوا تھا؟ کون تھے وہ لوگ جو رات کو آئے تھے۔ کن لوگوں کو عابد نے فون کیا تھا اور کن لوگوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا تھا۔

مجھے پتا ہوتا کہ ایسا ہوجائے گا تو میں اسے جانے تھوڑی دیتا۔ وہ ضدی تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ میری ضد کے آگے نہ رکتا۔ میں نے زندگی میں اس کی ساری ضدیں پوری کی تھیں۔ یہ نہیں چاہیے وہ چاہیے اور صرف وہ چاہیے اور اسے وہی دلایا گیا تھا۔ اس اسکول میں نہیں پڑھنا ہے، پھر وہ اس اسکول میں پڑھا بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر نہیں بننا ہے، پھر ڈاکٹر بنا بھی نہیں تھا، میری مرضی اور میری ضد کے خلاف۔ تمام

زندگی میں نے اور تمھاری ماں نے اس کی ضدیں پوری کی تھیں اگر میں بھی ضد کرتا تو کیا وہ رکتا نہیں؟ نہیں اسے رکنا پڑتا، کاش میں نے ضد کی ہوتی۔ کاش میں نے اسے روک لیا ہوتا، آج وہ زندہ ہوتا، ہم سب کے درمیان۔

میں الجھ کے رہ گیا ہوں۔ خط بھی نہیں لکھا جارہا۔ پھر لکھوں گا۔ جتنا لکھتا ہوں اتنے خیالات آتے ہیں، جتنے خیالات آتے ہیں اتنا ہی سوچتا ہوں اور جتنا سوچتا ہوں اتنا ہی پریشان ہوتا ہوں۔ خدا ہی خیر کرے اب تو۔

تمھارا ابو

آپا اور دولھا بھائی!

کاش میں آپ لوگوں کے پاس آسکتا۔ آپ کے خط کے بعد دل میں ایک ہوک سی اٹھی، بے قرار سا ہوگیا، دل یہ چاہا کہ ابھی ٹرین پکڑ کر لاہور، لاہور سے دلّی پھر دلّی سے بلند شہر پہنچ جاؤں۔ اسٹیشن سے تانگے پر بیٹھ کر سیدھا آپ لوگوں کے پاس پہنچ جاؤں۔ آپ سے گلے ملوں اور آپا کی گود میں سر رکھ کر اسی طرح سے رو دوں جیسے بچپن میں بات بے بات پر انھیں کے پاس جا کر رویا کرتا تھا، اور وہ ہر بات پر تسلی دیتی تھیں، پیار کرتی تھیں، بات بات پر چوم لیا کرتی تھیں۔

آپ لوگوں کی محبت، شفقت، ہمدردی اور پیار کا بے انتہا شکریہ، کاش میں آسکتا۔ جتنی محبت سے آپ لوگوں نے بلایا ہے اس پر تو دل یہی کرتا ہے کہ فوری طور پر فاطمہ کو لے کر آپ لوگوں کے پاس آجاؤں، شاید دل بہل جائے گا۔ مگر ہمت نہیں ہوتی ہے۔

زمانے نے بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر۔ روز بہ روز، دن بہ دن غم کی شدت کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ عابد روز بھیس بدل بدل کر سامنے آجاتے ہیں۔ رات کو گولیوں کی آواز سن کر ہڑبڑا کر جاگ جاتا ہوں۔ یہ سوچ کر ہی کہ کہیں کسی جگہ پر کوئی اور عابد جیسا جوان مر گیا ہوگا۔ پھر کسی گھر میں چراغ بجھ گئے ہوں گے۔ پھر کوئی فاطمہ کی طرح روتی رہے گی پھر کوئی باپ میری طرح اندر اندر مرتا رہے گا۔ یہ ساری باتیں سوچتا ہوں پھر شدید پسینا آتا ہے اور جسم اتنا بھاری ہوجاتا ہے کہ گھنٹوں حرکت کرنے کے قابل نہیں رہتا ہوں۔ حلق خشک ہوجاتا ہے اور ایسا لگتا

ہے کہ الٹی ہوجائے گی۔ فاطمہ کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہوگا۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اسے سنبھالوں کہ خود سنبھلوں۔

دولھا بھائی! آخر ہم لوگوں نے پاکستان کیوں بنایا تھا؟ کیوں اپنے اجداد کے گھر بار، دیوار و در، محلے پاڑے چھوڑے تھے، کیوں ملک کو تقسیم کیا تھا، کیوں خاندانوں کو توڑا تھا؟ اس لیے کہ جوان بچے نوکریوں کی تلاش میں گھومتے رہیں۔ انھیں اس لیے نوکری نہ دی جائے کہ ان کا باپ بلندشہر میں پیدا ہوا تھا۔ جوان بچیوں کی آبرو ریزیاں کی جائیں، انھیں گھروں سے اغوا کرکے فروخت کردیا جائے، ان بچوں کو جن کی ابھی مونچھیں بھی نہیں نکلی ہیں، جنھوں نے ابھی نہ کچھ دیکھا ہے نہ سمجھا ہے انھیں مار دیا جائے، ٹکڑے ٹکڑے کرکے بوریوں میں بند کرکے جھاڑیوں اور نالیوں میں ڈال دیا جائے۔ اس لیے بنایا تھا پاکستان ہم لوگوں نے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا ہے، کچھ بن نہیں پڑتا ہے۔ ہائے ہائے میں کیا کروں۔ کیا منھ لے کر آپ سے ملنے آؤں گا۔ بچپن کے دوست ملیں گے، ہندو مسلمان، انھیں کیا کہوں گا کہ کراچی سے کیا خبریں لے کر آیا ہوں۔ حقارت کے قصے، سندھی پنجابی سیاست کی باتیں، موت کی داستانیں، کیا سوچا تھا، کیا ہوگیا؟

آپ کے لفافے میں ہی موہن کا خط بھی ملا ہے۔ اسے بھی آج ہی جواب دوں گا۔

دعاؤں میں یاد رکھیں، دعا کریں کہ ہمارے دلوں کو صبر مل جائے، قرار آجائے۔ کوشش کروں گا جیسے ہی حالات اور ہم لوگ سنبھلیں تو ہندوستان آئیں۔ آپ سے بھی ملیں اور نظام الدین اولیاؒ کے در پر سر رکھ کر بتائیں کہ کیا ہوگیا ہے ہمارے ساتھ۔

دعاؤں کا طالب
آپ کا چھوٹے میاں

موہن پیارے!

یاد ہے بچپن میں، میں گانا گایا کرتا تھا، موہن پیارے جاگو موہن، موہن پیارے۔ دولھا بھائی کے لفافے میں سے تمھارا خط پاکر بے اختیار زبان پر یہی جملے

آگئے، برسوں کا فاصلہ ساعتوں میں گزر گیا اور تھوڑی دیر کے لیے میں نے اپنے آپ کو تمھارے ساتھ بلند شہر میں گھومتا ہوا پایا، وہی بچپن کی گلیاں، وہی اسکول کا میدان، وہی درختوں کی چھایا اور اس میں سے گزرتی ہوئی پتلی لمبی سڑک، مسجد کے مینار اور مندر کی گھنٹیاں، کالی ندی کا صاف جھلملاتا ہوا پانی، اچھے دن تھے وہ، اچھا وقت تھا وہاں۔ وقت گزر گیا، دن بکھر گئے، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدل کر نہ جانے کہاں کھو گئے۔

پچھلی دفعہ جب تم سے دولھا بھائی کے پاس ملاقات ہوئی تھی تو میں نے نہیں سوچا تھا کہ اگلی دفعہ تمھارے تعزیتی خط کا جواب دوں گا۔ بہت شکریہ، تم نے یاد کیا۔ عابد کی موت نے تو ہم سب کو ہلا کر رکھ دیا ہے، موت تو آتی ہی ہے مگر بے وقت موت کا آنا اسی کو کہتے ہیں۔ تمھاری ہمدردی کا شکریہ۔

موہن ساری دنیا میں ہی یہ ہو رہا ہے۔ کشمیر میں لوگ روز مر رہے ہیں، فلسطین میں جوانوں کی جان لی جا رہی ہے، بوسنیا میں یہی سب کچھ ہو رہا ہے، مسلمانوں پر کیا برا وقت پڑا ہے۔ شاید اللہ میاں ہم لوگوں کا امتحان لے رہے ہیں۔ اللہ میاں تو امتحان ہی لیتے ہیں اور ہم بندوں کو امتحان سے گزرنا ہی پڑتا ہے اور جو امتحان سے گزرتا ہے اسے ہی فلاح ملتی ہے۔ دنیا میں نہیں تو مرنے کے بعد۔ اللہ جزا ضرور دیتا ہے۔ امتحان کا وقت ہے نکل جائے گا، ہندوستان میں بھی تو لوگ مرتے ہیں، ہمارا بیٹا یہاں مر گیا ہے تو کیا ہوا؟

میں ٹھیک ہوں اور فاطمہ بھی ٹھیک ہیں، بچے بھی ٹھیک ہیں اور سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے ہیں۔ مزید وقت کے گزرنے کے ساتھ باقی سب بھی ٹھیک ہی ہو جائے گا۔

بھابی جی اور انیتا بہن کو سلام کہنا۔

تمھارا پرانا ساتھی اکبر

عامر!

شہلا کا فون آیا تھا، تمھاری امی سے بات کر رہی تھی پھر تمھاری امی نے رونا شروع کر دیا اور سیکڑوں میل لمبے تاروں کے اس طرف تمھاری بہن شہلا نے بھی رونا

شروع کردیا۔ تمھاری ماں کے آنسوؤں بھرے چہرے کو دیکھ کر دل کٹ کر رہ گیا۔ انھیں سنبھال کر فون کی دوسری طرف شہلا کی سسکیاں سن کر مجھے غصہ سا آگیا تھا۔ میں کس کس کو سنبھالوں، کس کس کو تسلی دوں؟ فاطمہ کا بیٹا مرگیا ہے، شہلا کا بھائی مرگیا ہے ارے میرا بھی تو بیٹا تھا وہ۔ صرف میں ہی رہ گیا ہوں جسے ہر امتحان سے گزرنا ہے، ہر ایک کو تسلی دینی ہے، ہر ایک کو کہنا ہے کہ بہادر بنو، ہر ایک کے گلے لگ کر رونا ہے کہ مت رو۔ مجھے لگتا ہے کہ میں پاگل ہوجاؤں گا۔

پاگل پن ہی تو تھا جو میں نے پولیس والوں کو رشوت دے دی اور عابد کو تھانے سے چھڑا کر لے آیا بغیر سمجھے بوجھے کہ ایک غلطی، ایک جھوٹ، ایک فراڈ، ایک غلط حرکت بہت ساری غلطیوں، بہت سارے جھوٹ، بہت سارے فراڈ اور بہت ساری ناجائز حرکتوں کا سلسلہ شروع کردے گی۔ یہی تو ہوا ہے، ہم لوگوں کے ساتھ۔

عابد کے گھر سے جانے کے بعد کئی دنوں تک تو اس کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ ایک دن اس کے کسی دوست نے خبر دی تھی کہ وہ خیریت سے ہے اور آپ لوگوں سے جلد ہی رابطہ کرے گا۔ میں نے بہت پوچھا تھا اس سے کہ مسئلہ کیا ہے، کن چکروں میں پڑگیا ہے عابد، کن لوگوں سے خائف ہے، کون لوگ ہیں اس کے پیچھے؟ میں نے بہت سے سوال کیے اور اس نے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ گھر کے باہر بھی عجیب عجیب لوگ نظر آتے تھے، جیسے ہمارا گھر ہر وقت کسی کی نظروں میں ہے، کوئی ہر وقت ہمیں دیکھ رہا ہے۔

عابد نہیں آئے مگر ان کا فون آیا تھا۔ خیریت کا فون تو تھا مگر صاف ظاہر تھا کہ وہ پریشان ہے، ہراساں ہے، خائف ہے۔ میں اس سے پوچھتا رہا تھا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، ٹالتا رہا تھا، یہ وعدہ ضرور کیا تھا کہ جلد ہی خبر کرے گا، بتائے گا کہ مسئلہ کیا ہے؟

اس روز کے بعد سے مجھے نیند نہیں آسکی تھی۔ رات کو ہڑبڑا کر جاگ جاتا تھا۔ تھانوں میں مرجانے والوں کی خبر پڑھ کر پریشان ہوجاتا تھا۔ شہر میں تو روز ہی یہ ہورہا تھا۔ راتوں کو گولیاں چلتی تھیں، بوریوں میں لاشیں ملتی تھیں، کہیں دھڑ ملتا تھا تو کہیں سر۔ کیسا شہر ہوگیا تھا ہمارا۔ کیسے لوگ ہوگئے تھے ہم لوگ۔ یہ تو نہیں سوچا تھا ہم

نے۔ کیا سوچا تھا، کیا ہوگیا؟

تمھاری ماں ہر وقت عابد کی باتیں کرتی تھیں۔ کبھی قرآن خوانی کراتی تھیں، کبھی آیت کریمہ کا وظیفہ۔ کبھی یہ تعویذ تو کبھی خصوصی دعا۔ مائیں کیا کرسکتی ہیں؟ اللہ میاں نے ماؤں کو اتنی مامتا دے دی مگر اختیار کچھ نہیں دیا۔

عابد کے فون آتے رہے مگر وہ نہیں آیا۔ تسلی دیتا رہا مگر ان تسلیوں کا فائدہ نہیں ہوا۔

تمھاری امی پھر پریشان ہو رہی ہیں۔ ابھی عابد کے کمرے میں گئی ہیں۔ اب وہاں بیٹھ کر ٹکرٹکر اس کی چیزوں کو دیکھتی رہیں گی۔ اس کے کپڑوں کو ہاتھ لگائیں گی، اس کے بستر کو چھوئیں گی، اس کے جوتوں کو سنبھالیں گی۔ مجھے دیکھیں گی۔ آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کریں گی۔ پھر بے قرار ہوکر زارزار رودیں گی۔ میں رونا چاہوں گا، رونہیں سکوں گا۔ پھر نہ جانے کس کس طریقے سے آنسوؤں کو روکوں گا... میں جانتا ہوں، میرا دل جانتا ہے اور میرا خدا جانتا ہے، کس عذاب میں گرفتار ہوگئے ہیں ہم لوگ، کس کرنی کی یہ سزا ملی ہے۔

پھر خط لکھوں گا دوبارہ۔ اب تو لکھا بھی نہیں جاتا ہے۔

تمھارا ابو

نسیم بیٹے!

شکایت تو خیر اب کیا کروں گا اور کس کس سے کروں گا اور کیا کیا کروں گا؟ بس تم سے صرف التجا ہی کرسکتا ہوں۔ بیٹے تم نے خط نہیں لکھے ہیں۔ کوئی بات نہیں، اگر ہفتے ہفتے فون کر لیتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ عامر کا فون آتا رہتا ہے اور تمھاری امی اس کی باتیں سن کر تھوڑا بہل بھی جاتی ہیں۔ تم بھی کوشش کرو کہ پابندی سے فون کرسکو۔

مجھے پتا نہیں ہے کہ تم کیا کر رہے ہو اور کیسی گزر رہی ہے؟ تمھارے وہاں کے حالات میں نے سنا ہے کہ بہت اچھے نہیں ہیں بس کوشش کرو، محنت کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا ہے۔

کراچی میں، میں نے محنت سے ہی سب کچھ حاصل کرلیا تھا۔ میرے لیے تو وہی سب کچھ ہوا جو میں نے چاہا۔ میں نے کوئی بڑے خواب نہیں دیکھے تھے۔ بچوں کی

تعلیم چاہی تھی مل گئی، ایک گھر مانگا تھا وہ بن گیا، ایک ایمان دار زندگی کی خواہش کی تھی، وہ پوری ہوگئی۔ لڑکیوں کی شادی ہوگئی۔ عامر اور تم باہر چلے گئے عابد بھی چلے ہی جاتے، مگر نہ جانے کس کی نظر کھا گئی اسے۔ نہ جانے کیا ہوگیا کہ اسے ان حالات سے گزرنا پڑا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ اور ارسلان رات کو اسلحہ لے کر کہاں جارہے تھے۔ کیوں پولیس والوں نے ان پر قتل اور اغوا کا کیس بنایا تھا پھر کیوں ارسلان تھانے میں ہی مرگیا تھا، کیوں عابد گھر سے جاکر کہیں چھپ گئے تھے اور کیوں عابد کی لاش اس طرح سے ملی تھی؟ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا ہوں کہ عابد اور ارسلان اس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث رہے ہوں گے۔ سادہ اور ایمان دار زندگی گزارنے میں کوئی عیاشی نہیں ہوتی ہے مگر زندگی آرام سے گزر جاتی ہے۔ ناجائز دولت کے لیے ناجائز طریقے اپنانے ہوتے ہیں، بدعنوانی اور بے ایمانی کے اپنے اصول ہیں۔ کسی نہ کسی کو کہیں نہ کہیں پر کبھی نہ کبھی تو حساب دینا ہی پڑتا ہے۔

یا خدا میں نے تو ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا، میرے عابد کو اس طرح سے کیوں مار ڈالا گیا؟ میں اب صرف سوچتا رہتا ہوں اور تمھاری ماں صرف روتی رہتی ہیں اور تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا ہے کہ ایک فون کرسکو، دو بول تسلی کے کہہ سکو، انھیں کچھ قرار آجائے، کچھ سکون نصیب ہو... تم تو اپنے کینیڈا کے چکروں میں لگے ہوئے ہو اس بات سے بے خبر کہ ہم پر کیا گزر رہی ہے او رہم کس طرح سے زندہ رہ کر بھی زندہ نہیں ہیں۔

بیٹے تمھاری زندگی اور تمھارے مسائل تو ہوں گے لیکن تمھاری ایک ماں بھی ہے، میری تو گزر جائے گی اپنی ماں کو تو پریشان نہ کرو۔

تمھارا ابو

شہلا بیٹی خوش رہو!

تمھارے فون ایک طرح سے جیسے زندگی کا پیغام لے کر آتے ہیں۔ نواسوں نواسیوں سے باتیں کرکے تمھاری ماں کو کافی سکون ملتا ہے۔ بیٹا تم دونوں بیٹیوں نے جس طرح سے ہم دو بڈھوں کا خیال رکھا ہے کاش اسی طرح کی اولادیں سارے والدین کو نصیب ہوں۔ عامر، سرفراز اور تم دونوں بہنوں کے فون کے سہارے سے ہی

اب تو زندہ ہوں۔ اگر تم لوگ فون نہ کرو تو تمھاری ماں کی بے قراری شاید ان کی جان ہی لے لے۔

نسیم بہت کم فون کرتے ہیں، کل تو میں نے انہیں ڈانٹ کر خط بھی لکھا ہے۔ شاید کچھ زیادہ ہی لکھ دیا ہے نہ جانے خود کن حالات میں رہ رہا ہوگا، وہاں کون سے لڈو بٹ رہے ہوں گے۔ لیکن نہ جانے کیوں خط لکھتے لکھتے مجھے غصہ آگیا اور پھر میں لکھتا ہی چلا گیا تھا اور بغیر پڑھے ہوئے خط پوسٹ بھی کر ڈالا۔

بیٹا! عابد کی موت نے مجھے بھی کافی جھکی بنا دیا ہے، تھوڑی سی بات پر غصہ آجاتا ہے۔ بات بے بات پر depress ہوجاتا ہوں۔ جب تمھاری ماں رو رہی ہوتی ہیں تو انھیں تو سمجھاتا ہوں مگر اکیلے خود کو نہیں سمجھا پاتا ہوں۔ جب بچہ تھا تو کبھی نہیں رویا تھا کہ لڑکے تھوڑی روتے ہیں اور اب بڑھاپے میں آنسو اس طرح بہتے ہیں کہ انھیں روک بھی نہیں سکتا ہوں۔

اپنا خیال رکھنا بیٹی! تم ہمارے لیے بڑی اہم ہو۔ خدا تمھیں خوب ساری زندگی دے۔ تمھارے بچے خوش رہیں اور تم بھی خوش رہو۔ احمد میاں کے لیے، بہت ساری دعائیں اور بچوں کے لیے بے شمار پیار۔

تمھارا ابو

عامر!

یہاں کے ایک اخبار میں چھپا ہے کہ عابد اور ارسلان بہت سارے لوگوں کے قتل میں ملوث تھے اور ایک بڑی لمبی کہانی چھپی ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ؟ میں تو صرف امید ہی کرسکتا ہوں کہ تمھاری ماں کی نظر سے نہ گزرے یہ اخبار۔ انھیں صرف تکلیف ہوگی، شدید تکلیف۔

عجیب عجیب باتیں لکھی ہیں اخبار میں۔ ارسلان کا قتل، پولیس کے ہاتھوں تھانے میں ہی ہوگیا تھا۔ وہ پولیس تشدد میں مارا گیا کیوں کہ اپنے ساتھیوں کی مخبری نہیں کر رہا تھا اور بعد میں پولیس نے خودکشی کی کہانی ڈال دی تھی۔ خبر کے مطابق عابد کا قتل ارسلان کے دوستوں نے کیا تھا کیوں کہ عابد نے دوسرے لڑکوں کی نشان دہی کی تھی جو ارسلان کے مرنے کے بعد غائب ہوگئے تھے۔

میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کون سا سرا کہاں سے ملاؤں؟ رہائی سے عابد کی ناخوشی، یکایک گھر سے چلے جانا، گھر پر ان جانے چہروں کا پہرہ۔ عابد کے گھبرائے گھبرائے فون، پھر اس کی کٹی ہوئی لاش، میں نے تو صرف چہرہ ہی دیکھا تھا۔ نہلانے والوں نے بتایا تھا کہ کٹے ہوئے سر کو جسم کے ساتھ سی دیا گیا تھا کیوں کہ لاش تو ٹکڑوں میں ملی تھی، بوری میں۔

کیسے ہوتا ہے یہ، کیسے کرتے ہیں لوگ ایسا؟ میں یہ باتیں صرف تم سے کرسکتا ہوں، تم کو ہی لکھ سکتا ہوں ورنہ سوچ کر ہی دل دہل جاتا ہے۔ مجھے اس کا چہرہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس کے کٹے ہوئے سر کے اوپر جو آنکھیں تھیں، ایسی خوف زدہ آنکھیں میں نے کبھی بھی نہیں دیکھی ہیں اور خدا کسی باپ کو اپنے بچے کا ایسا چہرہ نہ دکھائے۔

بیٹے، ہمارا عابد، تمھارا بھائی ایسے کسی چکر میں ہوسکتا ہے، میں نے تو نہیں سوچا تھا۔ مجھے تو کبھی ایسا نہیں لگا کہ وہ جو راتوں کو غائب رہتا ہے تو کسی مشن کے لیے غائب ہوتا ہے۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ کسی کی جان لے سکتا تھا، کسی کو اغوا کرسکتا تھا۔ نہیں! ایسا نہیں ہوسکتا ہے، اخباروں کا کیا ہے، کہانی بنادیتے ہیں، کہانی چھاپ دیتے ہیں۔

تمھارا ابو

عامر!

بیٹے مجھے بھی یقین ہے کہ عابد اور ارسلان جوان خون تھے، بے روزگار تھے، راتوں کو ساتھ ساتھ گھومتے ہوں گے، قتل وغیرہ کے چکروں میں نہیں پڑ سکتے ہیں۔ پولیس والوں کا تو کام ہی یہ ہے کہ مہاجر لڑکوں کو گرفتار کرو، گھر والوں سے پیسے اینٹھو یا پھر پولیس مقابلے میں جان لے کر الٹے سیدھے قصے گڑھو۔

تمھاری امی اب کافی بہتر ہیں۔ مگر ابھی تک وہ عابد کی راہ دیکھ رہی ہیں۔ اس کے دوستوں کو فون کرتی رہتی ہیں... وہ بے چارے بھی بات کرتے رہتے ہیں اور جھوٹی تسلی دیتے رہتے ہیں، زندگی کا عذاب ہے، بھگتنا تو ہوگا ہی۔

تمھارا ابو

عامر بیٹے!

کل عابد کے ایک دوست نجم سے ملاقات ہوئی۔ نجم بے چارہ پاگل ہوگیا ہے، باتیں تو ایسی ہی کررہا تھا، مگر ایک عجیب بات اس نے کہی کہ وہ اور عابد ساتھ ہی train ہوئے تھے۔ دونوں کو ایک کمرے میں بند کردیا گیا تھا۔ ایک سو چوزوں کے ساتھ اور کہا گیا تھا کہ چوزے پکڑتے جاؤ اور ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ان کی گردنیں مروڑ کر انھیں مار دو۔ وہ کہہ رہا تھا، انکل اتنے چوزے اور اتنی مرتی ہوئی آنکھیں دیکھنے کے بعد آدمی سب کچھ کرسکتا ہے۔ پھر نہ جانے وہ کیا کیا بولتا رہا تھا پھر یکایک کھڑا ہوا اور چیختا ہوا بھاگ گیا کہ ''میں چوزے لاتا ہوں، میں چوزے لاتا ہوں، میں چوزے لاتا ہوں۔''

بیٹے! نجم کیسی باتیں کرگیا ہے؟ کس قسم کی ٹریننگ عابد لے رہا تھا۔ چوزوں کو مارنا، ان کی آنکھوں میں دیکھنا، وہ کیا کررہا تھا؟ کن لوگوں کے ساتھ وقت گزار رہا تھا۔ کیا شام کے اخباروں میں چھپنے والی خبریں صحیح تھیں۔ کیا اس نے گولی چلائی ہوگی، کیا اس نے بینک لوٹے ہوں گے، کیا اس نے کسی کا قتل کیا ہوگا؟ کیا اس نے کسی کی جان لی ہوگی، کیا اس نے مرنے والے کی آنکھوں کو دیکھا ہوگا؟ ان کی بے چارگی کو سمجھنے کی کوشش کی ہوگی؟ کیا اس کا دل پسیجا ہوگا؟ کیا دل کی دھڑکن سنی ہوگی؟ کیا نجم صحیح کہہ رہا تھا، سو چوزوں کو گردن مروڑ کر مار دینے کے بعد، ان آنکھوں کو دیکھنے کے بعد آدمی سب کچھ کرسکتا ہے؟ آدمی کیسا آدمی ہے؟ یہ میرا بیٹا ہے، یہ میرا کیسا بیٹا ہے؟ بیٹے! تم بھی تو میرے ہو...؟

عامر تم میری بے کسی، مجبوری، افسردگی، لاچاری اور بے قراری کا اندازہ نہیں لگاسکتے ہو، یہ سوچ سوچ کر مجھے اُلٹی ہونے لگتی ہے کہ عابد کی وجہ سے بھی کوئی میرا جیسا باپ اپنے بیٹے کو یاد کرکے بے قرار ہو رہا ہوگا، بے سکون ہوگیا ہوگا، تڑپ رہا ہوگا، بے چین نہ جانے کہاں ہوگا؟ بیٹے مشکل تو بہت ہے، تم ابھی ہی واپس گئے ہو، کیا دوبارہ کچھ دنوں کے لیے ہی سہی، آسکتے ہو تو آجاؤ۔

تمھارا ابو

شہلا بیٹی!

میں بہت پریشان ہوگیا ہوں، ادھر اخباروں میں عابد اور ارسلان کے بارے میں عجیب عجیب خبریں چھپ رہی تھیں۔ اُدھر میری ملاقات نجم سے ہوگئی۔ وہ تقریباً دیوانہ سا ہوگیا ہے، بہت ہی عجیب قسم کی باتیں اس نے کی تھیں۔ میں تو پریشان سا ہوگیا ہوں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ مجھ سے کہاں بھول چوک ہوگئی ہے میں عابد پر نظر کیوں نہیں رکھ سکا، ایسا کیسے ہوگیا؟ کالج میں پڑھنے والا نوجوان بچہ اس طرح سے ہوجائے گا۔ وہ جو بقرعید میں بکرے کا خون نہیں دیکھ سکتا ہو وہ انسانوں کے قتل میں شریک ہوجائے گا، ان کی جان لے بیٹھے گا۔

محرومیوں کا کون شکار نہیں ہوا ہے، کتنے لوگوں کو ان کی صلاحیت اور اہلیت کی بنیادوں پر نوکری نہیں ملی ہے، کتنے لوگ میں جن کے ڈومیسائل اور پی آرسی کی بنا پر انھیں انٹرویو کے لیے نہیں بلایا گیا ہے، کتنے لوگ ہیں جن کی زبانوں کو مٹانے کی کوششیں کی گئی ہے۔ ایسے تو ہزاروں لاکھوں کروڑوں لوگ ہیں۔ انھوں نے نہ تو خودکشی کی ہے نہ ڈاکا ڈالا ہے اور نہ دوسروں کے بچوں کی جانیں لی ہیں۔

تمھاری امی کا رونا تو اب کچھ کم ہوگیا ہے مگر بیٹے میرا دل اندر سے بے انتہا اور ہر وقت روتا رہتا ہے، مجھے لگتا ہے کہ خود کو کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھانا ہوگا۔ مجھے شک سا ہوگیا ہے کہ جب ہم گھر میں عابد کا انتظار کر رہے ہوتے تھے تو وہ دوسروں کے ساتھ مل کر اوروں کے گھر اجاڑ رہا ہوتا تھا... اور جب تمھاری ماں دروازے کی چوکھٹ پر عابد کا انتظار کر رہی ہوتی تھیں، اس وقت وہ ارسلان کے ساتھ دوسرے گھروں میں چوکھٹوں پر کھڑی ماؤں کی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر رہا ہوتا تھا۔

میں اپنے اس بچے کا دھیان نہیں رکھ سکا۔ اسے پڑھا لکھا تو دیا پر انسان نہیں بنا سکا، اس کے دل میں دوسروں کی محبت نہیں پیدا کرسکا، اسے نہیں سمجھا سکا کہ نفرت کیا کرتی ہے اور محبت سے کیا ہوتا ہے؟ میں ناکام ہوگیا، مکمل طور پر ناکام۔ یہ میرا جرم کوئی بھی کبھی بھی معاف نہیں کرسکے گا، شہلا بیٹی! اگر ہوسکے تو تھوڑے دن کے لیے کراچی آجاؤ، شاید مجھے کچھ سکون ملے گا۔

تمھارا ابو

آپا اور دولھا بھائی!

آپ لوگوں کا پھر خط ملا، اسی شفقت اور محبت سے بھرا ہوا، کالی ندی کے صاف کالے پانی سے دھلا ہوا۔ آپ لوگوں کی محبت، آپ لوگوں کے concern پر ہم جتنے بھی شکر گزار ہوں شاید وہ کم ہی ہوگا مگر ہمارے ساتھ جو کچھ اب ہو رہا ہے وہ کبھی دشمنوں کے ساتھ بھی نہ ہو۔

آپا! آپ کے بھی بچے ہیں، آپ لوگوں نے بھی انھیں کس کس طرح سے تعلیم دلائی ہے، گھر پر پڑھایا ہے، علی گڑھ بھیجا ہے، اپنا سکون، اپنا چین کھویا ہے، اگر انھیں ہندوستان میں نوکری نہیں ملتی ہے کیوں کہ وہاں مسلمانوں کے ساتھ برا کیا جا رہا ہے، کیوں کہ ہندو مسلمانوں کے خلاف ہیں تو کیا وہ ہندوؤں کو قتل کرنا شروع کر دیں گے؟ ان کے گھروں کو آگ لگانا شروع کر دیں گے؟ یہ جو خبریں آتی ہیں، ہندو مسلم فسادات کی تو کیا آپ کے بچے بھی شامل ہوتے ہیں اس میں؟ ہمارا عابد تو شامل تھا، ہمارا بیٹا، ہمارا اپنا خون، ہمارا جگر کا ٹکڑا، اسے ہم نے اپنے ہاتھوں سے کھلایا تھا، اپنی گودوں میں بٹھایا تھا، گھوڑا بن جاتے تھے ہم اور ہم پر سواری کرتا تھا وہ، اس کی تعلیم کے لیے کتنے پریشان تھے ہم، اسے تعلیم دے دی ہم نے، پر اسے انسان نہیں بنا سکے۔

آپا ہمارے خون میں ہی خرابی ہے، ہم اس احساس کے ساتھ زندہ ہیں کہ ہمارا بیٹا بھی قاتل تھا، اس ملک کے پولیس والے تو وحشی ہیں، وہ اگر قتل کرتے ہیں تو کرتے ہوں گے یہ تو انھیں سکھایا گیا ہے، پر ہمارا بیٹا ایسا کیسے کرسکتا ہے، فاطمہ کو تو یقین ہی نہیں آئے گا، اگر یقین کر لے گی تو پھر بچ نہیں سکے گی، میں تو موہن کو بھی خط نہیں لکھ سکتا ہوں، کہاں سے چلا تھا، کہاں آ گیا میں!؟

کاش آپ لوگوں سے ملاقات ہوسکتی...!

آپ کا چھوٹے میاں

پیارے عامر!

اگر دل کی کوئی بساط ہوتی ہے تو وہ ایسی بکھری ہے کہ اب کبھی بھی سنور نہیں سکے گی۔ اس طرح سے ٹوٹا ہے دل کہ کبھی جڑ نہیں سکے گا۔ ہارٹ اٹیک تو جان لے

لیتا ہے اور قصہ ختم۔ لیکن یہ جو تنہائی ہے اس دل کی یہ روز روز جان لیتی ہے، روم روم سسکاتی ہے۔ ایک تعلق ہوگیا ہے ذہن کا دل سے اور ذہن میں ایسی ایسی باتیں ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ میں زندہ کیسے ہوں؟ دل ہر وقت اس زور سے دھڑکتا ہے کہ کانوں پر مسلسل دھم دھم کی آواز آتی رہتی ہے۔ عابد کے مرنے کا غم اتنا شدید نہیں تھا جتنا یہ غم شدید ہے کہ وہ بھی وہی سب کچھ کررہا تھا جو اس شہر کے پولیس والے کررہے ہیں۔ انسان نہیں تھا وہ۔ اس عمر میں مجھے یہ صدمہ پہنچایا ہے اس نے، میں اسے کبھی بھی معاف نہیں کرسکوں گا۔ میں اوپر والے سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ وہ مجھے معاف کردے۔ مجھ سے ہی کوئی غلطی ہوئی ہوگی، میں ہی کہیں پر چوک گیا ہوں گا۔ اپنی غلطی، اپنی بھول چوک پر تو صرف معافی ہی مانگ سکتا ہوں، معافی اپنے خدا سے، معافی ان ماؤں سے جن کے بچے قتل ہوگئے ہوں گے، معافی ان بہنوں سے جو اپنے بھائیوں کی راہ دیکھ رہی ہوں گی، معافی میرے جیسے کسی باپ سے جو اندر سے ختم ہو رہا ہوگا، کاش میں ان لوگوں کے سامنے کھڑا ہوکر معافی مانگ سکتا... میں نے سب کچھ تمھاری ماں کو بتادیا ہے اور آج وہ بے تحاشا کھل کر بے قرار ہوکر روئی ہیں۔ شاید احساس جرم کی بے قراری انھیں واپس دنیا میں لے آئے گی۔ وہ ایک اچھی عورت ہے، وہ اب ان کا بھی بین کرے گی جنھیں اس کے بیٹے نے مارا ہے۔ بیٹے تم یہاں کب آرہے ہو؟

تمھارا ابو

فیصلے کی گھڑی

تیس ہزار فٹ کی بلندی پر کسی یورپین شہر کے اوپر سے گزرتے ہوئے میری آنکھیں یکایک کھل گئیں۔ میرے برابر وسیم اور سلمیٰ سو رہے تھے۔ ان کے برابر اسما بھی بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہی معصوم چہرہ، وہی موٹے موٹے پپوٹے اور ان کے اوپر لانبی سیاہ پلکوں کی آنکھوں پر چھایا۔ آنکھوں کے گرد ہلکے، سیاہ حلقے جو جاکر بھری بھری بھنوؤں کے ساتھ مل جاتے تھے۔ اسما کی بھنویں بڑی فطری تھیں۔ اس نے کبھی ان کی پلکنگ نہیں کی تھی۔ بھنوؤں کے اوپر چوڑی سی پیشانی جن کے بیچ میں دونوں جانب کے گہرے سیاہ بال آکر مل گئے تھے۔ محرابی چہرے پر بھرے بھرے ہونٹ۔ مجھے بے اختیار اس پر پیار آگیا تھا۔ بہت دنوں بعد بہت دیر تک میں اس کے خوب صورت چہرے کو تکتا رہا۔ پریشانیوں سے خالی چہرہ، کسی بڑی سی جھیل کی طرح پراطمینان... میں تو اس شکل کو ہی بھول گیا تھا۔ لمحے گھنٹے بن کر، گھنٹے دن اور رات کی شکل میں ہوتے ہوئے ہفتوں مہینوں میں بدل گئے تھے اور ہفتے، مہینے سال میں کہیں کھو کر رہ گئے تھے۔ اور اس عرصے میں، میں اسے چاہتا رہا تھا، پوجتا رہا تھا، اس کے چہرے کو تکتا رہا تھا، مگر یہ شکل، یہ چہرہ کہیں کھو گیا تھا۔ مجھ سے چھپ گیا تھا، جیسے چاند بادلوں میں چھپ جاتا ہے۔

وہی پھول سا چہرہ، وہی بھولی سی اسما... ماضی کے سال بڑی خاموشی سے گزر

گئے تھے۔ میں نے بھی ایک طرح سے سوچ لیا تھا، حالات سے سمجھوتہ کرلیا تھا کہ اب میں امریکا نہیں جاسکوں گا۔ شادی سے پہلے اسما کی شرط ہی یہی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ شادی ہوجائے گی تو پھر اسما کو منالوں گا مگر شادی کے بعد جس طرح اس نے پاکستان سے اپنا رشتہ جوڑ کر رکھا تھا، جس طرح یہاں کے کاموں میں الجھ گئی تھی، جس طرح سے ایک ایک لمحے کو وہ انجوائے کرتی تھی کہ اس کے بعد مجھ میں بھی ہمت نہیں تھی کہ میں اس سے کہتا کہ امریکا چلو۔

میرا سارا خاندان امریکا میں تھا اور میں نے بھی زندگی اسی طرح سے پلان کی تھی کہ شادی کے بعد دلہن کو امریکا لے کر چلا جاؤں گا مگر قسمت ایسی کہ مجھے اسما پسند آگئی اور اسما کی تو کوئی شرط ہی نہیں تھی سوائے اس کے کہ پاکستان میں ہی رہنا ہے۔ پھر وہ سب کچھ ہوگیا تھا کہ برسوں کے بعد یکایک اسما ہی نے مجھے کہا تھا کہ امریکا جانا ہے اور جلد از جلد جانا ہے۔ یہ ملک چھوڑنا ہے، فوراً چھوڑنا ہے۔

میں نے ایک دفعہ اس کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھا جو اطمینان اور جو سکون اس کے چہرے پر تھا وہ دیکھ کر مجھے وہی اسما یاد آگئی تھی جس سے پہلی دفعہ میں سول ہسپتال کراچی کے ڈاکٹرز کیفے ٹیریا میں ملا تھا۔

اس دن میں حمید سے ملنے وہاں گیا تھا۔ وہ میرا بچپن کا کلاس فیلو تھا۔ اس نے سائنس لے کر میڈیکل کالج میں داخل لیا تھا۔ میں نے کامرس پڑھ کر ایم بی اے کرلیا تھا۔ میں آئی سی آئی میں کام کرتا تھا۔ بھائی جان کی وجہ سے ہم سب بھائی بہنوں کو گرین کارڈ مل گیا تھا۔ سب لوگ تو فوراً ہی چلے گئے تھے مگر میں ہر سال امریکا کا چکر لگا لگا کر امریکن شہری بن گیا تھا۔ کسی لڑکی کی تلاش تھی کہ اس سے شادی ہوجائے تو پھر میں بھی یہ ملک چھوڑ جاؤں۔ میرے لیے نوکریوں کی کمی نہیں تھی۔ پاکستان میں بھی ملٹی نیشنل والے مجھے رکھنے کو تیار تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ جس وقت حمید وغیرہ ہاؤس جاب کررہے تھے میں لاکھ روپے سے زیادہ کمارہا تھا اور کمپنی نے کار کے ساتھ ہر قسم کی سہولتیں بھی مہیا کی ہوئی تھیں۔ میں سوچتا تھا کہ اچھا ہوا کہ میں ڈاکٹر نہیں بنا تھا۔ دن رات کی کھٹ پٹ، سالوں کی پڑھائی، اس کے بعد چند ہزار روپوں کی کمائی، یہ بھی کوئی زندگی تھی۔ وہ زمانہ چلا گیا جب پیشوں سے عزت ہوتی تھی اب عزت کا تعلق روپوں

سے ہے، ماہانہ کمائی سے ہے، بڑی سی پجارو سے ہے۔ چاہے وہ ماہانہ کمائی حرام کی ہی کیوں نہ ہو اور وہ پجارو لوٹی ہوئی دولت سے ہی کیوں نہ خریدی گئی ہو۔ معیار بدل گئے ہیں، لوگ بدل گئے ہیں، وقت بدل گیا ہے، کہا جاتا ہے، ہم نے ترقی کرلی ہے۔

میں میڈیکل کالج میں تو نہیں تھا مگر حمید کی وجہ سے ڈاکٹروں سے دوستیاں خوب تھیں بلکہ بہت سے لوگ تو مجھے اعزازی ڈاکٹر بھی کہتے تھے۔ ایک دن مذاق میں حمید سے دو سال جونیئر ایک لڑکا تھا فاروق، کافی تیز طرار جس کا کالج کے آفس میں آنا جانا بھی خوب تھا۔ ہمارے ساتھ اکثر کینٹین میں بیٹھا رہتا تھا۔ اس نے میرے پرس سے میری ایک تصویر نکال لی تھی اور دوسرے دن کینٹین میں حمید کے سامنے مجھے ڈاؤ میڈیکل کالج کا آئیڈینٹٹی کارڈ بنا کر دیا تھا کہ اب میں امریکا کے ویزے کے لیے اپلائی کر دوں۔ کارڈ کے مطابق میں کالج کے چوتھے سال کا طالب علم تھا اور امریکن ایسے لوگوں کو ضرور ویزا دے دیتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو تو واپس آنا ہی پڑے گا۔

میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس پہلے سے گرین کارڈ موجود ہے اور میں تو حمید سے ملنے اور اپنا وقت گزارنے آجاتا ہوں تو اس نے کہا تھا، یار پہلے کیوں نہیں بتایا خوامخواہ میں نے وقت ضائع کیا۔ میں نے پوچھا، بھائی تم سے کہا کس نے تھا کہ یہ کارڈ بناؤ۔

وہ ہنس کر بولا، ”یار جب بھی آتے ہو، ہماری کینٹین کا بل دے دیتے ہو، میں نے سوچا کچھ اور نہیں تو تمھیں ڈی ایم سی کا طالب علم ہی بنادوں۔ ارے بھائی! یہ کارڈ خوب بنتے ہیں اور خوب بکتے ہیں۔ ہمارے کتنے دوست اسی طرح سے امریکا چلے گئے اور واپس لوٹ کے نہیں آئے ہیں۔“

مجھے پہلی دفعہ پتا لگا تھا کہ ڈاؤ میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں یہ دھندا بھی ہوتا ہے۔ آفس کی مہریں چوری ہوکر پرنسپل کے جعلی دستخطوں سے کالج کے شناختی کارڈ بنتے ہیں، امریکن ایمبیسی کے نام خط جاتے ہیں بلکہ یہ بھی ہوتا تھا کہ پرنسپل کی طرف سے خط لکھ کر امریکا کے مختلف ہسپتالوں اور یونی ورسٹیوں سے اس قسم کے جعلی میڈیکل اسٹوڈنٹس کے لیے عارضی کام کے خط منگوائے جاتے تھے اور امریکا کا ویزا لگوا کر امریکا جایا جاتا تھا۔ فاروق نے بتایا تھا کہ ان سب کام میں سب ملا ملو کر ڈیڑھ دو لاکھ وصول

کیے جاتے ہیں۔ تمھارا تو میں نے فری میں ہی بنوادیا ہے۔'' اس نے ہنس کر کہا تھا۔ جب میڈیکل کالجوں میں مستقبل کے ڈاکٹر ویزا پاسپورٹ اور امیگریشن کے کالے دھندے میں لگ جائیں تو اس بات کا اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں کہ اس ملک کے نظام میں کہیں پر بڑی خرابی ہے۔ پروفیسر پڑھاتے نہیں ہیں، ڈاکٹر مریض نہیں دیکھتے، لڑکے پڑھتے نہیں ہیں، جو پڑھتے ہیں وہ پاکستان میں رکتے نہیں ہیں، جو رکتے ہیں وہ ڈاکٹروں کے نام پر جو کچھ کرتے ہیں اس کا اندازہ مجھے ہوگیا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کالج میں، ہاسٹل میں یہ سارا کام ہو رہا ہوگا۔

میں نے سوچا تھا کہ بھلا ہو بھائی جان کا کہ ان کی وجہ سے ہم سب لوگوں کو گرین کارڈ مل گیا تھا بلکہ اب تو یہ ہوا تھا کہ وہاں جانے کے بعد ابو نے اپنے بھائی بہنوں کو اور امی نے اپنے بھائی بہنوں کو بھی اسپانسر کردیا تھا اور ایک ایک کر کے خاندان کا ایک ایک فرد امریکا پہنچتا جارہا تھا۔ تیس چالیس سال پہلے جب میرے دادا زندہ تھے تو ہم میں سے کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم لوگ پاکستان چھوڑ کر اس طرح سے چلے جائیں گے۔ دادا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر عمر کے آخری حصے میں جوان اولادوں اور ان کے بچوں کے ساتھ اسلام اور قائداعظم کی محبت میں پاکستان آئے تھے اور ان کے مرنے کے بعد تقریباً سارا ہی کنبہ اب امریکا جا چکا تھا۔ ڈالر کی کشش تھی یا پاکستان کے حالات سے فرار یا امریکا میں ملنے والی سہولتوں اور آرام کا نشہ۔ مجھے تو امریکا میں ہی نوکری مل گئی تھی مگر کچھ دوستوں کی وجہ سے، کچھ کراچی کی ٹھرک اور کچھ یہاں کے جعلی ٹشن تھے جو میں واپس آکر آئی سی آئی میں ملازمت کر رہا تھا۔ لیکن اندر سے مجھے یہ پتا تھا کہ جس دن اچھی سی ایک لڑکی مل جائے گی اسی دن اسے بیاہ کر میں امریکا میں ہی جا کر بسوں گا۔ بس ایک اچھی سی لڑکی کے چکر میں کراچی میں گھوم رہا تھا ایک اچھی سی لڑکی کی کوئی تعریف نہیں ہوتی، بس وہ اچھی ہوتی ہے ایسی ہوتی ہے کہ اسے دیکھ کر آدمی بے چین ہوجائے۔ وہ خوب صورت بھی ہوسکتی ہے، لانبی ہوسکتی ہے، چھوٹی بھی ہوسکتی ہے، گوری بھی ہوسکتی ہے، کالی بھی ہوسکتی ہے، موٹی بھی ہوسکتی ہے، دُبلی بھی ہوسکتی ہے، سندھی، مہاجر، میمن، پنجابی، پٹھان پڑھی لکھی جاہل... دل تو کسی کے لیے بھی بے چین ہوسکتا ہے۔ اور جس کے لیے بے چینی ہو، جو راتوں کو جگا دیتی ہو، جو ہر وقت ذہن پر

چھائی رہتی ہو، جس کے نام سے ہونٹ کانپتے ہوں اور چہرہ سرخ ہوجاتا ہو، جس کے نام سے دل کی دھمک کانوں کو سنائی دینے لگتی ہو، جو اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، ہر وقت ہر سے آس پاس نظروں کے سامنے دل کے پاس دماغ کے اندر رہتی ہو، بس وہی اچھی ہوتی ہے۔ اسما ایسی ہی لڑکی تھی۔ خوب صورت تو وہ تھی ہی مگر میں اسے دیکھ کر بے چین ہوگیا تھا۔ ایک شدید خواہش دل میں اٹھی تھی کہ ہر صورت میں اسے اپنانا ہے۔ مجھے پہلی دفعہ اندازہ ہوا تھا کہ لوگ محبت میں کیا کچھ کر گزرتے ہیں۔ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے، محاورہ میرے ذہن میں گونج اٹھا تھا۔

اسما، حمید کے وارڈ میں ہاؤس جاب کر رہی تھی۔ میں حمید کے ساتھ ڈاکٹرز کیفے ٹیریا میں بیٹھا ہوا تھا کہ وہ اسے تلاش کرتی ہوئی آئی تھی، کسی مریض کے بارے میں پوچھنے کے لیے جو وارڈ میں بے ہوش پڑا ہوا تھا اور جس کے خون کے ٹیسٹ رپورٹ ابھی آئی تھی۔

مجھے یاد ہے اس نے کہا تھا، ”سر! وہ صرف اٹھائیس سال کا ہے اور یکایک بے ہوش ہوکر گرگیا تھا۔ ماں اور باپ اسے اٹھا کر لائے ہیں، ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے میں نے خون کے جو ٹیسٹ آپ نے کہے تھے، کرادیے تھے اور اب یہ رپورٹ آئی ہے۔ کچھ بھی نارمل نہیں ہے۔ بلڈ شوگر آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ سوڈیم پوٹاشیم بہت ڈسٹرب ہے۔ یوریا لیولز بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ کیتھٹر پاس کر دیا ہے مگر پیشاب کوئی خاص نہیں آرہا ہے مجھے تو لگتا ہے کہ نہیں بچے گا یہ۔ جوان لڑکا ہے کچھ کریں، سر کچھ کرنا ہوگا۔ سارے فون خراب ہیں۔ فون سے بات نہیں ہوسکتی تھی تو میں نے سوچا کہ میں خود ہی آپ کو جاکر بتادوں۔“ یہ کہہ کر اس نے لیبارٹری کے کاغذات حمید کے سامنے رکھ دیے تھے۔

حمید کاغذات دیکھ رہا تھا اور میری نظریں اس کے چہرے کا بوسہ لے رہی تھیں۔ مجھے پتا تھا کہ میں بے چین ہوگیا ہوں۔ جس کی مجھے تلاش تھی، وہ اچھی سی لڑکی یہی تھی۔

حمید نے مجھ سے کہا تھا کہ میں یہی بیٹھوں اور وہ وارڈ میں مریض کو دیکھ کر واپس آتا ہے۔ وہ اسما کے ساتھ چلا گیا۔

میں وہیں بیٹھا اور لوگوں کے ساتھ گپ مارتا رہا اور چائے پیتا رہا اور بار بار ان آنکھوں کے سمندر میں غوطہ لیتا رہا تھا۔ نہ جانے جسم میں کس قسم کے کیمیائی عمل ہورہے تھے، کوئی ہارمون تھا جو بن رہا تھا اور دل میں جا کر اسما! اسما! اسما! اسما! کی کسک جگا رہا تھا۔ محبت کا جوار بھاٹا تھا جس میں میں ڈوب چکا تھا اور یہ خوف کہ کہ کہیں اس لڑکی کی منگنی، نکاح یا بات پکی نہ ہوچکی ہو یا یہ خودکسی کی محبت کے چکر میں نہ ہو۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر نہ جانے میں نے کیا کیا سوچ لیا تھا اور دنیا سے جھگڑے کے کیا کیا فیصلے کر لیے تھے۔ بہت ساری باتیں ذہن میں آئی تھیں۔ میرے والدین کے لیے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا، ان کی تو صرف خواہش تھی کہ میں شادی کرلوں۔ نہ جانے ان لوگوں کے خاندان میں کیا ہوتا ہے؟ کیا وہ مجھ سے شادی پر راضی ہو جائیں گے؟ کیا وہ تیار ہوں گے کہ اسما میرے ساتھ امریکا چلی جائے؟ میں ڈاکٹر نہیں ہوں، کیا وہ کسی غیر ڈاکٹر سے شادی کریں گے وغیرہ وغیرہ۔

میں دل ہی دل میں دعا کرتا رہا کہ حمید آئے اور وہ بھی حمید کے ساتھ ہو۔ چائے پینے کے دوران میرا دماغ کہیں اور تھا اور دل کہیں اور۔ ہاتھ بار بار کپکپا جاتے تھے۔ نہ خوف تھا، نہ پریشانی۔ بس ایک انتشار تھا جو سارے وجود کو اپنی جکڑ میں لے چکا تھا۔

اسما سے شادی کچھ بہت زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوئی تھی۔ حمید کے ذریعے ہی میں نے پتا کرالیا تھا۔ وہ لوگ بہادرآباد میں رہتے تھے، کھاتے پیتے گھرانے کے پڑھے لکھے لوگ۔ اسما کے ابو بھی ڈاکٹر تھے اور کافی سمجھ دار آدمی تھے۔ حمید نے ہی مجھے بتایا تھا کہ ابھی اس کی کوئی منگنی وغیرہ نہیں ہوئی ہے مگر ایک جگہ اس سے پہلے بات چل رہی تھی مگر طے نہیں ہوسکی، کیوں کہ اسما نے پاکستان سے باہر جانے سے انکار کردیا تھا۔ وہ لڑکا پاکستان میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔

حمید کے ہی مشورے سے میں نے پہلے اسما سے بات کرنے کا فیصلہ کیا، پھر سوچا تھا کہ اس کے بعد اس کے والدین سے بات کروں گا۔ میں آج بھی حمید کا شکر گزار ہوں کہ اس نے اس قسم کے مواقع بہم پہنچائے کہ میں اسما سے بے تکلف ہوگیا۔ کبھی کسی مریض کے لیے دوائیں خرید کر، کبھی اپنا خون دے کر اور کبھی کسی مریض کے

لیبارٹری کے ٹیسٹ کرا کر۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میں کبھی بیمار پڑ جاؤں تو اسما جیسا ہی کوئی میرا ڈاکٹر ہونا چاہیے۔ وہ بڑی دردمند ڈاکٹر تھی، دردمند۔ ہر وقت مریض کے لیے پریشان۔ وہ ایک غیر معمولی ڈاکٹر تھی ورنہ آج کل ایسے ڈاکٹر کہاں ہوتے ہیں، مگر میرا یہ خیال غلط تھا۔ ہاؤس جاب کے دوران تقریباً سارے ڈاکٹر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کام کی دھن لیے ہوئے، علاج کرنے کے شوق سے بھرے ہوئے، اس امنگ کے ساتھ کہ بیماریوں کا خاتمہ کردیں گے مگر بہت جلد یہ نظام انھیں خراب کر دیتا ہے۔

مجھے اس کے وارڈ میں مزہ آنے لگا تھا۔ ہر مشکل اور غریب مریض کے لیے کچھ کر کے وہ تو خوش ہوتی ہی تھی، مجھے سکون سا ہوتا تھا۔ میں حمید کے وارڈ کا ایک کارندہ بن گیا تھا، وہ سارے دن وہ سارے لمحے اسما کی محبت کو آہستہ آہستہ بھڑکاتے ہی رہے تھے۔

اس نے امریکا نہ جانے کی شرط رکھ دی تھی اور میں نے امریکا نہ جانے کی شرط مان لی اور ہماری شادی ہوگئی۔

اسما کے ساتھ زندگی خوب گزر رہی تھی۔ اس نے پہلے ایم سی پی ایس کا امتحان پاس کیا۔ پھر ایک اور ڈگری ہوتی ہے ایف سی پی ایس وہ بھی کر لیا تھا۔ پھر وہ بچوں کی اچھی سی ڈاکٹر ہوگئی تھی۔ اسے اچھا ڈاکٹر تو ہونا ہی تھا، وہ تھی ہی اتنی اچھی۔ مریض اس پر جان دیتے تھے۔ وہ کہتی تھی کہ بچوں کا ڈاکٹر بننا بہت اچھا ہے۔ بچوں کی ڈاکٹری میں سب سے اچھی بات یہی ہے کہ بچے تھوڑے سے علاج سے اچھے ہوجاتے ہیں۔ بڑوں کی طرح اُلٹے سیدھے سوال نہیں کرتے۔ نہ ان میں چاپلوسی ہوتی ہے نہ کسی قسم کی مکاری۔ بیمار ہوتے ہیں تو اچھے بھی ہوجاتے ہیں اور جب اچھے ہوتے ہیں تو صرف خوشیاں ہی دیتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہوتی ہیں ان کی۔

میں بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔ مجھے یاد آیا تھا کہ اسما نے بتایا تھا کہ زار و قطار روتے ہوئے بچے جن کی شکلوں سے لگتا ہے کہ بے انتہا ظلم و جبر کا شکار ہوکر آئے ہیں... آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لیے ہوئے، ہمکتے بلکتے ہوئے بچے بس ایک چاکلیٹ، ایک کینڈی سے خوش ہوجاتے ہیں، سب کچھ بھول کر۔ پھر نہ جانے کتنے بچے تو اس کے پاس آتے ہی اس لیے تھے کہ اس ڈاکٹر کے پاس چاکلیٹ ملتی ہے۔ کراچی

جیسے شہر میں جہاں فسادات کے ساتھ غربت بھی تھی، جہاں بیماریاں اتنی ہی عام تھیں جتنی گندگی عام ہے، جتنے آوارہ کتے عام ہیں، جتنا مچھر عام ہیں، جتنے کیڑے مکوڑے عام ہیں، جتنا گٹر کا پانی عام ہے، جتنا سڑکوں پر جھلتا ہوا دھواں ہے، جتنا پینے کا گندہ پانی عام ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ بچوں کو دیکھتی تھی، انھیں پیار کرتی تھی، ان کا علاج کرتی تھی، اپنے پاس سے پیسے خرچ کرکے من ہی من میں خوش ہوتی۔ وہ خوش تھی بے انتہا خوش اور اس کی خوشی میں ہی میں بھی خوش تھا بے انتہا خوش۔

کراچی کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے تھے۔ ضیاء الحق کی فوجی حکومت نے سب کچھ ہی چھین لیا، پھر سیاستدانوں کی سیاستیں بھی خوب تھیں۔ آہستہ آہستہ پورا شہر جیسے یرغمال ہوگیا ہو۔ اسکول بند ہوجاتے تھے، ہڑتالیں عام تھیں۔ گھر، دکان، کاروبار کچھ بھی محفوظ نہیں تھا۔ رات کا سناٹا بھی سناٹا نہیں تھا کیوں کہ گولیوں اور دھماکوں کی آوازیں شہر کے ہر حصے میں آتی رہتی تھیں۔ پھر ضیاء الحق کے بعد حکومتیں مگر ان کا بھی وہی حال تھا۔ ایک دن بھی سکون نہیں تھا۔ شہر میں لوٹ مار، قتل غارت گری، اغوا، ہڑتالیں، بوریوں میں کٹی ہوئی لاشیں، تھانوں میں تشدد سے مرتے ہوئے نوجوان، پولیس مقابلوں میں جانوں کا ضیاع، سیاسی لیڈروں کی رعونت، مذہبی لیڈروں کی نفرت، شہر کیا تھا کیا ہوگیا تھا۔ کسی نے میرے بچپن کا کراچی اغوا کرلیا تھا، وہ کراچی جہاں کی شامیں اودھ کی شاموں سے اچھی تھی، جہاں کی صبح دنیا کی ساری صبحوں سے اچھی تھیں۔ اس کراچی میں وہ سب کچھ کرایا جا رہا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیا ہوگیا تھا لوگوں کو؟

میں نے آئی سی آئی چھوڑ کر گلیکسو میں نوکری کرلی، ساتھ ہی کراچی یونی ورسٹی کے آئی بی اے میں بھی پڑھاتا تھا۔ پڑھانے کا مجھے ہمیشہ سے شوق تھا اور اسی ٹھرک کو پورا کرنے کے لیے مہینے میں چھ سے آٹھ لیکچر کی ذمہ داری میں نے لے لی تھی۔

کراچی میں بوریوں میں ملنے والی لاشیں اور روز روز کے ہنگاموں کی خبر میرے گھر والوں کو امریکا میں بھی ملتی تھی اور وہ سب چاہتے تھے کہ میں بھی اسما کو لے کر امریکا چلا آؤں مگر امریکا اب میرے پروگرام میں نہیں تھا۔ میری شہریت اور پاسپورٹ ضرور امریکن تھے مگر میری بیوی اور دو بچے کراچی کے تھے اور پاکستان سے

باہر نکلنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ کہتی تھی کہ اگر ہر آدمی امریکا ہی چلا جائے گا تو یہاں کون رہے گا؟ میرے والد امریکا نہیں گئے، بڑے اچھے ڈاکٹر ہیں۔ پوری کمیونٹی میں عزت ہے ان کی، ہر ایک ان کے لیے جان دینے کو تیار ہوتا ہے۔ بے شمار لوگوں کی جانیں بچائی ہیں انھوں نے، خوش و خرم رہے ہیں، ہم سب کو پڑھایا ہے انھوں نے، پاکستان سے اس کو محبت شدید تھی بہت شدید۔ میں بھی پاکستانی تھا مگر اس قسم کے خیالات میرے کبھی بھی نہیں رہے تھے۔ پاکستان سے شاید اتنی محبت نہیں تھی مجھے، جتنی کراچی سے عقیدت تھی، اور وہ بھی اتنی شدید نہیں کہ میں کراچی کو امریکا پر فوقیت دیتا۔

اسما صرف اچھی ڈاکٹر ہی نہیں تھی بلکہ بہت اچھی بیوی بھی تھی۔ ہم لوگ خراب ترین حالات کے باوجود بہت خوش تھے۔ زندگی میں آدمی کو اور چاہیے بھی کیا ہوتا ہے۔ تھوڑی سی خوشی اور کیا۔

اسما کے کام کا وہی حال تھا۔ اس کی کمائی اور میری بھی آمدنی کی اچھی خاصی رقم اسما کے مریضوں پر خرچ ہوتی تھی اور اس میں میرا رویہ بھی کافی فلسفیانہ تھا۔ میرے والدین کا بڑا سا گھر تھا جس میں ہم رہتے تھے۔ میری تنخواہ اور میرے انوسٹمنٹ سے میری آمدنی ہم لوگوں کی ضرورتوں سے بہت زیادہ تھی اور اگر اس آمدنی کا کچھ حصہ لوگوں کی زندگی میں روشنی بکھیر دیتا ہو تو اس سے خوشی کے سوا اور کیا ملتا ہے۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے ساتھ زندگی نہایت سکون سے گزر رہی تھی۔

ایک دفعہ یہ ضرور ہوا تھا کہ یونی ورسٹی کے امتحان میں ایک لڑکے کو میں نے اس کی شدید نالائقی پر فیل کر دیا تھا تو میرے گھر پر کچھ دھمکیوں والے فون آئے تھے۔ ایک سیاسی جماعت اور طلبہ تنظیم کے لوگوں نے مجھے سمجھایا تھا کہ فیل کرنے کے چکروں میں نہ پڑوں، کچھ لوگوں کو پاس کرنا ہوتا ہے۔ یہی نظام ہے آج کل اور یہی مجھے ماننا ہوگا۔ میں نے بات نہیں مانی تو میرے بچوں کو اغوا کرنے کی دھمکی بھی دی گئی تھی۔ انھیں دنوں میں اسما کی گاڑی کو ایک ٹرک ٹکر مار کر بھاگ بھی گیا تھا۔ اس ایک واقعے نے مجھے پریشان کردیا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ اسما کی فکر رہی تھی، رہتی تھی اور رہے گی۔ اتنی شدت سے چاہا تھا اسے میں نے۔

اس واقعے کے بعد میں نے سوچا اور اسما سے کہا بھی تھا کہ اب جس قسم کے

حالات ہو رہے ہیں، اس میں تو بہتر یہ ہے کہ ہم لوگ پاکستان چھوڑ ہی دیں۔ امریکا نہ سہی کہیں اور چلے چلتے ہیں۔ مجھے دنیا میں کہیں بھی نوکری مل جائے گی۔ مجھے تمھاری زندگی عزیز ہے۔ میں تمھیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں، خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔

وہ بڑے پیار سے ہنس دی تھی۔ ''میں زندہ رہوں گی، تمھارے ساتھ ہی رہوں گی، وقت بدل جائے گا سب کچھ صحیح ہوجائے گا۔ یہ سب وقتی باتیں ہیں، یہی دُنیا ہے میری اور یہاں کے بچے ہی میرے مریض ہیں اور اس میں ہی میں خوش ہوں۔''

میں نے کوئی ضد نہیں کی تھی۔ کچھ اور احتیاطی تدابیر اختیار کرلیں تھیں ہم لوگوں نے۔ پولیس کو بھی خبر کی تھی، چوکیدار بھی بڑھالیے تھے۔ اسما کا ڈرائیور پرانا فوجی تھا۔ اسے بھی بہت کچھ سمجھایا تھا اور زندگی کی بھاگ دوڑ میں شامل رہے تھے۔

حالات بہتر ہوئے تھے، اسما نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کراچی کی رونقیں بھی واپس آئی تھیں پھر برنس روڈ پر رات کے چار چار بجے تک کھانا ملنے لگا تھا، بوٹ بیسن کی گہما گہمی لوٹ آئی تھی، شام ڈھلے ہی سڑکیں ویران نہیں ہوجاتی تھیں، ٹاور کے باکڑا ریسٹورنٹ ساری رات کھلے رہنے لگے تھے، کلفٹن اور ہاکس بے کے ساحل پر لوگ راتوں کو کیمپ فائر بھی کرنے لگے تھے، اکا دکا ہڑتالوں کے باوجود اسکول کالج کھلے رہنے لگے تھے۔ شہر سے جیسے آسیبی سایہ آہستہ آہستہ سرک رہا تھا۔ میں خوش تھا کہ اسما بھی خوش تھی اور زندگی اپنے ڈگر پر چل نکلی تھی۔ میں نے نہیں سوچا تھا کہ کراچی کے حالات یکایک صحیح ہونے لگ جائیں گے اور برسوں کا کیا ہوا خراب کام اچھائی کی طرف بھی جاسکے گا۔ راتوں کو کراچی میں بے خوف و خطر گھوما بھی جاسکے گا۔ صبح کو سڑکوں پر لاشیں ملنی بند ہو جائیں گی۔ بچوں کا اغوا کم ہوجائے گا۔ شہر دوبارہ اچھائی کی طرف چل نکلے گا۔ ایک اُمید پیدا ہوگئی تھی، ایک آسرا سا ہو چلا تھا، ایک چراغ جیسے جل اُٹھا تھا، ایک صبح جیسے مچل کر بے قراری کے ساتھ طلوع ہونے والی تھی۔ یہ سب کچھ عجیب سا لگا تھا خاص طور پر اس لیے کہ اچھائی کی امید ہی نہیں تھی۔ میں کراچی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ پھر اتنے میں اگر بے وجہ قرار آجائے تو عجیب ہی لگتا ہے۔

اس دوپہر جب اسما ہسپتال سے واپس آئی تو سخت پریشان تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ آج آٹھ نو سال کا ایک بچہ اس نے داخل کیا تھا۔ اکلوتا بیٹا تھا غریب ماں باپ

کا، نہ جانے کیا ہوا تھا اسے۔ بڑا سا سر، چھوٹے چھوٹے ہاتھ، چھوٹے چھوٹے پیر، پسلیاں نکلی ہوئی تھیں۔ نہ جانے کب سے کم خوراکی کا شکار تھا وہ۔ اس کی ایک ایک ہڈی گنی جا سکتی تھی۔ بخار میں پھنک رہا تھا وہ۔ نہ جانے بچے گا کہ نہیں۔

اسما نے بتایا تھا کہ نیوکراچی سے آئے تھے وہ لوگ۔ بچہ بیمار پڑا تھا تو علاقے کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے، بے روزگار باپ کے پاس جو کچھ بھی تھا اس نے بیٹے کے علاج پر خرچ کردیا تھا۔ بچی کھچی رقم خرچ ہوگئی تھی مگر بیٹا صحیح نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ لوگ اسے عباسی شہید ہسپتال لے گئے تھے جہاں ساری دوائیں ایک زمانے میں مفت ملا کرتی تھیں مگر وہاں بھی کچھ نہیں ہوا تھا۔ سارے سرکاری ہسپتالوں کا یہی حال تھا وہاں بھی فیسیں تھیں، پرچی کی فیس، داخلے کی فیس، آپریشن کی فیس۔ ہر کارکن کی بخشش، پھر دوائیں بھی خریدنی پڑتی تھیں۔ سرکاری ہسپتال اب سرکاری نہیں رہے تھے۔ اس بچے کی طبیعت خراب سے خراب تر ہوتی چلی جارہی تھی۔ خاندان سے قرض لے کر اور گھر کی چیزیں اور جو بھی تھوڑے بہت زیورات تھے انھیں بیچ کر مہنگی مہنگی دوائیں خرید کر بھی اس کی طبیعت خراب سے خراب تر ہوتی چلی جارہی تھی۔ پتا نہیں وہ بچے گا بھی کہ نہیں۔

اسما کافی پریشان تھی۔ "ہمارے وسیم جتنی ہی اس کی عمر ہوگی۔" اس نے بڑی پریشانی سے مجھے بتایا تھا۔ شام کو وہ دوبارہ ہسپتال گئی تھی اسے دیکھنے کے لیے۔ واپس آئی تو پریشانی اس کے چہرے پر اسی طرح سے موجیں مار رہی تھی۔ رات کو کئی دفعہ اس نے ہسپتال فون بھی کیا تھا۔

ایسے مریضوں کے علاج میں، میں بھی شامل ہوجاتا تھا۔ ان کی دواؤں کے لیے پیسوں کا انتظام کرتا تھا اور کبھی کبھی خون بھی دیتا تھا۔ مجھے اس طرح کے کام سے خوشی ہوتی تھی اور سچی بات تو یہ ہے کہ جب یہ بچے صحیح ہوجاتے تھے مجھے اور بھی زیادہ خوشی ہوتی تھی۔ میں نے زندگی اسی طرح سے گزارنے کا فیصلہ کیا تھا جس پر مجھے کوئی افسوس یا ملال بھی نہیں تھا۔ رات بھر میرا دل بھی اس معصوم بچے اور اس کے ماں باپ کے لیے دھڑکتا رہا تھا۔

برسوں کی بے روزگاری، بدامنی اور حکومتوں کے وزیروں، مشیروں، اسمبلی کے ممبروں نے ایسے حالات پیدا کردیے تھے کہ غربت کراچی کے ایک ایک محلے میں ایک

ایک گھر میں کسی نہ کسی طرح سے گھس گئی تھی۔ کہیں مالی غربت تھی تو کہیں ذہن فقیر تھا اور ان جیسے حالات میں اسما کے ہسپتال میں ایسے مریضوں کی تعداد بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ میں اچھے حالات کی تمنا ہی کرسکتا تھا، دعا ہی کرسکتا تھا اور کرتا ہی رہتا تھا۔ یہ ایک نیا رُخ تھا اس شہر کا۔ کئی سال کی بدامنی، ہڑتال، جہالت، نفرت کی سیاست، مذہبی منافرت کا عذاب، ایک مستقل غربت کی صورت میں آیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے کام کاج میں لگ گئے تھے، عورتیں فقیر بن کر سڑکوں کا گناہ بن گئی تھیں اور ایک ایک آدمی اپنی سفید پوشی کے لیے نہ جانے کیا کیا کر رہا تھا۔ غربت، بے روزگاری، امن و امان کی خرابی اور آئے دن کی پہیہ جام نے شہر کا جو حشر کیا تھا اس کے بعد اب ایک وبا خودکشی کی چل نکلی تھی۔ روز کے اخبار بے روزگاری کے ہاتھوں مجبور ہوکر خودکشی کرنے والوں کی خبر سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ مجھے خوف سا ہوتا تھا کہ یہ غربت اور کیا رنگ لائے گی اور کون سا عذاب اُترے گا آسمانوں سے۔ غربت سے بڑا عذاب تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔

دوسرے دن اسما نے بتایا کہ بچے کا بخار اسی طرح سے ہے، چہرے کی نقاہت بڑھتی جارہی ہے۔ آج اس نے اس کی ریڑھ کی ہڈی کا پانی نکال کر لیبارٹری میں بھیجا تھا۔ وہ پریشان تھی تاہم اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ ہر طرح کی دواؤں کا انتظام ہوگیا ہے، ہر کوئی مدد کررہا ہے۔ ہر ڈاکٹر اس بچے کے لیے پریشان ہے۔ مجھے بھی تھوڑا اطمینان سا ہوا تھا...

اس بچے کی طبیعت بگڑتی ہی گئی تھی، تین چار روز کے بعد ہر طرح کی دوا علاج کے باوجود وہ بے ہوش سا ہوگیا تھا۔ اسما تو ہمت نہیں ہاری تھی مگر میں دل ہار گیا تھا اور سوچتا تھا کہ غربت سے زیادہ بڑا جرم کوئی اور نہیں ہوسکتا ہے۔ اس گناہ کی پاداش میں انسان کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے اس کی تو ہر کہانی ایک مثال ہے۔ کاش! ہم لوگ کچھ کر سکتے، کاش...

اس روز دوپہر کو وہ آئی تو اس کا چہرہ اس کے سفید کوٹ کی طرح دُھلا ہوا تھا۔ ایسی ویرانی میں نے پہلے کبھی بھی اس کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔ میں نے سوچا تھا شاید بچہ مرگیا ہے۔ تمام دوائیں بے کار ہوگئیں، تمام محنت اکارت ہوگئی اور اب وہ

اپنے دل پر اس بوجھ کو لے کر بے چین ہوگی۔ بیمار بچے پہلے بھی آتے تھے، پہلے بھی مرتے تھے مگر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس بچے کی موت اسما کو اتنا نڈھال کر دے گی۔

میرے سوالیہ چہرے پر موجود سوال میرے ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہی وہ کہہ بیٹھی کہ نہیں وہ مرا نہیں ہے، میں مرگئی ہوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ ''کیا ہوا، اسما کیسی باتیں کررہی ہو؟''

''ہاں، اس کے باپ نے مجھ سے پوچھا تھا، ڈاکٹر صاحب میرا بچہ بچے گا کہ نہیں؟ میں کیا جواب دیتی، میں تو صرف اُمید کرسکتی ہوں کہ وہ صحیح ہو جائے۔ اس کے لیے دواؤں کا انتظام کیا ہے ہم لوگوں نے۔ ہر قسم کی مہنگی ترین دوائیں دے رہے ہیں ہم لوگ۔ ہم دوا دے رہے ہیں آپ دعا کرو۔ میں نے اسے سمجھایا تھا۔'' وہ بڑے دُکھ سے بولی۔

''مگر اس کا باپ بار بار آ کر آج صبح سے پوچھ رہا تھا کہ اب بچنے کی کیا اُمید ہے؟ میں بار بار سمجھا رہی تھی اور جھنجھلا بھی رہی تھی کہ اس سوال کا کیا جواب دوں۔ میں ڈاکٹر ہوں، خدا تو نہیں ہوں۔ علاج کرسکتی ہوں جان تو نہیں ڈال سکتی۔ مگر ان کے سوالوں کا سلسلہ بند نہیں ہوا تھا تو میں خود ہی پوچھ بیٹھی تھی کہ دیکھو ہم لوگ کوشش کررہے ہیں، پوری کوشش کر رہے ہیں، مہنگی ترین دوائیں دے رہے ہیں، آغاخان ہسپتال میں مہنگے ترین ٹیسٹ کررہے ہیں، پتا نہیں کن کن کتابوں میں کیا کیا دیکھ رہے ہیں، کئی ڈاکٹروں سے بات کی ہے، کمپیوٹر کے انٹرنیٹ پر لوگوں سے پوچھ رہے ہیں۔ ہم تو صرف کوشش ہی کرسکتے ہیں ناں، زندگی تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے، میں کیسے بتا سکتی ہوں کہ یہ بچے گا کہ نہیں؟ مگر تم بار بار یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟ کیوں پوچھ رہے ہو؟ انتظار کرنا ہوگا، انتظار۔''

''معلوم ہے اس نے کیا کہا تھا؟'' اسما کے دھواں دھواں چہرے پر روشنی نہیں تھی، آنکھوں کے کٹوروں میں چھل چھل پانی اُمڈ رہا تھا۔ اسے اس حالت میں میں نے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔

''کیا کہا تھا اس نے؟'' میں نے خوف زدہ ہو کر سراسیمگی سے پوچھا تھا۔

اس نے کہا تھا، ''ڈاکٹر صاحب! اب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ

نے بڑی مہربانی کی ہے، ساری دواؤں کا انتظام کیا ہے، کچھ بھی نہیں لیا ہے ہم لوگوں سے۔ لیکن ہمارا سب کچھ بک گیا ہے اس کے علاج میں۔ اب تو نیوکراچی سے آنے کے لیے کرایہ بھی نہیں ہوتا ہے ہمارے پاس۔ کتنے دن ہوگئے ہیں نہ کام کیا ہے اور نہ کچھ کھا سکتے ہیں ہم میاں بیوی۔ محلے والے کب تک کھلائیں گے۔ وہ کون سے بڑے امیر ہیں۔ بڑے غریب علاقے میں رہتے ہیں ہم لوگ۔ ہم تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر یہ ہمارا بچہ بچے گا تو کچھ اور چیز ہے ہمارے پاس، ہماری اماں کا دیا ہوا اسے بیچ دیتے ہیں تاکہ اس کی جان بچ جائے، لیکن اگر یہ مر جائے گا تو اسے بے ہوشی کی حالت میں لے جانے دیجیے۔ بے ہوش ہو مگر زندہ ہوگا تو ہم اس کو بس میں لے جا سکتے ہیں، کوئی کچھ نہیں بولے گا، لیکن اگر یہ مر گیا تو پھر ایمبولینس کرنا ہوگا۔ مرے ہوئے بچے کے لیے بس میں جگہ نہیں ہوتی ہے، ایمبولنس کے لیے ستر، اسی روپیہ نہیں ہے ہمارے پاس۔ کہاں سے لائیں گے یہ رقم۔ صرف اتنی سی بات ہے۔ دونوں میاں بیوی نے ہاتھ جوڑ لیے تھے میرے سامنے۔"

یہ کہہ کر اسما رو دی تھی۔ ڈھیر ہوگئی تھی صوفے پر۔ ویران آنکھوں سے دُور نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی، کیا تک رہی تھی آسمان پر۔ پھر دھیرے سے بولی، "میں کیا کر سکتی ہوں، روز روز ایسے ہی مریض آتے ہیں اب تو اور روز روز مرنا پڑتا ہے۔ میں تھک گئی ہوں، اب چلے چلو یہاں سے دُور، پاکستان سے باہر... یہ عذاب نہیں سہا جاتا ہے مجھ سے۔ میں بار بار مر مر کر بچتی ہوں۔ یہ بچے مجھے خواب میں آ کر ڈراتے ہیں، یہ روتی ہوئی مائیں، یہ ہاتھ جوڑتے ہوئے باپ، یہ آنسو بہاتے ہوئے بچوں کے نانا نانی، دادا دادی، جن کے پاس مرے ہوئے بچے کو لے جانے کے لیے ایمبولینس تک کے پیسے نہیں ہیں..."

اس کا یہ کہنا میرے لیے فیصلے کی گھڑی تھی۔ اب کچھ کرنا ہوگا۔ اس لمحے کو یاد کرتے ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے مجھے کراچی سے اٹھا کر امریکا لے جانے والے جہاز پر ایمبولینس سائرن لگا ہوا ہے اور وہ کراچی کی سڑکوں پر سائرن بجاتا، لاشیں ڈھونڈتا دوڑ رہا ہے۔

◻

اندھیرے سے اندھیرے تک

''رات کو وہ گھس آئے تھے چھ لوگ، لمبے تڑنگے، شلوار قمیص پہنے، چہروں پر اجرک باندھے ہوئے، بڑی بڑی آنکھیں اور ہر ایک کے ہاتھ میں ہتھیار، پستول، کلاشنکوف اور چاقو۔ ایک نے احمد کے باپ کی گردن پر چھری رکھ دی اور مجھے میری چارپائی پر ہی رسیوں سے باندھ دیا۔ میرے بعد ان سے بھی بستر پر لیٹنے کو کہا اور دوسرے نے پستول کے دستے کو ان کے سر پر دے مارا تھا۔ خون جیسے ابل رہا ہو، میں تقریباً بے ہوش سی ہوگئی، ہم دونوں کو باندھنے اور ہمارے منھ پر پٹیوں کو کسنے کے بعد برابر والے کمرے میں ایک ایک کر کے وہ میری بیٹی اور بہو کو پامال کرتے رہے۔ کسی چیخ کے بغیر، بے آواز، دہشت کی خاموشی میں آہستہ آہستہ وہ وحشی سب کچھ کرتے رہے۔ نہ جانے کب وہ دونوں مرگئی تھیں۔''

احمد کی ماں نے مجھے بڑے دکھ سے بتایا تھا۔ ہر ایک لمحے کا کرب، بچیوں کی ایک ایک اَن سنی چیخ، پامالی کا ایک ایک لمحہ، اس رات کا ہر ایک عذاب، ان کے چہرے پر رنگ بدل بدل کر عیاں تھا۔ پھر وہ اسی بجھے بجھے لہجے میں بولی تھیں، ''اب احمد کو ہم کیا بتائیں گے کہ کیا ہوا اس کی بیوی کے ساتھ... کہاں چلی گئی بہن اس کی؟''

یہ کہہ کر وہ اپنے آنسوؤں کو نہیں روک سکی تھیں۔ بھیگا بھیگا آنسوؤں سے تر چہرہ... مجھے ایسا لگا جیسے ان کے چہرے کی جھریاں لہر بن کر دُکھ کے سمندر میں فنا

ہو رہی ہیں۔

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ احمد کے والد گھر میں داخل ہوئے۔ ابھی سال بھر پہلے تک ان کے چہرے پر بشاشت تھی، بغاوت ان کے ماتھے پر نمایاں مگر اب ان کا چہرہ ان کے ٹوٹنے کی چغلی کھا رہا تھا... یہ ایک مختلف چہرہ تھا بجھا ہوا، ٹوٹا ہوا، بھیگا ہوا، نامانوس مایوس سا چہرہ۔ ان کے کچھ کہنے سے قبل ہی مجھے لگا تھا جیسے میں خود بھی اندر سے ٹوٹ گیا ہوں، بکھر گیا ہوں۔ نہ جانے کس طرح سے بے سمت ہو کر کہاں سے کہاں چلا جا رہا ہوں۔

پہلے... بہت پہلے، وہ احمد کے ساتھ ہی ہمارے آفس آئے تھے، جوش سے بھرا ہوا، تانبے کی طرح تپتا ہوا چہرہ میں نہیں بھول سکتا ہوں۔ وہ چہرہ بھی میں دیکھ چکا تھا۔

انھوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ کچھ بولے نہیں، نہ احمد کی خیریت پوچھی، نہ اپنا حال بتایا، خاموشی سے احمد کی ماں کے برابر میں بیٹھ گئے۔ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح، ایک تھکے ہوئے انسان کی مانند، ایک ایسے سپاہی کی طرح جس کے ہتھیار چھن گئے ہوں، جس کا سپہ سالار بھاگ گیا ہو جو موت سے بچ گیا ہو مگر زندہ بھی نہ رہنا چاہتا ہو۔

مجھے ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ بات کا سلسلہ شروع کروں اور شروع کروں تو کہاں سے؟ مجھے لگا کہ میرے پاس سنانے کو بہت کم ہے اور سننے کو بہت زیادہ۔ ان دونوں کو دیکھ کر احمد اور ان کے بارے میں سوچ کر ہی ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ میرے وجود کو تر کرتا چلا گیا تھا۔ میرے ریڑھ کی ہڈی میں دوڑنے والی بجلی نہ جانے کتنے میگاواٹ کا اخراج کر رہی تھی کہ میں شل سا ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ مجھے غور سے دیکھتے رہے، میں انھیں تکتا رہا، کچھ بولنے ہی والا تھا کہ وہ بول اُٹھے، ''اسی لیے بنایا تھا یہ ملک ہم لوگوں نے؟''

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ جواب تو بہت سارے تھے، مگر انھیں بیان کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی، میں خاموش رہا۔

''سنتاہار کا نام سنا ہے تم نے... مشرقی پاکستان کا ایک شہر ہے۔'' وہ بنگلہ دیش

کو اب بھی مشرقی پاکستان ہی کہتے تھے۔ ''میں جب وہاں پہنچا بہار سے مہاجر بن کر تو بہاری کہلایا، پاکستانی نہیں کہا مجھے کسی نے... اسی مٹی میں ملا لیا تھا اپنے آپ کو میں نے کہ اب پاکستان میں رہوں گا۔ اردو بولوں گا، اسلامی حکومت میں... ہندوؤں سے دور، جہاں انصاف ہوگا میرے ساتھ۔ کوئی دھمکی نہیں دے گا، کوئی خوف نہیں ہوگا۔ راتوں کو زندگی آرام سے گزرے گی۔ چین ہوگا، امن ہوگا، اپنے مسلمانوں کے درمیان زندگی نہ پریشان ہوگی، نہ پشیمان۔ سب آزاد ہیں ہم لوگ قائداعظم کے پاکستان میں ہیں۔ وہ پاکستان جس کا خواب نہ جانے کتنوں نے دیکھا اور نہ جانے کتنوں نے جس کے لیے اپنی جانیں دے دیں۔ اسی پاکستان میں آیا تھا میں، اسی پاکستان میں۔''

''بہار میں ہندوؤں نے میرے باپ کو مار دیا تھا، وہ پاکستان کے حامی تھے۔ میں فسادات میں چھوٹی عمر میں گھر کو خاندان کو لے کر مشرقی پاکستان کے شہر کے سنتاہار پہنچ گیا تھا۔ جو کچھ سنتاہار میں گزری وہ تو پہلے سن چکے ہو ناں تم... بتا چکا ہوں ناں تمھیں... یاد ہے ناں تمھیں۔ وہ سب کچھ کہانی نہیں تھا، افسانہ نہیں تھا، اختراع نہیں تھی... سچ تھا بالکل سچ۔''

وہ بہت پہلے بتا چکے تھے جب مشرقی پاکستان میں فسادات شروع ہوئے تو وہ، ان کی بیوی، بیٹا اور بیٹی چٹاگانگ میں تھے۔ انھیں خبر ملی کہ مکتی باہنی نے سنتاہار میں ایک بھی بہاری کو زندہ نہیں چھوڑا ہے، چھ ہزار کے چھ ہزار، سب کے سب مار دیے گئے۔ ایک خاندان کو شاید کسی بنگالی گھرانے نے بچالیا تھا۔ انھوں نے پھر بھی کوشش کی تھی، اپنے بنگالی دوست شمس الرحمٰن کے ساتھ سنتاہار جانے کی۔ پر جا نہیں سکے مگر شمس الرحمٰن خبر لایا کہ سب مر گئے، نہ ماں نہ چچا نہ ماموں نہ بہن اور نہ ان کے بچے۔ مجھے یاد تھا انھوں نے ہمارے آفس میں بیٹھے بیٹھے تفصیل سے پوری داستان سنائی کہ کس طرح بچتے بچاتے بنگلہ دیش بننے کے بعد چٹاگانگ سے ایک چھوٹی سی بوٹ میں سارا خاندان دوسرے بہاریوں کے ساتھ بھاگا تھا۔ آہستہ آہستہ ڈولتا ڈانگتا ہوا، بوٹ دو دن میں برما کے ساحلی شہر اکیاب پہنچی۔ صرف بیوی اور بیٹی کے سونے کے زیورات تھے جنھیں بیچ بیچ کر وہ لوگ زندہ رہے، اکیاب میں پاکستانی سفارت خانے نے ایک شاخ کھول لی تھی۔ جہاں سے مغربی پاکستان اور خاص طور پر پنجاب کے ڈومیسائل والوں کو

فوراً ہی داخلے کا پرمٹ ملتا مگر مشرقی پاکستان کے ڈومیسائل والوں کی لمبی لائن لگتی تھی۔ ہفتوں کے انتظار کے بعد ان کی باری آتی، انھیں ٹہلایا جاتا، انھیں بہلایا جاتا، جانچ پڑتال، پوچھ گچھ کے بعد انھیں کراچی کا ٹکٹ دیا جاتا تھا۔ اسی طرح کے جھمیلوں سے گزرنے کے بعد وہ لوگ بھی پی آئی اے سے کراچی پہنچے تھے۔ سنتاہار کی کہانی ایک بڑا دکھ تھا اور مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے میں جتنے بنگالی مرے، ان کی تو یادیں ہیں، میوزیم ہے، ان کے نام پر چھٹی ہے مگر اُن ان گنت بہاریوں کا کون ہے جو تاریک راہوں میں مار ڈالے گئے، جن کی لاشوں کو گدھوں نے نوچ لیا، جن کی قبریں بھی نہ بن سکیں جو مسلمان ہوتے ہوئے مسلمان کے ہاتھوں قتل ہوگئے۔ جن کی عورتیں اغوا ہوگئیں، جو سنتاہار سے بچیں تو طوائفیں بن گئیں، جنھیں لوٹا گیا، کلکتہ کے بازارِ حسن سے تھائی لینڈ چکلوں تک ان کے جسموں کو روندے جانے کے لیے چھوڑ دیا گیا، ایک پوری حرامی نسل تیار کرنے کے لیے۔

چٹاگانگ میں چھپ چھپ کر بچ بچ کر بوٹ میں سوار ہونا، بوٹ میں ڈر ڈر کر رو رو کر اکیاب پہنچنا، برما سے لڑلڑ کر بگڑ بگڑ کر نکلنا، زندگی کیا تھی صرف جدوجہد...صرف قربانی... مگر سب کچھ گوارا... سب کچھ سہا اس لیے کہ پاکستان سے محبت تھی۔ اسلام کے لیے ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ ہندوؤں کے ہاتھوں قتل ہوئے، پاکستان کے لیے بنگال چھوڑا، بنگالیوں کے ہاتھوں پامال ہوئے۔ ان لوگوں پر بھی کوئی فلم بنے گی، ان کا بھی کہیں ذکر ہوگا... میں سوچتا رہا تھا۔

انھیں اورنگی میں کھپایا گیا، غربت کے باوجود ایک پاکستان کی محبت تھی جنھوں نے انھیں تازہ دم رکھا ہوا تھا۔ اورنگی جیسی جگہ پر بھی وہ صبر شکر کے ساتھ بس گئے تھے۔ اس حوصلے کے ساتھ کہ اب تو پاکستان میں ہیں۔ اب تو اچھا ہی ہوگا، اب تو انصاف ہوگا اسلام کا بول بالا ہوگا اور ساری دُنیا پر قبضہ کریں گے۔ زندگی شاد ہوگی، فخر سے جئیں گے ہم لوگ، عزت کے ساتھ۔ اُمیدیں، صرف اچھی اُمیدیں ہی لگائی تھیں ان لوگوں نے اور قربانی دیے چلے جارہے تھے۔

کراچی ہی میں انھوں نے ایک آفس میں ملازمت کرلی، وہ بنگلہ دیش میں بھی جماعت اسلامی میں تھے اور کراچی میں بھی جماعت میں ہی رہے۔ جب کراچی

میں مہاجر سیاست اور ایم کیو ایم کا طوفان اُٹھا اور بڑے بڑے کٹر لوگ دائیں بازو اور بائیں بازو کی اپنی سیاست، نظریہ، جدوجہد، مقصد چھوڑ کر صرف مہاجروں کے لیے کھڑے ہوگئے۔ سب کا ایک ہی نعرہ تھا کہ مہاجروں پر سندھیوں، پٹھانوں، پنجابیوں نے بہت ظلم ڈھا لیے، اب کراچی کا مزید استحصال نہیں ہوگا۔ اب کوٹہ سسٹم ختم کرنا ہوگا۔ اب کراچی کی دولت کراچی میں رہے گی۔ مہاجروں کو اپنے حقوق چھیننے ہوں گے۔ سب کو ایک ہونا ہوگا، کراچی کی ایک آواز ہوگی، کراچی کی پولیس مہاجر ہوگی، پی آئی اے میں مہاجر ہوگا، ریلوے میں مہاجر ہوگا، کے ایم سی میں مہاجر ہوگا، کے ڈی اے میں مہاجر ہوگا، میڈیکل کالج میں مہاجر پڑھیں گے اور ان کے پڑھانے والے بھی مہاجر ہی ہوں گے۔ کراچی، کراچی والوں کی جنت ہوگی یہاں امن ہوگا، امان ہوگی۔ بغیر کسی خوف کے۔

جب جوان، بوڑھے، بچے، شاعر، ادیب، صحافی، وکیل، ٹیچر، پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر ہر کوئی مہاجروں کی بولی بولنے لگا، وہ دہریے جو خدا کے سامنے نہیں جھکے تھے، مہاجریت کے پتھروں اور بتوں کو چومنے لگے، تو بھی وہ اورنگی کے اس علاقے میں اپنے گھر پر جماعت اسلامی کا جھنڈا لہراتے رہے تھے۔ سب سے دشمنی مول لے کر، پورے محلے کی مرضی کے خلاف۔

''میں ہندوستان میں باغی تھا، میں مشرقی پاکستان میں باغی تھا، میں کراچی میں بھی باغی ہی رہوں گا۔ اسلام کے لیے کچھ بھی کر گزروں گا۔'' یہ جواب دیا تھا انھوں نے ان لوگوں کو جو سیکٹر انچارج کے ساتھ ان کے گھر سے جماعت اسلامی کا جھنڈا اتارنے آئے تھے۔ ان کا غصہ، ان کا یقین اور ان کا انداز ایسا ہی تھا کہ کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکا اور نہ کچھ کرسکا تھا۔ جماعت اسلامی کا جھنڈا لہراتا رہا۔

کراچی کے سارے خواب بکھر گئے، کوئی فرق نہیں تھا کراچی کے لیڈروں میں اور سندھ، پنجاب کے پیروں، میروں، وڈیروں اور لٹیروں میں۔ وہی دہشت، وہی رعونت، وہی انداز، وہی ہتھیار اور وہی پچارو۔ وہ جن کی تہذیب مقامی تہذیب سے اعلیٰ تھی جن کی زبان اس خطے کے زبان سے زیادہ ترقی یافتہ تھی، جو تمدن لے کر آئے تھے، جو کہتے تھے وہ زیادہ تعلیم یافتہ بھی ہیں، تہذیب یافتہ بھی، وہ کم تر تہذیب کم تر

زبان کم تر تمدن سے مات کھا گئے تھے۔ روشنی روشنی کہاں ہے، دُور تک روشن اندھیرا تھا۔

نہ جانے کس کے خواب تھے نہ جانے کن لوگوں نے دیکھا اور نہ جانے کن لوگوں نے خوابوں کی تعبیر پائی۔ شہر اور شہر کے لوگ تو ٹوٹ پھوٹ کر کرچی کرچی بکھر گئے تھے۔

انھوں نے اپنے بیٹے کی شادی کراچی میں ہی کی، اور بیٹی کے لیے رشتہ تلاش کر رہے تھے۔ جب وہ دفتر میں آکر بیٹھتے تو میں ان کے چہرے کو دیکھ کر سوچتا کہ کتنا بہادر ہے یہ آدمی۔ کتنی قربانیاں دی ہیں اس نے۔ ان جیسے سیکڑوں بہاری تھے جو اپنے خاندان، اپنے پیاروں کی جانوں کا نذرانہ دینے کے باوجود دوبارہ مرنے پر تیار تھے۔ کچھ تھا لفظ پاکستان میں جادو۔ کوئی بات تھی زبان اردو میں کہ یہ لوگ جانیں ہتھیلی پر لیے گھومتے تھے۔ اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ۔

جب افغانستان کا جھگڑا شروع ہوا اور ہم لوگوں نے مجاہدین بھرتی کرنے شروع کیے تو غازی اور شہید بننے کے لیے لوگوں کی لائن لگ گئی۔ افغانستان کی جنگ بھی خوب تجربہ تھا۔ افغانستان میں کمیونسٹ انقلاب کے بعد جو بربادی ہوئی تھی اس کا فائدہ اُٹھانا بہت ضروری تھا۔ یہ وہ محاذ تھا جہاں ہم لوگوں کو اپنی کارکردگی دکھانے کا موقع ملا تھا۔ امریکا، برطانیہ، سعودی عرب اور نہ جانے کن کن طاقتوں نے مل کر جنگ شروع کی تھی۔ یہ جنگ تو ان دھریوں کے خلاف تھی جنھوں نے مصر میں اخوان المسلمین کے لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ یہ جہاد تھا ان خدا دشمنوں کے خلاف جنھوں نے تاشقند کی مسجدوں میں شراب خانے کھولے تھے۔ انتقام، خدا کا انتقام ضروری تھا، چاہے امریکا کی ہی مدد سے کیوں نہ ہو۔ ملک میں موجود ہر قسم کے مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہ جنگ، یہ جہاد ضروری ہے اور جنگ لڑی جائے گی، جیتی جائے گی۔

وہ خود تو نہیں گئے افغانستان، مگر زبردست جوش و جذبے کے ساتھ جماعت اسلامی کے لیے مجاہدین جمع کیے انھوں نے۔ نئے مجاہدوں کو سمجھانا پڑھانا، جہاد کا جذبہ جگانا، روسی دھریوں اور کمیونسٹ افغانی فوج سے لڑنے کے لیے جماعت کے لٹریچر کو

پھیلانا، یہ ذمہ داری انھیں دی گئی اور اس ذمہ داری کو انھوں نے خوب نبھایا۔ دن رات ایک کر دی تھی انھوں نے۔ گھنٹوں آفس میں بیٹھے تقریر کرتے تھے۔ وہ لوگ جو اس جہاد کے بارے میں جاننے آتے تھے، جو بھرتی چاہتے تھے، جو افغانستان جا کر لڑنا چاہتے تھے۔نہ جانے کتنی بار وہ نوجوانوں کے گروپ کے ساتھ پشاور گئے اور جب بھی آتے تھے ولولے کے ساتھ ایک طوفان ہوتا تھا ان کے دل میں، ان کی باتوں میں۔ روسیوں کا تختہ ہونے والا تھا۔ افغانستان آزاد ہونے والا تھا اور اسلام کا سورج پھر اُبھر کر دُنیا بھر میں حکومت کرنے کے لیے تیار تھا۔ روزانہ آفس میں میٹنگ ہوتی۔ جہاد سے آنے والے آکر اپنے قصے سناتے، نئے مجاہدوں کا حوصلہ بڑھایا جاتا۔ جہاد میں شہد ہونے والوں کے لیے قرآن خوانی ہوتی۔ ان کے گھروں پر اجتماع کیا جاتا۔ ہر کوئی اس کام میں اس طرح سے جڑا تھا جیسے یہ جنگ اُس کی جنگ ہے، جیسے یہ جہاد ایسا جہاد ہے جس میں جیت ہی مقدر ہے، جو جنت کا واحد راستہ ہے۔

میں نے پھر نظر بھر کر ان کے چہرے کو دیکھا۔ وہ چہرہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ چہرہ جس کو دیکھ کر مجھے لگتا تھا کہ ایک دن وہی سب کچھ ہوگا جس کا خواب ہم سب دیکھتے رہے ہیں۔ وہ ہاتھ جو جھنڈا اٹھایا کرتے تھے، تھرتھرا رہے ہیں اور وہ ہونٹ جو فلک شگاف نعرے لگاتے تھے، کپکپارہے ہیں۔ مجھے یاد ہے، افغانستان سے روسیوں کے بھاگنے پر وہ کس قدر خوش ہوئے تھے۔ ایسا لگا جیسے دنیا فتح ہوگئی ہے، بہ قول ان کے یہ پہلی جست تھی کئی سال کے بعد۔ پاکستان بنا تھا تو خوشی ہوئی تھی پھر پینسٹھ کی جنگ بھٹو اور مجیب کی جیت، پھر ۷۱ء کا حادثہ ایسا لگتا تھا جیسے ساری نظریاتی جنگیں ویت نام کی طرح ہاری جائیں گی۔ پھر طالبان کی فتح کے دن تو ان کا چہرہ خوشی سے اس طرح ٹمٹما رہا تھا کہ میرے پاس کوئی مثال تک نہیں ہے اس خوشی کو بیان کرنے کے لیے۔

انھوں نے جوش سے کہا تھا، اب انگلینڈ اور امریکا کا بھی یہی حشر ہوگا۔ یہ ساری شیطانی طاقتیں ہیں، طالبان کے سامنے کون رک سکتا ہے۔ سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی اس وقت۔ پاکستان کے ہر کونے سے یہی آواز آ رہی تھی کہ مدرسے کے طالب علموں نے پھر سے ملت اسلامیہ کی قسمت جگا دی ہے۔ بڑے جلسے کیے گئے، بڑا ہنگامہ اُٹھایا گیا۔ کئی سال کے بعد پھر ایک بار مسلمانوں نے جنگ جیتی

تھی۔ جنگ کمیونسٹوں اور دہریوں کے خلاف۔ ہم کو ایسا لگا تھا جیسے اسلامی انقلاب بہت قریب آگیا ہے۔

ان کے چہرے پر دھواں دھواں مایوسی اور اداسی کے بادل گھرے سے گھرے ہوتے جا رہے تھے، بڑی بے چارگی سے، تقریباً روتے ہوئے انھوں نے کہا، ''کیا جرم کیا تھا میری بیٹی نے؟ کیا قصور تھا میری بہو کا کہ ان کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا؟ یا خدا میں چارپائی پر بندھا بندھا مر کیوں نہیں گیا۔ کیوں موت نہیں آئی مجھ کو۔ بنگالیوں نے تو ہم لوگوں کو مارا تھا کیوں کہ ہم ان کے غدار تھے، غدار کی سزا تو موت ہی ہوتی ہے، ہم نے بھی تو ڈھاکا ڈوبنے سے پہلے بہت سارے بنگالیوں کی جانیں لی تھیں، غدار تھے وہ، اندرا گاندھی کے چیلے مکتی باہنی کے لوگ، پر یہاں کیا تھے ہم لوگ؟ کیا کیا تھا ہم نے؟ کیا بتاؤں گا میں احمد کو جب وہ واپس آئے گا؟ کس نے مارا اس کی بیوی کو بہن کو، اجرک میں لپٹے ہوئے اپنے ہی چہروں نے پامال کیا ہے میرے خاندان کو۔ ہندو نہیں تھے وہ لوگ، مسلمان تھے، مسلمان! کسی کا نام ظہیر تھا، کوئی شریف تھا اور کوئی رفیق... وہ کیوں گیا تھا جہاد کرتے اپنے گھر کو چھوڑ کر، اپنی بیوی کو ہمارے حفاظت میں دے کر۔ خدا کی راہ میں کافروں سے لڑنے کے لیے۔ ان مسلمان لڑکیوں کی جان بچانے، جن کی عزتیں بھارتی فوجی درندے بن کر پامال کر رہے ہیں۔ ان لٹیروں سے آزادی کی جنگ لڑنے گیا ہے، جنھوں نے مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کی مدد سے ہزاروں بہاریوں کی مارا ڈالا تھا۔ جن کی لاشوں پر رقص کیا تھا ان لوگوں نے۔ وہ کشمیر میں عزتیں بچا رہا ہے اور یہاں پر اس کے گھر میں عزتیں لٹ رہی ہیں۔ وہ سب کچھ ہوا ہے جو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا...''

ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوچکی تھی، ان کی بیوی نہ جانے دیوار پر کیا تک رہی تھیں؟ وہ آواز کے ساتھ ہچکیاں لے رہے تھے، مجھ میں بالکل بھی ہمت نہیں تھی کہ میں ان سے کوئی بات کرتا، کچھ کہتا۔ کیسے انھیں بتاتا کہ احمد اب کبھی نہیں آئے گا وہ سری نگر میں مجاہدوں کے ساتھ لڑتا لڑتا شہید ہوگیا ہے۔ جھیل ڈل کے کنارے کسی درخت کے ساتھ باندھ کر ہندوستانی فوجیوں نے اس کے جسم کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا ہے۔

میں انھیں یہی بتانے آیا تھا۔ یہی ذمہ داری مجھے جماعت نے دی تھی کہ میں خاندان کو خبر کروں کہ احمد نے شہادت کا بلند درجہ پر پالیا ہے۔

میں ان کے آنسو بھرے چہرے کے سامنے بیٹھا رہا، زمین میرے پیروں کے نیچے ناچتی رہی، آسمان میرے سر کے اوپر گھومتا رہا۔

□

نربان

کچھ بھی نہیں تھا دونوں رانوں کے درمیان میں۔ صاف اور سپاٹ، صرف چھوٹا سا ایک سوراخ جس میں ڈاکٹروں نے ایک نلکی سی ڈالی ہوئی تھی جہاں سے پیشاب ایک تھیلی میں جمع کر رہے تھے۔ مرنے کے بعد نلکی نکالی جاچکی تھی۔ جسم کو نہلا دُھلا کر ہم سب لوگوں نے صاف ستھرا کر دیا۔ زلفی نے بہت ساری روئی پانی میں ہلکے سے بھگو کر رانوں کے درمیان میں گوند سے چپکانا شروع کردیا تھا۔ جسم... جسے قدرت نے نامکمل چھوڑ دیا تھا اسے دفن کرنے سے پہلے مکمل کرنا ضروری ہے۔ قبر میں انسان کو مکمل جانا چاہیے۔ زلفی نے مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر گلے لگایا اور بہت پیار سے دھیرے دھیرے یہ بات مجھ سے کہی تھی۔ میں غم سے ویسے ہی بے حال تھی نہ جانے کیا ہوا مجھے، میں بے قابو ہو کر چھری اُٹھا لائی، لیلیٰ، شیدا، روحی کے پکڑنے سے پہلے پہلے اپنی رانوں کے درمیان میں چاقو چلاچکی تھی۔ ''میں مرنا نہیں چاہتی ہوں ڈاکٹر! میں نے اپنے آپ کو مارنا نہیں تھا میں تو صرف اپنے جسم کے فالتو ٹکڑے سے گرو کے جسم کو مکمل کرنا چاہتی تھی۔'' یہی تو کر رہے تھے وہ لوگ!!

اتنا کہہ کر وہ پھر بے ہوش سا ہوگیا تھا۔ یہ ایک عجیب و غریب مریض تھا یا تھی۔ میں نے آج سے پہلے اس قسم کا مریض نہیں دیکھا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا اور میں ہسپتال سے نکلنے والا ہی تھا کہ یکایک ایمرجنسی کال آئی تھی۔ میرے ایک جونیئر

ڈاکٹر نے مجھے بلایا۔ کیوں کہ ایک عجیب و غریب سلسلے کے ساتھ ایک مریض کو لایا گیا تھا۔ شعبۂ حادثات میں باہر ہی چار پانچ ہیجڑے پریشان صورت کھڑے تھے اور اندر یہ مریض تھا۔ اس کا نام نیلو تھا۔

اس کا چہرہ کسی سفید کاغذ کی طرح سفید سا ہو رہا تھا۔ چہرے پر نقاہت تھی اور آنکھیں کبھی کھلتی تھیں اور کبھی بند ہو جاتی تھیں۔ خون آلود شلوار زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے وہ تقریباً بے ہوش تھا۔ دونوں بازوؤں میں ڈرپ لگادی گئی تھی۔ رحیم نے مجھے بتایا کہ خون کا انتظام ہوگیا ہے اور خون آنے ہی والا ہے۔ رانوں کے درمیان میں جہاں سے خون بہہ رہا تھا، اس نے کس کر پٹی باندھ دی، جس سے فی الحال خون بہنا بند ہوگیا تھا۔ اس کے لیے تھیٹر کا انتظام ہوگیا ہے اور بے ہوش کرنے والے ڈاکٹر وہاں انتظار کررہے ہیں۔

میں نے کہا تھا کہ خون لگا کر فوراً مریض کو تھیٹر پہنچاؤ تاکہ آپریشن کر کے خون کو بہنے سے روکا جائے۔ ساتھ ہی چار مزید خون کی بوتلوں کا انتظام کر لینا۔

مریض کو بھیجنے کے بعد میں نے رشتے داروں کا معلوم کیا تو پتا چلا کہ ساتھ میں کچھ ہیجڑے آئے ہوئے ہیں۔ میں نے انھیں اندر بلالیا تھا۔

وہ چار تھے، چاروں لڑکیوں کے لباس میں۔ چہروں پر بگڑا ہوا میک اپ اور شکل سے ہی سخت پریشان لگ رہے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ سارے کے سارے بہت دیر سے رو رہے ہوں۔ ان کے پریشان اور پُراضطراب چہروں پہ بلا کی سنجیدگی تھی۔ سارے چہرے لٹے پٹے، ساری ہی آنکھیں ویران سی تھیں۔

میں نے انھیں تسلی دی اور بتایا تھا کہ نیلو کی جان کو اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں ابھی آپریشن تھیٹر جارہا ہوں وہاں چھوٹا سا آپریشن کرنا ہوگا، اُمید ہے کہ اس کے بعد خون بہنا بند ہوجائے گا پھر دوچار دن ہسپتال میں رہنے کے بعد اسے گھر بھیج دیں گے۔ وہ بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔ کوئی بھی فکر کی بات نہیں ہے۔ میں نے دیکھا ان کے چہروں پر ایک اطمینان کی لہر سی دوڑ گئی ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ یہ سب کچھ ہوا کیسے تھا؟

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد ان چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر

زلفی نے کہا کہ پتا نہیں کیا ہوا سر جی۔ ہمارے گرو کی موت ہوگئی ہے وہ ہسپتال میں تھے۔ پھر اُدھر ہی مر گئے۔ آج ان کو دفن کرنا تھا۔ ہم سب ان کا جسم بنارہے تھے، جنازے کے لیے تیار کر رہے تھے انھیں، نہ جانے کیوں نیلو نے اپنا جسم کاٹ لیا۔ میں بات ہی کررہا تھا کہ آپریشن تھیٹر سے میرے لیے بلاوا آگیا تھا۔

بے ہوش کرنے کے بعد پٹیاں اور روئی ہٹاکر دیکھا تھا تو عجیب ہی صورت حال کا سامنا تھا۔ جسم بری طرح سے زخمی تھا۔ دونوں فوطے کٹے ہوئے، کھال کے ساتھ جسم سے جڑے ہوئے تھے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ پیشاب کے لیے چھوٹی سی نالی بناکر بقیہ سب کچھ نکال دیا جائے۔ آپریشن مشکل نہیں تھا، البتہ طویل تھا۔ چھوٹی چھوٹی خون کی نسوں سے خون بہہ رہا تھا، ہر جگہ پر ٹانکے لگا کرخون کو روکا، اس تمام عمل میں دو گھنٹے لگ گئے، آپریشن کے بعد مریض کو وارڈ شفٹ کردیا گیا تھا۔

میں واپسی میں سوچتا رہا کہ کیوں کیا تھا اس نے ایسا؟ آخر ایسی کیا صورت حال ہوگئی تھی کہ اس کو اس قسم کا فیصلہ کرنا پڑ گیا۔ آسان نہیں ہوتا ہے انسان کے لیے اپنے جسم کو کاٹنا، اپنے آپ کو زخمی کرنا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

دوسرے دن وارڈ میں وہ بستر پر خاموش سا لیٹا ہوا تھا۔ میں نے جا کر دیکھا، کہ پیشاب کی تھیلی ٹھیک لگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ گزشتہ سولہ گھنٹوں میں پیشاب مناسب مقدار میں بنا ہے۔ مریض نے درد کی شکایت کی تھی جس کے لیے اسے دوا دے دی گئی تھی۔ اس وقت وہ ہوش میں تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کا آپریشن میں نے ہی کیا ہے۔ اس کے چہرے پر بے چارگی تھی۔ آنکھوں میں تشکر اور شکایت مجھے تو دونوں ہی چیزیں محسوس ہوئی تھیں۔

میں نے خیریت پوچھی، اس کے شانوں کو تھپ تھپا کر یقین دہانی کرائی کہ وہ ٹھیک ہوجائے گا، اسے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ ان ہیجڑوں سے ملنا چاہتا ہے جو باہر بیٹھے ہیں۔

اس کے چہرے پر رونق آگئی تھی۔ ''ضرور، میں تو سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھے بھول گئے ہیں۔ مجھے نکال دیا ہے، آخر کوئی آیا کیوں نہیں تھا۔''

میں نے اسے بتایا کہ پندرہ بیس ہیجڑے رات بھر یہاں بیٹھے رہے ہیں،

خون کی آٹھ بوتلیں بھی انھوں نے ہی دی ہیں۔

زرد چہرے پر مسکراہٹ بکھر کر پھیل گئی تھی، لانبی لانبی پلکیں جھپک کر اس نے کم زوری کے باوجود بڑی ادا سے مجھے دیکھا تھا۔ میں نے اگر اس کے مردانہ اعضا خود نہیں کاٹے ہوتے تو مجھے بھی اُس کی اِس ادا پر پیار سا آجاتا۔ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ اس کے لانبے لانبے بالوں اور چہرے کی بناوٹ میں بلا کی نسوانیت ہے۔ میں نے نرس سے کہا تھا کہ باہر بیٹھے ہوئے ہیجڑوں کو تھوڑی دیر کے لیے چار چار کے گروپ میں اندر لا کر نیلو سے ملا دیں۔

میں ابھی اندر ہی تھا کہ زلفی اور تین ہیجڑے آئے تھے۔ بڑا جذباتی منظر تھا۔ وہ سب کے سب اس کے قریب سے قریب ہونا چاہ رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں کو چوم کر، اس کے بالوں کو پکڑ کر، اس کے ماتھے کو تھام کر، اس کی آنکھوں سے اپنی آنکھوں کو ملا کر اور اس کے پیروں کو دبا کر ان لوگوں نے محبت کے اظہار کے ہر طریقے سے اسے نہال کر دیا تھا۔ اس کا چہرہ ہشاش بشاش ہوگیا۔ میں نے اسے مسکرا کر دیکھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

وہ جوان آدمی تھا۔ تیس سال سے زیادہ عمر نہیں تھی اس کی۔ زخم جلدی جلدی بھر رہا تھا اور جسم میں بڑی تیزی سے طاقت آتی جا رہی تھی۔

آپریشن کے چوتھے دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس نے دروازے پر دستک دی اور کمرے میں آگیا تھا۔

''کیا بات ہے نیلو۔'' میں نے پوچھا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں کتنے دنوں میں گھر چلی جاؤں گی؟'' اس نے سوال کیا۔

''جلد بہت جلد، تین چار دنوں کے اندر ہی تمھیں بھیج دیں گے۔'' میں نے جواب دیا تھا۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں ناں؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

''میں سچ ہی کہہ رہا ہوں مگر تمھیں اتنی جلدی کاہے کی ہے۔ ابھی تو تم بالکل ٹھیک بھی نہیں ہوئے ہو پھر تم نے مجھے بتایا بھی نہیں ہے کہ تم نے یہ سب کچھ کیا کیوں؟'' میں نے جواب دیا تھا۔

اس کے چہرے پر تاریکی سی آئی اور آ کر چلی گئی تھی۔ ''ڈاکٹر صاحب گرو کا تیرھواں ہوگا ایک ہفتے کے بعد۔ اس وقت تک تو میں چلی جاؤں گی ناں۔'' اس نے بڑی لجاجت سے پوچھا تھا۔

''ضرور چلے جاؤ گے۔'' میں نے یہ سمجھے بغیر جواب دیا کہ وہ اپنے آپ کو لڑکی کی طرح بلا رہا تھا۔ وہ میرے دوسرے سوال کا جواب دیے بغیر ہی کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

آہستہ آہستہ اس کے زخم بھر گئے۔ ڈاکٹروں اور نرسوں نے بتایا کہ وہ ہر وقت ایک اداس سی کیفیت سے دوچار رہتا ہے۔ اس کے سارے ملنے والے ہیجڑے تھے اور ہر وقت کوئی نہ کوئی وہاں موجود ہی رہتا تھا۔ نرسوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ اس کا بہت خیال کر رہے ہیں۔ جو بھی چیزیں منگائی جاتی ہیں فوراً ہی مہیا کر دیتے ہیں۔

میں بچپن سے ہیجڑوں کو دیکھتا چلا آرہا تھا مگر میں نے کبھی بھی ان کے بارے میں سوچا نہیں تھا کہ ان کی سماج میں حیثیت کیا ہے؟ یہ کہاں سے آئے ہیں؟ کون لوگ ہوتے ہیں؟ کیا ان کا گھر ہوتا ہے، ان کے خاندان ہوتے ہیں، رشتے ہوتے ہیں، ذمہ داری ہوتی ہے؟ اس قسم کے سوالات کا کبھی بھی کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا بلکہ ایک عجیب نامحسوس طریقے سے میرے اور میرے جیسے بچوں کے ذہنوں میں یہ بات ڈال دی جاتی ہے کہ یہ لوگ بھٹکے ہوئے ہیں، قابل نفرت ہیں، جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ لوگ انھیں چھیڑتے ہیں، ان کا مذاق اُڑایا جاتا ہے، انھیں تکلیف پہنچائی جاتی ہے اور محلے کا کوئی بہادر مرد ان کو مارتا بھی رہتا ہے۔

نیلو میرے لیے ایک معما تھا، بہت سارے ہیجڑوں کا میرے وارڈ میں آنا جانا بھی میرے لیے بالکل ہی ایک نیا تجربہ تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کس طرح سے یہ لوگ ایک گروپ کی شکل میں آتے جاتے تھے، نیلو کی ایک ایک ضرورت کا خیال رکھتے۔ مجھے کچھ ایسا احساس سا ہوا کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی وہاں موجود رہ کر نیلو کی اہمیت کا احساس دلا رہا ہے۔ ان لوگوں کے درمیان ایک مل جل کر رہنے کا جذبہ تھا، ایک کمیونٹی اسپرٹ تھی۔ ایک دوسرے کے لیے قربانی دینے کا جذبہ تھا اور ایک دوسرے کے لیے خلوص اور پیار کی بھرمار تھی۔ میں نے سوچا کہ نیلو کو ڈسچارج کرنے سے پہلے نیلو اور

زلفی کو بٹھا کر ان سے باتیں کر کے ان کے اندر کے حالات کا پتا کرنے کی کوشش کروں گا۔

دوسرے دن صبح صبح میں اپنے کمرے میں پہنچا تو نیلو پہلے ہی سے میرے کمرے کے باہر میرا انتظار کر رہا تھا۔ ایک اداس سی مسکراہٹ سے اس نے میرا استقبال کیا۔

''سویرے سویرے... خیر تو ہے؟'' میں نے بھی مسکرا کر پوچھا۔ ''آجاؤ اندر آجاؤ۔''

وہ اندر آ کر میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''بولو، کیا بات ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ میرے مائی باپ ہو، میرے سب کچھ ہو۔ آپ سے صرف یہ بولنے آئی ہوں کہ آپ کو کبھی بھول نہیں سکتی ہوں۔ آپ نے مجھے پورا کیا ہے، مجھے بنا دیا ہے، میری زندگی صحیح کردی ہے۔ گرو نے مجھے زندگی دی تھی، جب میں مرنے جارہی تھی اس نے مجھے اپنایا تھا، بچایا تھا، سینے سے لگا کر گھر میں بسایا تھا، آپ نے اس زندگی کو جو گرو نے بچائی تھی، صحیح کر دیا ہے۔ اب میں صحیح ہوگئی ہوں تو گرو مرگئے ہیں۔ کیوں مرگئے ہیں وہ ڈاکٹر صاحب! کیوں مرجاتے ہیں لوگ... سارے اچھے لوگ...''

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ زلفی نے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ گرو کراچی کے ہیجڑوں کے ایک گروپ کا گرو تھا۔ وہ سب لوگ ساتھ رہتے تھے ایک کمیونٹی کی صورت میں۔ سب مل کر کماتے اور مل کر ہی کھاتے تھے، ایک دوسرے کے غم سے آشنا اور ایک دوسرے کے سکھ دکھ میں شامل۔ نیلو ابھی نیا آیا تھا۔ گرو ہی اسے لے کر آئے تھے اور نیلو گرو سے شدید محبت کرتا تھا۔

میں نے ٹشو پیپر کے ڈبے سے ٹشو پیپر نکال کر نیلو کو دیا اور کہا، ''نیلو زندگی موت تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی کیوں مرتا ہے، جیتا ہے یہ تو اسی کے کھیل ہیں کوئی کیوں تمھاری طرح اور تمھارے گرو کی طرح رہتا ہے، یہ بھی اسی کے بھید ہیں۔ میں نے تو وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے۔ مجھے اس کے پیسے ملتے ہیں۔ حکومت تنخواہ

دیتی ہے مجھے مگر تم یہ بتاؤ تم نے کیوں کیا تھا ایسا؟ کیوں لے رہے تھے جان اپنی؟ تھوڑا سا اور خون بہہ جاتا تو تم مر جاتے۔ ایسے کوئی کاٹتا ہے اپنے آپ کو؟"

میں دیکھا تھا کہ اس کی کاجل بھری بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو کے قطرے ٹمٹمارہے ہیں جو تھوڑی دیر میں آنکھوں سے چھلک چھلک کر گالوں پر بہتے ہوئے زمین پر ٹپکنے لگے تھے۔

میں نے ایک اور ٹشو پیپر اس کو دیا تھا۔خدایا، اس کی آنکھوں کا کرب اس کے اندر کا دکھ! میرے بہت اندر کسی انسان کی جیسے چیخ نکل گئی تھی میں اٹھ کر اس کے قریب چلا گیا اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر کہا، "مت روؤ نیلو! مجھے بتاؤ تمھارا کیا مسئلہ ہے؟ میں تمھاری مدد کروں گا۔"

اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے اعتبار کرتا ہو۔ میں نے گھنٹی بجا کر ماسی رحیمہ سے کہا کہ چائے لے کر آئے اور فرج سے پانی نکال کر گلاس اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

وہ مجھے غور سے دیکھتا رہا پھر بولا، "ڈاکٹر صاحب! میں پیدا ہوا تو لڑکا تھا۔ ہر کوئی مجھے لڑکا ہی سمجھتا تھا۔ مجھے لڑکا ہی بنا کر پالا گیا، لڑکا ہی بنا کر بڑا کیا گیا، مگر میں لڑکا نہیں تھا۔ مجھے اپنی بہنوں کے ساتھ رہنا اچھا لگتا تھا۔ مجھے ان کے رنگ برنگے کپڑے بھاتے تھے، ان کے لمبے بال، ان کی ربن، ان کی چوڑیاں، ان کی ایئر رنگ، ان کی لپ اسٹک، ان کی کریم اور ان کے پرفیوم سب اچھے لگتے تھے۔ میرا دل کرتا تھا مجھے ان کے کپڑے پہنائے جائیں مگر میری کوئی نہیں سنتا تھا۔ ایک دن اسکول سے آکر میں نے اپنی بہن کے کپڑے پہن لیے اور اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ رہی تھی کہ میری ماں کمرے میں آگئیں، میری ماں بڑی اچھی عورت تھیں، مجھے بے انتہا پیار کرتی تھیں مگر اس کے باوجود وہ یہ برداشت نہیں کر سکی تھیں۔ انھوں نے اس دن مارا تھا مجھے۔ میری بہن کو ڈانٹا تھا جس نے مجھے کپڑے دیے تھے۔ مگر میرا شوق ختم نہیں ہوسکا تھا، ان کی ڈانٹ مار اور بار بار کی سرزنش کے باوجود۔

میں بڑی ہوگئی۔ میری آواز بھاری ہو رہی تھی۔ مگر میں بنا بنا کر دھیمی باریک آواز میں بولتی تھی۔ میری چال مردانہ تھی مگر میں لچک لچک کر لڑکیوں کی طرح چلنے کی

کوشش کرتی تھی۔ میں لڑکیوں کے ساتھ رہنا چاہتی مگر مجھے لڑکوں کے ساتھ آنا جانا پڑتا تھا۔ کوئی بھی میری بات نہ سمجھتا اور نہ ہی سمجھنے کی کوشش کرتا۔ یہاں تک کہ میں نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا۔ میرے بڑے اچھے نمبر تھے مجھے داخلہ بھی ڈی جے سائنس کالج میں ملا۔ میں پڑھنے میں بہت اچھی تھی ساتھ ہی مجھے اپنے آپ سے محبت اور اپنے جسم سے شدید نفرت ہوگئی تھی۔ میں ایک لڑکی تھی مگر قدرت نے مجھے ایک مرد کے جسم میں قید کر دیا تھا۔ ایک ایسا جسم مجھے دیا گیا تھا جو میرا نہیں تھا۔ یہ کمر، یہ کولہے، یہ چھاتی تو کسی مرد کے تھے جو نہ جانے کیسے میری روح کے حوالے کر دیے گئے تھے۔ میری روح قید تھی ایک ایسے جسم میں جو اجنبی تھا میرے لیے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح سے میں اپنے اس مردانہ جسم سے جان چھڑاؤں۔ میرے جسم کے اعضا میرے نہیں تھے۔ میں خواب میں دیکھتی تھی کہ میری چھاتیاں بن گئی ہیں، میری کمر نازک ہوگئی ہے اور میں امراؤ جان کی ''ریکھا'' کی طرح اپنے جسم کو مٹکا مٹکا کر ناچ رہی ہوں۔ مگر یہ سب کچھ خواب ہی ہوتا... دن اور رات مجھے مرد بن کر ہی رہنا ہوتا تھا۔ میں گھر میں اجنبی تھی اور گھر کے باہر لڑکے میرا مذاق اُڑاتے تھے۔ میں نے فرسٹ ایئر کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ مگر اپنے اندر میں اکیلی تھی، بالکل تنہا۔ میں گھنٹوں اپنے چہرے اور مونچھوں کے بالوں کو نوچتی رہتی۔ اپنے آپ سے لڑتی رہتی اور اپنے اندر مرتی جیتی رہتی تھی۔''

میں بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ میرے دماغ میں جیسے سنسناہٹ سی ہورہی تھی اور مجھے یقین تھا کہ میرے چہرے پر میرا تعجب عیاں ہوچکا ہے۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ کو بھی حیرت ہورہی ہے اور میری ساری زندگی اسی قسم کی حیرتوں اور نفرتوں سے لڑتے ہوئے گزر گئی ہے، صرف گرو نے میری بات سمجھی تھی اور مجھے سکھ دیا تھا۔ کتنے اچھے تھے وہ۔ ایک عورت کے جسم میں قید مرد بھرپور مرد جنھوں نے مجھے زندگی کی بھیک دی، مجھے اپنایا۔ اور اس دنیا میں رہنا سکھایا تھا۔''

''ہاں مجھے حیرت تو ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے تم سے نفرت ہے۔ مجھ پر بھروسا کرو میں تمھاری مدد کروں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''مدد تو میری آپ کر چکے ہیں مگر میں آپ کو بتاؤں گی کہ یہاں تک میں

کیسے پہنچی ہوں۔'' اس نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا اور بولنے لگی، ''ڈاکٹر صاحب پھر میں نے انٹر بڑے اچھے نمبروں سے پاس کر لیا اور میرا داخلہ میڈیکل کالج میں ہوگیا، مگر میڈیکل کالج مجھے بالکل ہی راس نہیں آیا۔ وہ سب میرا مذاق اُڑاتے، مجھے تنگ کرتے، میری نقل کرتے، یہاں تک کہ میں رو رو دیتی تھی۔ ایسے میں مجھے سلیم ملا۔ وہ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ اس نے میرا مذاق بھی نہیں اڑایا، اچھے طریقے سے بات بھی کی تھی۔ میں ذہین تھی، پڑھنے میں بہت تیز ایک اسپی مین (speciemen) میں نے ہی اسے سمجھایا تھا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا، پھر ہماری دوستی ہوگئی، ٹگ شاپ پر پہلی دفعہ میرے چائے کے پیسے بھی اسی نے دیے تھے۔ وہ میری زندگی کا پہلا رومانس تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس پر عاشق ہوگئی تھی۔ وہ مجھے اچھا لگا، بہت اچھا۔ میں ہر وقت اس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی، اس کے ساتھ گھومنا چاہتی تھی، لائبریری میں اس کے ساتھ بیٹھنا چاہتی تھی، مگر یہ سب کچھ نہ ہوسکا۔لڑکے میرے ساتھ اسے بھی چھیڑنے لگے، اس کا بھی مذاق اُڑانا شروع کر دیا پھر اس نے ایک دن بڑی درشتگی سے مجھے اپنے ساتھ گھومنے سے منع کردیا اور ہماری دوستی یکایک ختم ہوگئی۔

یہ صدمہ میں برداشت نہ کرسکی تھی۔ سلیم نے صحیح ہی کیا، اس کے لیے میں ایک لڑکا تھی اور لڑکے سے لڑکے کے تعلقات نہیں ہوسکتے۔ مگر مجھے پتا تھا کہ میں لڑکا نہیں ہوں، میں لڑکی ہوں، لڑکے جسم میں گرفتار۔ مجھے ایک بوتل میں بند کر دیا گیا تھا۔ مجھے نکلنا تھا اس بوتل سے اور بوتل ٹوٹ نہیں رہی تھی۔ میں نے میڈیکل کالج جانا بند کردیا۔

میری ماں اور میرے بڑے بھائی نے مجھے بہت سمجھایا پھر مجھے سول ہسپتال ایک سائیکاٹرسٹ کے پاس لے گئے، مجھے ابھی تک وہ بدتمیز ڈاکٹر یاد ہے۔ میری ماں اور بھائی باہر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے کئی لڑکے اور لڑکیوں کے سامنے ننگا کر دیا۔ میرے چاروں طرف گھوما، ایک ایک لڑکے لڑکی کو بلا کر دکھایا، پھر بڑے زور سے ہنس کر بولا کہ یہ بے وقوف اپنے آپ کو لڑکی سمجھتا ہے، میاں اپنا دماغ درست کرو، تمھیں اللہ نے مرد بنا کر بھیجا ہے، مرد ہی بن کر رہو۔ عجیب عجیب شوق ہیں لوگوں کے آج کل۔ اس نے اندر کی بھرپور نفرت کے ساتھ مجھے دیکھ کر کہا تھا... مجھے باہر بھیج کر پھر

میری ماں اور بھائی سے بھی اس نے یہی کہا تھا۔ میری ماں رو دی۔ میرا بھائی پہلے ہی ناراض تھا اور اب مزید ناراض ہو کر مجھ پر چیخا تھا۔

''ہم سب کی زندگی اجیرن کردی ہے تم نے۔ تم یہ دماغ سے فتور نکال دو کہ تم ایک لڑکی ہو۔ تم مرد ہو! مرد ہو! مرد ہو۔ اور مرد بن کر رہو۔''

میں گھر آکر بے چین ہوگئی، میں کلنک کا ٹیکہ تھی خاندان کے لیے۔ لیکن میں کیا کرتی، کس طرح سے سمجھاتی کہ میں قدرت کا ایک مذاق ہوں۔ کہیں کسی سے غلطی ہوگئی ہے۔ میں مرد نہیں ہوں، میں لڑکی ہوں۔ کبھی کبھی میرا دل کرتا کہ چاقو سے اپنے جسم کے فالتو حصے کو کاٹ پیٹ کر پھینک دوں، شہر کے بیچ چوراہے پر ننگی کھڑی ہو کر اعلان کردوں کہ لوگو! لو دیکھو میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھتے ہو... میں لڑکی ہوں! لڑکی ہوں! لڑکی ہوں...!

میں کمرے میں بند رہتی، خدا سے دعا کرتی کہ اللہ یا تو میرا جسم بدل دے، یا پھر اسے میرے ذہن کی طرح بنا دے۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو میرا ذہن بدل دے اسے میرے جسم کی طرح بنا دے۔ مگر میری دعائیں محض دعائیں ہی رہیں۔ میری التجائیں محض التجائیں رہیں، میری خواہشیں صرف خواہشیں رہیں۔

ایک دن میری ماں نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے ایک بابا کے پاس لے جانا چاہتی ہیں۔ انھوں نے بہت سے مسئلے حل کیے ہیں، وہ مجھے بھی ٹھیک کر دیں گے۔ میں خوشی سے بے قابو ہوگئی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری دعائیں رنگ لائی ہیں۔ اوپر والے تک میری آواز پہنچ گئی ہے، سن لی ہے پکار میری۔ میرے بنانے والے نے، کچھ ہونے والا ہے۔ میری قید ختم ہو جائے گی، ایک تتلی کی طرح اُڑوں گی میں۔ شاخ شاخ، درخت درخت، پھول پھول۔ مگر وہ میری زندگی کا سب سے بھیانک تجربہ ہے۔

اس بابا نے میری ماں سے کہا تھا کہ میرے اوپر سایہ ہے اور ہندوؤں کی ایک خبیث روح نے میرے جسم میں گھس کر مجھے ناپاک کر دیا ہے۔ مجھے تعویذ باندھ دیا گیا اور بابا نے کہا کہ اکیس دن کے عمل کے بعد میرا دماغ خود بہ خود درست ہوجائے گا۔ بابا نے کمرہ بند کر کے اکیلے میں مجھ سے کہا تھا کہ مجھے یہ ڈھونگ چھوڑنا ہوگا، جیسے وہ کسی روح سے بات کر رہا ہو، میرے سامنے روحانی بابا کی تصویر چیخ کر ٹوٹ گئی، مجھے اندر

سے پتا تھا کہ یہ جھوٹا ہے، یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میرے اندر خبیث ہندو کی روح نہیں ہے۔ یہ لوگ سمجھتے کیوں نہیں ہیں؟ یہ مانتے کیوں نہیں ہیں؟ ماں کے پیٹ میں اگر فرشتے انسان کو بناتے ہیں تو کیا فرشتوں سے غلطی نہیں ہوسکتی ہے۔

میں نے ماں کے کہنے پر تعویذ بھی باندھا، بابا نے پیسے لے کر اکیس دن کا وظیفہ بھی کیا مگر میں نہیں بہل سکی تھی۔ سوائے میری ماں کے میرے تمام گھر والے مجھے دیوانہ سمجھنے لگے تھے۔ وہ مجھ سے نفرت کرتے، میں ان کے لیے ایک شرم ناک اشتہار بن کر رہ گئی تھی۔ مجھے بھی اپنے جسم سے مزید نفرت ہوگئی، مجھے اوپر والے کی اس ناانصافی پر شدید غصہ آنے لگا تھا۔

ایسے ہی ایک دن میری پریشان ماں مجھے ایک اور سائیکاٹرسٹ کے پاس لے گئی۔ میں اسے نہیں بھول سکتی ہوں۔ وہ مہربان چہرہ، وہ سمجھ دار آنکھیں، انھوں نے بڑے غور سے میری بات سنی، میری آنکھوں میں دیکھا، میرے ہاتھوں کو تھاما اور بہت اچھے طریقے سے میری ماں کو سمجھایا کہ میں لڑکا نہیں ہوں، میں لڑکی ہوں اور میرا آپریشن ہونا چاہیے۔ میرے دل نے کہا کہ اس ڈاکٹرنی کے گلے لگ جاؤں، میری آنکھوں سے بے شمار آنسو چھلک گئے تھے۔

اس ڈاکٹرنی کی کوشش کے باوجود کوئی سرجن یہ آپریشن کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ کہتے تھے، لڑکا ہوں اور مجھے لڑکے کی طرح ہی زندگی گزارنی چاہیے۔ اس ڈاکٹرنی کی کوششوں سے ایک سرجن آپریشن کرنے پر راضی ہوگئے مگر ستر ہزار روپے کی رقم کا بندوبست کرنا آسان نہیں تھا۔ اس دن میں سرجن کے کمرے سے نکل کر سیون ڈے ہسپتال کے سامنے رکشا تلاش کررہی تھی کہ پہلی دفعہ کسی نے مجھے اس طرح سے مخاطب کیا تھا، کہاں جا رہی ہو؟ کتنی خوب صورت لگ رہی ہو اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ میں پگھل گئی تھی برف کی طرح ٹھنڈی ہوکر پانی بنی تھی اور زمین پر پھیل کر بہہ گئی تھی۔ میں ان سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکتی تھی۔ ان میں ایسی ہی بات تھی۔ یہ گروجی تھے۔

گروجی نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کے ساتھ چلوں اور میں انھیں انکار نہیں کرسکی۔ نہ میں نے اپنی ماں کو خبر کی نہ کسی کو گھر پر بتایا، اس دن گرو کے ساتھ

بے ساختہ چل کھڑی ہوئی۔ وہ مجھے لی مارکیٹ کی اس گلی میں لے آئے، جہاں ہم سب رہتے ہیں۔ زلفی، نجمہ، شیلو، چھنو، باجی، مچھیرا، ملاح، شیدی اور بہت سارے میرے جیسے لوگ۔ اپنے اپنے گھروں سے نکلے ہوئے فطرت کی غلطیوں کے شکار... وہ سب لوگ مجھے دیکھ کر خوش ہوگئے تھے۔ مجھے نہلایا گیا، پہلی دفعہ نئے زنانہ کپڑے پہنائے گئے، مجھے ایسا لگا جیسے میری رخصتی ہوگئی ہے۔ میں وداع ہو کر اپنے گھر آگئی ہوں۔ گرو نے مجھے بے انتہا پیار دیا۔ میرا نام نیلو رکھا گیا تھا۔"

یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔ اس کی آنکھوں کی ساکت پتلیاں جیسے کسی ایک جگہ آکر جم گئی تھیں، آنکھوں میں اس طرح ویرانی میں نے پہلے کبھی بھی نہیں دیکھی تھی۔ میرے اندر بھی جیسے ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ میں بھی فطرت کی بے رحمی پر جیسے ہاتھ مل کر رہ گیا تھا۔

"وہ بڑے اچھے تھے، ہم سب کا خیال رکھتے۔ میری ماں کے بعد سب سے زیادہ پیار مجھے گرو نے ہی کیا۔ بڑا خیال تھا ان کو میرا۔ میں نے اپنی ماں کو بھی خبر نہیں کی، صرف اس لیے کہ اس سے فائدہ بھی کیا۔ میں تو ایک بوجھ تھی ان پر، ان کی بدنامی کا سبب، ان کی زندگیوں کا زہر، ان کی اپنی مکمل ناکامی کا جیتا جاگتا ثبوت۔ گرو جی نے مجھے سمجھایا تھا کہ ان کی دنیا اور ہے اور ہماری دنیا اور۔ وہ ہم میں نہیں آسکتے ہیں ہم ان میں نہیں جا سکتے ہیں۔ ہمیں یہاں رہنا ہے، انھیں وہاں رہنا ہے۔

ہماری تو روح بھی الگ ہوتی ہے۔ ان سے جدا، ہر ایک سے الگ۔ ان سے ہم لوگ صرف پیسے کمانے کے لیے ملتے ہیں۔ اپنا جسم بیچ دیتے ہیں روح بیچتے ہیں۔ ان بڑے لوگوں کے پاس، وڈیروں اور جاگیرداروں کے پاس، پیسے والے عیاشوں کے پاس۔ جن کی پہچان الگ ہے، جن کے اصول الگ ہیں ان کے قانون جدا ہیں، یہ دوسری دُنیا ہے، یہ بات مجھے اچھے طریقے سے پتا تھی، میں اسی جگہ سے یہاں آیا تھا۔ اُس دوسری دُنیا سے اِس دنیا میں۔

گرو جی کی دُنیا کے اپنے احوال تھے اور گرو جی کی دنیا بھی ایک الگ دُنیا تھی۔ کوئی جبر نہیں تھا اس دنیا میں۔ جو لوگ بھی تھے یہاں اپنی مرضی سے تھے۔ گرو جی کی بات صحیح تھی، ہم جسم کے قیدیوں کی روحیں الگ تھیں۔ جو دوسری دنیا میں پیدا ہو کر

پھنس کے رہ جاتی ہیں۔ گرو جی دُور سے ہی پہچان لیتے تھے، ایک کشش تھی ان میں۔ ایک سحر تھا ان کی باتوں میں، ایک جادو تھا۔ چند میٹھے بول تھے اور ہم سب اس گلی میں ان کے ساتھ خوشی خوشی رہتے تھے۔ انھوں نے ہی مجھے کہا تھا کہ اپنے گھر والوں کو بتا دوں کہ میں کہاں ہوں۔ ''بتا دو کہ تم خوش ہو۔ تیری ماں خوش ہوگی پگلے۔'' انھوں نے سچ ہی کہا تھا۔

میں اپنی ماں سے ملا تھا، انھیں بتایا تھا کہ اب میں واپس نہیں آؤں گا۔ میں وہاں چلا گیا ہوں، دُور ان لوگوں کے درمیان جو میرے جیسے ہیں، جن کے جسم الگ ہیں اور روحیں الگ ہیں، جو نہیں رہ سکتے مکمل لوگوں کے ساتھ۔ میری ماں کے آنکھوں میں آنسو آئے تھے وہ گم صم بیٹھی رہی تھی، مجھے تکتی رہی تھی پھر کہا تھا، بیٹے خوش ہے ناں وہاں پر۔ بس خوش رہنا۔

گرو جی میرے نرِبان کی تیاری کر رہے تھے، انھوں نے بتایا تھا کہ ملتان میں بغیر درد کے بھی نرِبان ہوتا ہے جس کے پچیس ہزار روپے لگتے ہیں۔ وہاں ایک حجام انجکشن لگا کر کرتا ہے، مگر انھوں نے کہا تھا کہ یہاں پر ہی میری نرِبان ہوگی۔ شیلو کی نرِبان میرے سامنے ہی ہوئی تھی۔ اس دن صبح سے شیلو کو گرو جی نے خاص شراب پلانی شروع کی تھی، صبح نذرانہ بٹا، دعا ہوئی اور شیلو کے نیچے والے جسم کی جڑوں میں ربر کا پھندہ ڈال دیا گیا۔ رات تک شیلو پورے نشے میں تھا اور جسم ربر کے پھندے کی دوسری جانب مکمل طور پر لٹک کر رہ گیا، پیپل کے پیڑ کے ساتھ ایک پہلے سے کھدے ہوئے گڈھے کے اوپر شیلو کو شیدا، چھنو، زلفی اور نجمہ نے پکڑ لیا تھا اور گرو جی نے تیز استرے سے ایک دھار مار کر جسم جدا کر دیا جو گڈھے میں گر گیا، وہ کہتے جا رہے تھے کہ تیرا مردانہ پن ختم ہوگیا۔ اس بہتے خون کے ساتھ مردانگی بہہ رہی ہے تو زنانہ بن رہا ہے، تو عورت بن گیا... اس کے بعد ڈیٹول میں بھیگی ہوئی روئی کے پھائے کس کر باندھ دیے گئے اور شیلو سو گیا تھا۔ اس کے بعد دعوت ہوئی اور نذرانے کی بریانی سب نے کھائی تھی۔

میں نرِبان کے لیے تیار ہوگئی تھی اور جلد از جلد اپنے جسم کو مکمل زنانہ بنانا چاہتی تھی کہ یکایک گرو جی بیمار پڑ گئے۔ دیکھتے دیکھتے دو دنوں میں بخار چڑھا، ہم

ہسپتال لے گئے۔ سب کچھ کیا تھا، دوا، خون، دعا مگر گروجی ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے۔

ڈاکٹر صاحب ہم لوگ جنازے خود نہیں اٹھاتے ہیں، جنازہ بنا دیتے ہیں، تیار کر دیتے ہیں اور محلے والوں کے حوالے کر دیتے ہیں وہی ان کی نماز پڑھتے ہیں اور وہی انھیں دفنا دیتے ہیں، مگر دفنانے سے پہلے ہم جسم کو پورا بنا دیتے ہیں، مکمل کر دیتے ہیں تا کہ قبر میں فرشتوں کو اپنی غلطی پر شرمندگی نہ ہو۔

گروجی کا جسم بنانے کے لیے، انھیں پورا کرنے کے لیے مکمل بنانے کے لیے میں نے اپنا جسم کاٹا تھا۔ برا تو نہیں کیا میں نے۔ مجھے تو مر جانا چاہیے تھا ان کے لیے۔ انھوں نے مجھے نئی زندگی دی تھی، میں ان کے بغیر کیسے رہ سکوں گی، کیسے رہ سکتی ہوں۔ میرا سب کچھ تو ان کا ہی ہے، ان کا ہی تھا۔ انھوں نے مجھے سمجھایا تھا، سمجھا تھا، پیار دیا تھا، اپنایا تھا، اپنا بنایا تھا، مجھے اس سنسار میں جینا سکھایا تھا، مین اتنا تو کر سکتی تھی، اتنا تو حق تھا ان کا...ہائے میں مر ہی کیوں نہ گئی۔'' یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا، میں نے کہا،''تم وعدہ کرو، اپنی جان نہیں لوگی تو میں تمھیں کل ہی واپس تمھارے لوگوں میں بھیج دوں گا۔ جاؤ، ضرور جاؤ گروجی کے تیرھویں میں، وہیں رہو۔ وہاں سب کچھ ہے تمھارا۔ میں بھی تمھیں لڑکی سمجھتا ہوں۔ اب تم لڑکی ہی ہو۔ عورت بن گئی ہو، تمھارا نربان ہو چکا ہے، خوب صورت نام رکھا گیا ہے تمھارا، نیلو! تم اپنے نام کی ہی طرح خوب صورت ہو۔''

اس کی آنکھوں میں خوشی کے قمقمے جل اُٹھے۔ مجھے لگا تھا جیسے دور ...کہیں دُور... بہت دُور... آسمانوں سے بھی اوپر سارے جہانوں سے بہت آگے، جہاں اندھیرے ختم ہو جاتے ہیں، جہاں روشنیاں ہی ہوتی ہیں وہاں کہیں پر نیلو کے گرو دھیرے سے مسکرا رہے ہیں۔

غیرت کے نام پر

''ان لوگوں نے سرفراز کو قتل کر ڈالا۔ قبرستان لے جاکر پہلے اس کے ہاتھوں کو کاٹا پھر کلہاڑی سے دونوں پیر کاٹ ڈالے۔ وہ یکایک ہی مر گیا ہوگا۔ پھر انھوں نے بٹو کو بھی گولی مار دی۔ ان دونوں کے مرنے کا مجھے شدید افسوس ہے۔ وہ آج بھی میرے سامنے چلے آتے ہیں۔ دونوں زندہ سلامت چلتے پھرتے میری نظروں کے سامنے گھومتے رہتے ہیں۔ بولتے ہیں، ہنستے ہیں، پھر یکایک ان کے کٹے ہوئے سروں سے خون فوارے کی طرح بہہ نکلتا ہے۔ سرفراز ہمارے شہر کا گھبرو جوان تھا۔ لانبا، بڑے بڑے ہاتھ، چوڑے شانوں کے اوپر خوب صورت سا سر۔ وہ سب کے سب کاٹ کاٹ کر الگ الگ ڈال دیے گئے تھے۔ قدرت کا بنایا ہوا پورا انسان اتنی آسانی سے الگ الگ ہوجاتا ہے۔ انسان، انسان کو اس بے دردی سے مار سکتا ہے، ٹکڑے ٹکڑے کرسکتا ہے۔ پھر بٹو کو تو میں بچپن سے جانتا تھا۔ ساتھ ساتھ کھیلا تھا اُس کے۔ قدم سے قدم ملا کر چلا تھا اس کے۔ وہ نازک سی لڑکی خوب صورت سے چہرے کے ساتھ اپنے سر میں سوراخ لیے بار بار مجھے چونکا دیتی ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی تھی۔ اس کی ویران آنکھوں میں کریڈٹ سوئس اور یو بی ایس بینک کی بلڈنگوں کی شبیہہ نظر آرہی تھی اور چہرے پر چھائے ہوئے کرب سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا دل اُداس ہے، کسی شدید درد کا شکار۔ میں نے

پہلی دفعہ کسی کے دل کو اس کی آنکھوں، اس کے ماتھے، اس کے چہرے، اس کے ہونٹوں پر اس طرح پھڑکتا ہوا دیکھا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ رو دے گا۔

وہ مجھے زیورچ کے سٹی سینٹر میں ملا تھا۔ موسم بہار کی بڑی سہانی صبح تھی، میں شہر کے بیچوں بیچ جھیل کے کنارے مٹر گشتی کرتا ہوا آہستہ آہستہ اپنا وقت گزار رہا تھا۔ میں کراچی سے نیویارک کے لیے روانہ ہوا تھا مگر زیورچ میں آٹھ گھنٹے رُکنے کا پروگرام بھی بنا لیا تھا۔ زیورچ گئے ہوئے کئی سال ہوگئے تھے، میں نے سوچا تھا، چلو ایک بار پھر اس پرانے شہر کی سڑکوں، گلیوں اور شراب خانوں کا دیدار کروں گا جہاں میں نے زندگی کا ایک بھرپور ہفتہ گزارا تھا۔

یہ اس وقت کی بات تھی جب میں لندن اسکول آف اکنامکس میں پڑھ رہا تھا اور اپنے گروپ کے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ ٹرین کے ذریعے یورپ دیکھنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ یورپ کا ہر شہر طلسماتی شہر ہے، صدیوں پرانی عمارتوں کا شہر، روایتوں اور ثقافتوں کا شہر، انسانی کم زوریوں، خوبیوں، بزدلی اور بہادری کے ریکارڈ محفوظ کیے ہوئے شہر جو اپنی ماضی پر نازاں بھی ہوتے ہیں، شرم سار بھی جو کھلتے بھی نہیں اور کھلے ہوئے بھی ہوتے ہیں۔ ایک عجیب قسم کی پراسراریت ہے ان شہروں میں، ایک طلسم ہے، ایک جادو ہے، ایک سحر ہے جو بار بار اپنی طرف بلاتا ہے۔ زیورچ بھی ایک ایسا ہی شہر تھا جہاں برسوں پہلے کئی پراسرار دن گزارے تھے میں نے۔ وہ ساری یادیں اب بھی ذہن میں تروتازہ گلاب کی طرح مہک رہی تھیں اور یہی وجہ تھی میں نے سوئس ایئر کا ٹکٹ لیا تھا کہ آٹھ گھنٹے اس شہر میں رکتا چلوں گا۔

زیورچ ایئرپورٹ سے دو منزلہ ٹرین پر بیٹھ کر بارہ منٹ میں سینٹرل اسٹیشن پہنچا۔ پھر چھوٹی چھوٹی سڑکوں اور گلیوں سے ہوتا ہوا جھیل کے ساتھ ساتھ گھومتا ہوا، واپس سٹی سینٹر میں آ کر بان ھوف اسٹریٹ پہنچ گیا تھا۔ بان ھوف اسٹریٹ پر کریڈٹ سوئس اور یو بی ایس کی بلڈنگوں کے سامنے فٹ پاتھ کے اوپر ہی ایک چھوٹا سا شراب خانہ ہے۔ اسی شراب خانے کے فٹ پاتھ پر ہی میز کرسیاں اس طرح سے لگی ہوئی ہیں کہ آتا جاتا ہوا ٹریفک، ٹرام، چلتے پھرتے لوگ دور تک نظر آتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں ان دونوں سوئس بینکوں کے تہہ خانے میں ہمارے ملکوں کے بڑے بڑے لوگوں کا بہت

سارا کالا پیسہ محفوظ ہے۔ وہ کالا پیسا جو ہمارے لیڈروں، رہبروں نے عوام کے جیبوں پر ڈاکا ڈال کر نکالا ہے پھر ان بینکوں کی تجوریوں میں اپنے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ میں تصور کی آنکھوں سے تہہ خانے میں اُتر کر تجوری تک تو پہنچ گیا مگر یہ تجوری مجھ سے کھلی نہیں۔ اس خیال سے مجھے ہنسی آ گئی تھی۔

میں فٹ پاتھ پر بیٹھا خلقت کو دیکھ رہا تھا، ساتھ ہی بڈوائزر کے گلاس سے آہستہ آہستہ بیئر کی چسکیوں میں کھوتا جا رہا تھا کہ وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔ میری ہی جیسی عمر ہوگی۔ خوب صورت پنجابی چہرہ، بھری بھری بھنوئیں اور گھنی گھنی مونچھوں کے پیچھے تانبے کا رنگ لیے ہوئے چہرے کی کھال۔ چہرے میں بشاشت تھی اور آنکھوں میں ذہانت۔

وہ مجھ سے پوچھے بغیر ہی میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ ''بہت اچھی ٹی شرٹ ہے آپ کی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں اچھی تو ہے۔ یہ میں نے کراچی میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کے سیمینار سے ۱۰۰ روپے میں خریدی تھی...'' شرٹ کے سامنے ایک معصوم سی لڑکی کی تصویر تھی اور نیچے لکھا تھا، کاروکاری بند کرو۔ غیرت کے نام پہ قتل نامنظور۔

Stop Honour Killing Now

''یہ تصویر دیکھ کر کچھ یاد آگیا اس لیے رک کر پڑھنے لگا تھا کہ کیا لکھا ہے۔ پاکستان سے آرہے ہیں نا آپ؟''

''جی کراچی سے آرہا ہوں اور نیویارک جا رہا ہوں۔'' میں نے گلاس میں سے آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا تھا۔

''اگلا گلاس میری طرف سے۔ تھوڑی دیر آپ کے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں، اگر اجازت ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''بیٹھ تو آپ پہلے ہی چکے ہیں لہٰذا اب کیا اجازت۔ لیکن ضرور بیٹھیں گلاس بھی آپ کی طرف سے سہی۔'' میں نے دعوت قبول کرتے ہوئے کہا تھا۔

اس نے ویٹرس کو اشارے سے بلا کر میرے لیے بڈوائزر اور اپنے لیے آئرش گینز منگوائی تھی۔ ''میرا نام امجد ہے۔'' وہ آہستہ سے بولا تھا۔ پھر میری ٹی شرٹ کو غور

سے دیکھتے ہوئے بولا، ''کیا اب بھی پاکستان میں یہ ہو رہا ہے۔ غیرت کے نام پر قتل۔''

''ہاں ہو تو رہا ہے سندھ میں، پنجاب میں، سرحد میں، بلوچستان میں۔ لڑکیاں ذبح کر دی جاتی ہیں بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ قتل کر دی جاتی ہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

یار، ''شراب پر تو پابندی لگا سکتے ہیں مگر عورتوں کے قتل پر پابندی نہیں لگا سکتے۔ کیسا ملک ہے ہمارا؟'' اس نے جھنجلائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

''کب سے پاکستان نہیں گئے ہو آپ؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''جب سے بڑے بھٹو کی حکومت ختم ہوئی، تب سے پاکستان چھوڑ دیا ہے میں نے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شراب پر پابندی لگی تھی مگر شراب ملنی بند نہیں ہوئی ہے۔ وہ پہلے بھی ملتی تھی۔ اب بھی ملتی ہے۔ اسی طرح عورت کے قتل پر بھی پابندی ہے مگر وہ پہلے بھی قتل ہوتی تھی۔ اب بھی قتل ہوتی ہے۔'' میں نے اس کے کئی سوالوں کا اکٹھے جواب دے دیا تھا۔

''ان دونوں کو تو پاکستان میں قتل کر دیں گے نا؟'' اس نے میری توجہ ایک نوجوان جوڑے کی طرف دلائی جو سڑک کے دوسری طرف دنیا سے بے نیاز ایک دوسرے کا ہاتھ شدت سے پکڑے ہوئے ایک دوسرے کو چوم رہا تھا۔

''نہیں، قتل تو نہیں کریں گے، دونوں کو پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔ بندے سے پیسے لے کر چھوڑ دیں گے، لڑکی کو تھانے میں اس بے باکی کی سزا کے طور پر کچھ پولیس والے تھوڑا زیادہ پیار کرلیں گے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یو مین، اس کا ریپ ہوجائے گا۔'' اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں! باجماعت عصمت دری ہوگی اس کی، بازار میں یہ سب کچھ کرنے کی کوئی سزا تو ہونی چاہیے نا۔ پاکستان میں سخت قانون ہیں بھائی۔'' میں نے بڈوائزر کی مستی میں کافی عقل مندی کا جواب دیا تھا۔

''پولیس والے یہ سب کچھ کریں گے تو غیرت کا کیا ہوگا؟ کسی کی غیرت

جاگے گی کہ نہیں؟'' اس نے سخت لہجے میں پوچھا تھا۔

''میں حکومت پاکستان کا نمائندہ نہیں ہوں بھائی، صرف ایمنسٹی انٹرنیشنل کی یہ شرٹ پہننے سے غیرت کا ٹھیکے دار نہیں بن گیا ہوں۔'' میں نے مزید عقل مندی کا جواب دیا تھا... شراب کا یہ کمال تھا میرے اوپر، جب بھی پیتا تھا بے باکی سے بولتا تھا۔ سچ بولتا تھا اور بے تحاشا بولتا تھا۔ شراب میں دس برائیاں ہوں گی مگر صرف ایک اس اچھائی کی وجہ سے شراب میں نے اپنے اوپر حلال کرلی تھی۔

اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور چلا گیا مگر چہرہ ویسا ہی سنجیدہ تھا۔ بیئر کی جھاگ جو اس کے ہونٹوں پر چپکی ہوئی تھی اس نے زبان سے صاف کرتے ہوئے مجھے غور سے دیکھا پھر ویٹرس کو آواز دے کر دو گلاس اور لانے کو کہا اور آخری گھونٹ بھر کر گلاس خالی کر دیا۔

''بنّو اور میں ساتھ ساتھ کھیلے تھے، گجرات کے اس چھوٹے سے محلے میں... ہرا سمندر، گوبھی چندر، لنگڑی پالا اور بڈی کبڈی۔ میں چوتھی کلاس میں تھا اور وہ تیسری کلاس میں۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔'' اس نے اپنے سینے کا بوجھ یکایک ہلکا کرلیا۔

''تیسری چوتھی کلاس میں؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں، نہیں! تیسری کلاس میں جب وہ تھی تب سے میرے ساتھ کھیلتی تھی اور بھی محلے کے بچے تھے اور پھر اسی طرح سے کھیلتے کھیلتے ہم سب بڑے ہوگئے۔ میں کالج چلا گیا اور وہ میٹرک میں آگئی۔ میں نے نام نہیں پوچھا آپ کا۔'' اس نے بات روک کر سوال کیا۔

''وسیم نام ہے میرا۔'' میں نے فوراً ہی جواب دیا۔

''بڑی ہی نازک تھی وسیم صاحب وہ۔ بڑی بھولی اور بڑی ہی خوب صورت۔ پورے محلے میں ہر ایک ہی اسے دیکھتا تھا اور ہر ایک اس کو پیار کرتا تھا۔ وہ تھی ہی ایسی۔ نازک، سادہ اور بہت سیدھی، ہر وقت ہنسنے والی۔ مسکراہٹ تو اس کے چہرے پر بولتی رہتی تھی۔ اس زمانے میں بہت کم لڑکیاں پڑھتی تھیں وسیم صاحب بہت کم، مگر نہ

جانے کس طرح اس نے اپنے گھر والوں کو راضی کر کے میٹرک کے بعد کالج میں بھی داخلہ لے لیا۔ کہتے ہیں اس کے ماموں نے بہت منع کیا مگر بعد میں راضی ہوگیا تھا۔''

''سگریٹ پییں گے آپ؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں یار! صرف شراب پیتا ہوں، بڑی مشکل سے سگریٹ چھوڑی ہے، دُعا کرو یہ بڈوائزر ملنی نہ بند ہوجائے، اپنا تو کام تمام ہوجائے گا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''پھر کالج میں کیا ہوا تھا؟ تم نے عشق وشق کرلیا تھا کیا؟'' میں نے اسے چھیڑا۔

''نہیں، میں نے اسے پسند کیا تھا، مجھے اچھی لگتی تھی، مجھ سے دوستی تھی، وہی معصوم سی دوستی جو اسکول کے زمانے سے تھی، نہ میں نے اسے اس نگاہ سے دیکھا تھا اور نہ ہی وہ مجھے اس طرح سے دیکھ سکی تھی۔ آپ تو جانتے ہوں گے خوب صورتی اور جوانی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عشق و عاشقی بھی شروع ہوجائے۔ یہ جو اتنے سارے لڑکے لڑکیاں گھوم رہے ہیں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس چوک پر ایک دوسرے کے عشق میں تو مبتلا نہیں ہیں۔'' اس نے وضاحت کی تھی۔

''یہ یورپ ہے اور یورپ میں جو ہوتا ہے وہاں نہیں ہوتا ہے۔ یہ لوگ تیرہ چودہ سال کی عمر میں عشق کی آگ میں جل کے، دلوں کو توڑ کے، جدائی کے غم میں بھسم ہو کے، وصال کا خواب پورا کر کے دلوں کو دوبارہ جوڑ کر زندگی کے پہیے کو چلانے میں لگے رہتے ہیں۔ یہاں کی بات اور ہے اور وہاں کی بات اور۔ ان کا اور ہمارا مقابلہ نہیں ہے بھائی۔'' میں نے سرور میں سریلا سا جواب دیا تھا۔

''نہیں، میرا اس سے کوئی عشق نہیں تھا۔'' اس نے احتجاج کے سے انداز میں مجھے جواب دیا۔ ''میری دوستی تھی۔ میں اسے بھائی بہنوں والے تعلقات بھی نہیں کہتا ہوں اور نہ ہی عاشق و معشوق والے تعلقات۔ ہم دوست تھے صرف دوست... مگر وہ پسند کرتی تھی اور شادی بھی کرسکتی تھی سرفراز سے۔ میرے دوست سے۔ سرفراز میرا پرانا یار غار تھا اور وہ بھی اسے چاہتا تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے۔ اور مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں تھا اس پر۔ اور مجھے اعتراض کرنے کا حق بھی نہیں تھا... سرفراز بہت اچھا بندہ تھا، اچھے ماں باپ کا بیٹا۔ گجرات کے باہر ایک چھوٹا سے قصبہ ہے، وہاں سے پڑھنے آتا تھا ہمارے کالج میں اور وہاں ہی بنو سے ملاقات ہوگئی تھی

اور وہ دونوں ہی چاہنے لگے تھے ایک دوسرے کو۔ مجھے پتا ہے کوئی لمبی چوڑی باتیں نہیں ہوئی تھیں نہ کوئی وعدے پیان ہوئے تھے نہ کوئی قسمیں کھائی گئی تھیں اور نہ ہی گھر چھوڑنے کی باتیں کی گئی تھیں۔ نہ گھر سے بھاگنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ بس معصوم سی دوستی سے بات شروع ہوئی تھی اور دونوں نے یہی سوچا تھا کہ بزرگوں سے بات کرکے شادی کی بات چلائی جائے گی۔''

''اس میں تو کوئی بری بات نہیں ہے۔'' میں نے سوال کی طرح جواب دیا تھا۔

''نہیں، بری بات تو نہیں ہے مگر گجرات چھوٹا سا شہر تھا اس وقت۔ نہ جانے اب کتنا بڑا ہوگیا ہوگا؟'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''بات پھیل گئی تھی بلکہ پھیلا دی گئی تھی اور پھیلانے والوں میں سب سے آگے غفور تھا۔ غفور بہت دنوں سے کالج میں پڑھ رہا تھا، اس کا باپ مسلم لیگ کا بندہ تھا اور وہ خود جماعت اسلامی کی جمعیت کا لیڈر تھا۔ بعد میں جب بھٹو کی حکومت آئی تو وہ پیپلز پارٹی کا لیڈر بن گیا۔ ایک دن اس نے سرفراز کو بلاکر پوچھا تھا کہ اس کے اور بنّو کے درمیان کیا چل رہا ہے؟ سرفراز نے کہا تھا کہ کچھ بھی نہیں ہے، ابھی تو دوست ہیں مگر وہ اپنے ماں باپ کو ان کے گھر بھیجنے والا ہے۔''

''بنّو میری ہے۔'' غفور نے سرفراز کو صاف صاف کہہ دیا تھا۔ یہ بات مجھے سرفراز نے اسی دن بتائی تھی جس پر سرفراز نے غفور سے کہا تھا کہ کوئی بھی کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ وہ اور بنّو دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں اس میں کیا بری بات ہے وہ اپنے ماں باپ بنّو کے ماں باپ کو بھیجے گا اگر وہ راضی ہوگئے تو شادی ہوجائے گی۔ وہ چاہے تو اپنے ماں باپ کو بھیج دے۔ تھی نا معقول بات؟'' اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا تھا۔

میں نے افسوس سے اپنے ختم ہوتے ہوئے گلاس کو دیکھ کر کہا تھا کہ ''ہاں، بات تو معقول ہے مگر پاکستان میں معقول باتیں کون سنتا ہے۔ اگر معقول باتیں سن رہے ہوتے تو میں نیویارک تھوڑی جارہا ہوتا، تم زیورچ میں تھوڑی ہوتے، یورپ اور امریکا کے شہروں میں پاکستانی شہریت کی تلاش میں وہ سب کچھ نہیں کرتے، جو کر رہے

ہیں۔ یورپ کے ویزے کے لیے ہزاروں ڈالر خرچ کرتے ہیں لانچوں اور کشتیوں میں جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ چلتی ٹرینوں سے کود جاتے ہیں۔ ایمبیسیوں کے سامنے بھوک ہڑتال کرتے ہیں اور اپنے آپ کو آگ لگا دیتے ہیں۔ معقول باتیں صرف کتابوں میں ہوتی ہیں۔ چلو اب ایک گلاس میری طرف سے بھی ہوجائے۔'' یہ کہہ کر میں نے ویٹرس کو اشارہ کیا تھا۔

زیورچ کی خوش بودار ٹھنڈی ہواؤں میں سڑک کے کنارے بیٹھ کر بیئر پینے سے مزہ دوبالا ہوگیا تھا، ایک سکون تھا ایک طرح کی قناعت تھی وقت میں۔ کوئی بھی بھاگ نہیں رہا تھا، مجھے ایسا لگا جیسے کسی سوئس کیلنڈر کے کسی ایک صفحے پر وقت تھم گیا ہے۔ پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا تھا کہ میں نے صحیح وقت پر کراچی چھوڑ دیا ہے۔ پاکستان میں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ نوکریاں تو پہلے بھی نہیں ملتی تھیں مگر انسان مل جاتے تھے۔ پھٹی پتلون میں بھی کراچی پیرس ہی لگتا تھا، مگر اب تعلیم، دولت، گاڑی، مکان ہونے کے باوجود کراچی اجنبی ہوگیا تھا۔ شہر ایسا پھیل گیا تھا بے ہنگم طریقے سے کچھ پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ پرانا شہر کھارادر، جہاں میں نے اپنا بچپن گزارا تھا کنکریٹ کا جنگل بن کر رہ گیا تھا۔ ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی پرانی عمارتوں پر کے ایم سی اور کے ڈی اے کی بہ دولت ایسی بے ہنگم اور بے ترتیب عمارتیں کھڑی کر دی گئی تھیں کہ شہر اپنا حسن کھو بیٹھا تھا۔ پھر اُن سے اُبلتے ہوئے گٹر اور گلیوں میں کوڑے اور کچرے کا ڈھیر، پھر آئے دن مذہبی اور سیاسی حوالوں سے قتل اور ہڑتالوں کا ایک سلسلہ سا چلتا تھا۔ شہر ٹوٹتا جا رہا تھا غربت بڑھتی جا رہی تھی کہ یکایک میرا نام امریکا کی لاٹری میں نکل آیا۔ یہ بھی خوب تھا کہ کراچی میں ہر کوئی امریکا کو گالی بکتا تھا اور امریکا کی لاٹری کے لیے کروڑوں کی تعداد میں فارم بھی بھرے جاتے تھے۔ میں بے روزگار تو نہیں تھا ٹھیک ٹھاک نوکری کر رہا تھا اور تنخواہ بھی اچھی ہی مل رہی تھی مگر میں شہر سے پریشان ہوگیا تھا، وہ شہر جس کے لیے لندن میں بیٹھ کر نظمیں لکھتا تھا۔ وہ شہر جس کی یاد میں لندن کی گلیاں بھی سنسان لگتی جس کے لیے امتحان پاس ہونے کے فوراً بعد ہی میں لندن چھوڑ کر واپس آگیا تھا... وہ شہر اب اجنبی لگتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی اجنبی جگہ آگیا ہوں۔ وہ جگہ نہیں ہے جہاں میں پلا بڑھا تھا۔ جہاں شیعہ، سنی، پارسی، ہندو، عیسائی، مکرانی،

سندھی، مہاجر، گجراتی، مارواڑی، پنجابی، بلوچ، پٹھان، بنگالی، برمیز اور چائنیز سب مل کر ہنسی خوشی رہتے تھے۔ کراچی تو ایک ڈراؤنا خواب بن کر رہ گیا تھا۔ اس ڈراؤنے خواب میں امریکن لاٹری میں نام نکلنا ایسا ہی تھا جیسے کسی پیاسے کو بہت دُور جانے کے بعد دریا مل جاتا ہے۔ میں نے سوچتے سوچتے امجد کو دیکھا تھا پھر بات چیت بڑھانے کے لیے پوچھا...

''تو بنّو، غفور کو بالکل ہی پسند نہیں کرتی ہوگی۔''

''بالکل صحیح کہا آپ نے وسیم صاحب! بالکل یہی بات تھی۔ غفور بے ایمان آدمی تھا، کرائے کا سیاسی کارکن۔ کوئی بھی شریف آدمی اس سے دوستی رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ مگر وہ خطرناک آدمی تھا۔ اس نے بڑی خطرناک حرکت کی تھی۔ ایک صبح سارے شہر کی دیواروں پر نعرے لکھے ہوئے تھے، سرفراز اور بنّو کا عشق نہیں چلے گا، فحاشی حرام ہے، غیرت پر جان قربان ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے پتا لگا تھا کہ بنّو تو اپنے کالج آئی ہی نہیں تھی اور سرفراز کو بھی ہم لوگوں نے کالج سے گھر بھجوا دیا اور کہا تھا کہ وہ اپنے گاؤں چلا جائے۔ نہ جانے غفور کے دل میں کیا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس طرح معاملہ رفع دفع ہوجائے گا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ معاملہ یکایک بہت ہی بڑھ گیا تھا۔ معاملہ ایسے بڑھ گیا تھا کہ اسی دن غفور نے جاکر بنّو کے ماموں سے بات کی تھی کہ سرفراز اور بنّو کے ناجائز تعلقات ہیں اور اس کا سدباب کرنا پڑے گا ورنہ گجرات میں شریف لوگوں کی عزتوں کی دھجیاں اسی طرح سے اُڑتی رہیں گی۔ پھر انھوں نے پلان بنا لیا تھا مگر یہ کیسے ہوا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے۔'' اس نے دھیمے دھیمے بڑے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا تھا۔

''کیا پلان بنایا تھا ان لوگوں نے؟'' میں نے سوال کیا۔

''تین دن کے بعد سرفراز میرے گھر آیا تھا، شام کے وقت بنّو کے ماموں نے اسے بلایا تھا تاکہ سارے معاملات عزت سے ہوجائیں کیوں کہ بدنامی تو ہو ہی چکی ہے لہٰذا اب اس طرح سے معاملات کو نیک نامی میں بدل دیا جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی بات۔ میرا خیال تھا کہ بنّو کے ماموں کو سرفراز کے گھر والوں کو بلانا چاہیے تھا کیوں کہ اس کے گھر والے تو بہرحال راضی تھے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ میں

ساتھ چلتا ہوں مگر سرفراز نے روک دیا تھا کہ یہ تو بالکل ایک ذاتی سی میٹنگ ہے بٹو کے ماموں کے ساتھ۔ مگر یہ ذاتی میٹنگ نہیں تھی وسیم صاحب۔ سرفراز سے بٹو کا ماموں بات کرتا رہا۔ دنیا جہاں کی باتیں، اچھے طریقے سے، محبت کے انداز میں پھر ٹہلاتا ہوا گھماتا ہوا، باتیں کرتا ہوا اسے قبرستان لے گیا تھا۔ جہاں غفور اپنے ساتھیوں سمیت بیٹھا ہوا تھا اور وہاں پر ہی ان لوگوں نے کلہاڑی سے سرفراز کے ہاتھ پیر کاٹ دیے اور خون بہہ بہہ کر اس کی جان چلی گئی تھی۔

اسی رات پہلی دفعہ بٹو کی ماں نے بٹو کو کہا تھا کہ ساتھ کے کمرے میں اکیلی، سوجائے، جہاں وہ کبھی بھی اکیلی نہیں سوئی تھی، پھر رات کو اس کے ماموں نے ایک گولی اس کی پیشانی سے سر میں اُتار دی تھی۔ اس طرح سے غیرت کے نام پر وہ دونوں قتل ہوگئے تھے۔ غفور، بٹو کے ماموں اور بٹو کی ماں نے نہ جانے یہ کیسے کیا کر دیا تھا۔ آج تک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی ہے کہ کس طرح سے کوئی ماں اپنی بیٹی کو جانتے بوجھتے موت کے حوالے کرسکتی ہے؟ کیسے کوئی انسان اپنے سے کم زور پر اس طرح سے وار کرسکتا ہے؟ وہ کون سی طاقت ہوتی ہے جو رشتہ، پیار، محبت سب سے انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ یہ کیسی غیرت ہے جس کا کلیجہ صرف انسانی خون پی کر ہی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ غفور کا تو مطلب تھا، اس کی تو ہوس تھی۔ سرفراز اس کے لیے ایک دھمکی تھا۔ مکمل عذاب، جس نے اس کے گھر کی لڑکی کو ورغلا لیا تھا۔ مگر بٹو کی ماں کو کیا ہوا تھا؟ وہ کیسے اس سازش میں شریک ہوگئی؟ اس نے کیوں اپنے کوکھ کی جنی کو اس طرح سے بے مانگ کر دیا کیوں؟ کیوں؟ میں اکثر سوچتا ہوں اور سوچتا ہی رہتا ہوں اور میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ کاش کوئی مجھے جواب دے، مجھے بتائے سمجھائے۔"

بہترین شراب، خوب صورت ماحول، دل کشا موسم، حسین چہروں کے درمیان آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے بھی مجھے ایسا لگا تھا جیسے متلی ہوجائے گی۔ میں بالکل خاموش سا ہوگیا تھا۔

پھر وہ خود ہی بولا۔ "یہ ایک بات سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ غفور نے جو کیا وہ کیا، وہ تو سمجھتا تھا کہ بٹو اس کی ہے اور اس کا بدلہ لینا ہوگا، ماموں کی غیرت کو اس نے جگایا ہوگا قصے سنائے ہوں گے، افسانے بنائے ہوں گے مگر بٹو کے ماموں نے بٹو

کی ماں کو کیسے راضی کرلیا کہ اس کی بیٹی قتل کر دی جائے۔ بھائی اور بیٹی میں ماں اور بہن کا انتخاب بیٹی کی قتل کی صورت میں ہوگا، یہ کون سوچ سکتا ہے؟''

''میری سمجھ سے باہر ہے۔'' میرے اندر سے جیسے کسی نے شدید نفرت کا اظہار کیا تھا۔ میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا ہوں۔ میں نے دل میں ایک بار پھر پاکستان سے نکل بھاگنے پر اطمینان سا محسوس کیا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے آگ کا سمندر بہت دُور ہوتا چلا جا رہا ہے۔

''غفور اور بٹو کا ماموں پکڑا تو ضرور گیا ہوگا۔'' میں نے پوچھا تھا۔

''یہی تو افسوس ہے۔ غفور صوبائی حکومت میں محکمۂ تعلیم کا اعلا افسر ہے اور بٹو کا ماموں گجرات میں ہیروئن کا سب سے بڑا سپلائر ہے۔ ایک سنیما بھی ہے اس کا۔ شراب کا اڈا بھی اس کا ہے۔ شہر میں بڑا نام چلتا ہے اس کا اور شہر کے ہی ایک اور اڈے میں بٹو جیسی کتنی ہی لڑکیاں اس نے پامال کی ہیں۔'' وہ چپ ہوگیا۔

میرا جی چاہا کہ اس سے کہوں، بھائی! تم ایک شہر کا رونا روتے ہو، تمھارے حافظے میں یہ دُکھ بھرا ایک واقعہ ہے لیکن اب تو بے غیرتی ہر شہر کا اصول بن گئی ہے اور غیرت کے نام پر معصوم کنواریوں کی بھینٹ دی جاتی ہے۔ میں اپنی بات کہنا چاہتا تھا لیکن بولنے کا یارا نہ تھا۔

□

کیرم بورڈ

آخری بار جب میں نے انھیں دیکھا تھا تو وہ بہت کم زور ہو چکے تھے۔ اس دن جب میں ان کے گھر پہنچا تو وہ سو رہے تھے یا شاید بے ہوش تھے۔ چہرے کی جھریاں ایک دوسرے کے اوپر سمانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ سرخ ہونٹ کے ساتھ زبان بھی سرخ سرخ سی ہو رہی تھی۔ سر پر کوئی بال نہیں اور ماتھے کے تل کافی نمایاں تھے۔ دھنسی ہوئی آنکھیں اور چہرہ کسی مرے ہوئے آدمی کا چہرہ لگ رہا تھا۔

انھوں نے آنکھیں کھولیں تو احساس ہوا کہ وہ زندہ ہیں۔ دھنسی ہوئی آنکھوں میں اندر، بہت اندر ایک چمک سی باقی تھی۔ زندگی کی چمک ، زندہ رہنے کی روشنی۔ انھوں نے مجھے دیکھا، پہچان کی ایک رمق سی آنکھوں میں آئی، انھوں نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن مسکرا نہیں سکے۔ کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہیں سکے، سوچ کا عمل اور سمجھنے کا سلسلہ جاری تھا، ذہن بیدار مگر جسم ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ مجھے دیکھا ہوگا، کچھ سوچا ہوگا۔ دماغ میں الفاظ اُگے ہوں گے۔ سب مل کر جملے بنیں ہوں گے مگر زبان پر کوئی قابو نہیں تھا جیسے دماغ اور زبان کے درمیان بجلی لائن کٹ گئی تھی۔ میرا دل ان کی کم زوری اور بیماری پر اتنا نہیں دکھا جتنا ان کے چہرے کی بے بسی پر دکھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے اور کہہ نہیں پا رہے تھے۔ میں نے سوچا تھا، یااللہ انھیں اچھا کر دے یا انھیں موت دے دے۔ تھوڑی دیر تک ان کے پیروں کے پاس کھڑا رہا انھیں دیکھتا

رہا، ان کی بے بسی پر کڑھتا رہا پھر گھر چلا آیا تھا۔

رات دو بجے ثریا کا فون آیا کہ ان کا انتقال ہوگیا ہے۔ مجھے افسوس تو ہوا مگر تسلی بھی کہ اب وہ زندہ رہنے کے عذاب سے نکل گئے ہیں۔ موت نے زندگی کے ساتھ زندگی کی مشکلات کا بھی خاتمہ کردیا تھا۔

ثریا نے ہی بتایا کہ کلیم کو امریکا خبر کر دی گئی ہے۔ کلیم میرا دوست تھا۔ ہم دونوں نے ساتھ پبی ہوم اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ میں نے کامرس گروپ لے کر چارٹرڈ اکاؤنٹینسی کی اور اس کے بعد کراچی میں ہی میرے لیے راستے کھلتے چلے گئے تھے۔ کلیم کا داخلہ سندھ میڈیکل کالج میں ہوگیا تھا۔ میٹرک کے بعد ہم دونوں کی تعلیمی سرگرمیاں تو مختلف تھیں مگر ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

ہم لوگ پابندی سے ملتے، اکثر ساتھ ساتھ گھومتے۔ میں اس کے گھر جاتا اور ہمارے گھر آتا... دوستی بڑھتی ہی چلی گئی تھی۔ کلیم کی تین بڑی بہنیں تھیں۔ وہ گھر میں ہر ایک کا لاڈلا تھا۔ ہونا بھی چاہیے، پاکستان میں تین بہنوں کے بعد بھائی کا پیدا ہونا تو جیسے ایک طرح کا معجزہ تھا۔ کلیم کو بھی اپنی اہمیت کا اندازہ تھا۔ مگر وہ اپنی اس اہمیت کا ناجائز فائدہ کبھی نہیں اٹھاتا تھا۔

میں اپنے کام میں مصروف رہنے لگا اور گھر کی دوسری ذمہ داریوں میں اُلجھتا چلا گیا اور وہ ڈاکٹر بن کر امریکا چلا گیا۔ میں نے سنا کہ اس نے امریکا کے امتحانوں میں بڑے اچھے نمبر لیے ہیں۔ شروع میں تو وہ ہر سال کراچی کا چکر لگاتا رہتا۔ وہ جب بھی آتا تھا ہم لوگ کئی شامیں ضرور ساتھ گزارتے تھے۔ برنس روڈ پر یا کسی چائنیز ریسٹورنٹ میں، گزرے زمانوں کی باتیں کرتے ہوئے۔ اس کی تینوں بہنوں کی شادی میں، میں نے نہ صرف یہ کہ شرکت کی تھی بلکہ بے انتہا کام بھی کیا تھا، بالکل گھر کے کسی فرد کی طرح۔

پھر بہنوں نے بڑے چاؤ سے کتنی ہی لڑکیوں کو دیکھنے کے بعد کلیم کے لیے بھی لڑکی پسند کرلی اور بڑی دُھوم دھام سے شادی ہوئی تھی اس کی۔ شادی سے پہلے تک تو کلیم ہمیشہ یہی کہتا رہا تھا کہ اسے امریکا کچھ دن رہنے کے بعد پاکستان واپس آنا ہے مگر شادی کے بعد ایسا لگا تھا کہ جیسے اسے کچھ یقین نہیں ہے کہ وہ پاکستان

واپس آئے گا۔ ہر سال وہ پاکستان آتا ضرور تھا مگر بے یقینی کی کیفیت کے ساتھ۔

اس کے ہاں پہلے دو جڑواں لڑکے ہوئے تھے جن کا عقیقہ بھی کراچی میں ہی ہوا۔ پھر ایک کے بعد ایک کرکے دو بیٹیاں بھی پیدا ہوگئی تھیں۔ اس کا کام امریکا میں بڑھ بھی گیا مگر چھٹیوں میں وہ آتا ضرور تھا۔

آہستہ آہستہ وہ امریکن ہوتا چلاگیا۔ میں نے اسے تبدیل ہوتا ہوا محسوس کیا تھا۔ اس کے انگلش بولنے کا انداز، اس کے زور سے چلانے کا طریقہ، بات بات میں ''گاڈ ڈیم'' کی تکرار، چھوٹے چھوٹے بل کو دینے کے لیے بھی پرس کا نکالنا پھر اپنے کسی کارڈ کے ذریعے بل دینے کی کوشش کرنا۔ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں جنھیں میں دیکھ رہا تھا کہ کس طرح سے آہستہ آہستہ وہ تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ بدلا ہوا پاکستانی امریکن۔ اس کے امریکن ہو جانے کے باوجود اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں محسوس کی تھی میں نے۔

مجھے ایک دفعہ اپنی کمپنی کی طرف سے ایک ٹریننگ کے لیے امریکا بھیجا گیا، نیویارک میں ایک ہفتے کا کام تھا میرا، اس کے بعد کلیم نے مجھے ٹکٹ بھیج کر اٹلانٹا بلا لیا تھا۔ پھر پانچ دن تک وہ اپنی ویگن میں مجھے لے کر گھومتا گھماتا رہا تھا۔ خوب سیر کرائی اس نے اور خوب پیسہ بھی خرچ کیا مجھ پر۔

وہ بڑی شان سے رہ رہا تھا امریکا میں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اٹلانٹا کے ایک اور علاقے میں عنقریب گھر لینے والا ہے جو بڑا بھی ہے اور اچھا بھی۔ اس کی بیوی نسیمہ بھی مجھے بہت خوش لگی اور بچے تو تھے ہی پیارے پیارے سے۔

میرے واپس آنے کے کچھ ہی ہفتوں کے بعد کلیم کی والدہ کا یکایک انتقال ہوگیا۔ زیادہ عمر نہیں تھی اس وقت ان کی، مشکل سے پچاس سال کی ہوں گی بس یکایک بیمار پڑ گئی تھیں۔ کچھ ذیابیطس کا مسئلہ تھا۔ کلیم کو خبر کی گئی اور اس کے آنے آنے تک وہ جاں بر نہیں ہوسکی تھیں۔ نہ جانے کیا ہوا، تیز بخار آیا ان کو، پھر دیکھتے ہی دیکھتے موت واقع ہوگئی۔ کلیم ایک ہفتہ رہ کر چلا گیا تھا۔ بہت اداس، بہت پژمردہ، بہت بے حال۔ میں اس کی بے حالی کا اندازہ کرسکتا تھا۔ اپنی ماں کی موت مجھے یاد تھی۔ مجھے کسی بھی قسم کا احساس جرم تو نہیں تھا مگر کلیم کو شدید احساس تھا کہ وہ موت کے وقت ان کے

سرہانے نہیں تھا۔ کاش وہ یہاں ہوتا تو شاید کچھ کرسکتا۔ آج کل کے زمانے میں کوئی ذیابیطس سے نہیں مرتا ہے اور یہ کوئی بیماری تھوڑی ہے، ایک ہارمون کی کمی ہے اور اس کی کمی سے کوئی مرجائے وہ بھی آج کل جب کہ ہر چیز ہر جگہ مل جاتی ہے۔ سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔

اس واقعے کے بعد کلیم کے والد تو یکایک بوڑھے بہت بوڑھے ہوگئے۔ تیس چالیس سال کا ساتھ اچانک اس طرح سے چھوٹ جائے تو شاید ایسے ہی ہوتا ہے۔

زندگی ان کے لیے بہت کٹھن ہوگئی۔ بڑا سا گھر تھا مگر گھر میں کوئی بھی نہیں تھا ان کے لیے۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں اور اکلوتا بیٹا امریکا میں۔ چھ مہینے کے اندر اندر کلیم نے انھیں اپنے پاس امریکا بلالیا مگر وہ دو ماہ سے زیادہ نہیں رہ سکے وہاں۔ امریکا کی زندگی انھیں راس نہیں آئی۔ بڑا گھر، گھر میں ہر قسم کا سامان، چوبیس گھنٹے کا ٹیلی وژن بھی۔ کلیم بھی، کلیم کی بیوی بھی اور بچے بھی مگر ان کا دل نہیں لگا تھا۔ وہ واپس آگئے اپنے اسی گھر میں جہاں ان کے بچے بڑے ہوئے تھے، جہاں سے ان کی بیٹیوں کی ڈولیاں اُٹھی تھیں اور جہاں سے ان کی بیوی کا جنازہ نکلا تھا۔ وہ اُداس ضرور تھے مگر مجھے لگا کہ وہ خوش بھی ہیں۔

کچھ ماہ کے بعد کلیم پھر آیا۔ مجھے یاد ہے، انھوں نے کلیم سے کہا تھا کہ وہ اتنا پڑھا لکھا ڈاکٹر ہے کہ اب اس کے لیے کراچی میں رہنا اور پیسے کمانا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔ کراچی میں مکمل طور پر غیر صلاحیت یافتہ ڈاکٹر کما رہے ہیں اور خوب کما رہے ہیں تو کلیم کا تو مقام ہونا ہی بلند تھا۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ کلیم کراچی واپس آجائے اور اپنا کام یہاں شروع کرے۔ مگر کلیم اب امریکا میں ہی رہنا چاہتا تھا۔ مجھے یاد ہے ہم دونوں نے صدر میں چوہدری فرزند علی کی دکان سے قلفی کھائی تھی، وہاں سے بوہری بازار کی طرف آئے تھے۔ کلیم نے پنجابی، بلوچی، پشتو اور سندھی گانوں کے کیسٹ خریدے۔ صدر کے کوآپریٹو مارکیٹ سے علاقائی دستکاری کا بہت سا سامان خریدا۔ زینب مارکیٹ سے ہاتھ کے کام کی چادریں اور قالین خریدے، ان سب کو امریکا کے اپنے پتے پر بک بھی کرایا تھا پھر ہم لوگ تھک کر وہاں سے ہالی ڈے ان کے، جو اب میریٹ ہوگیا ہے، نادیہ ریسٹورنٹ میں کافی پینے آگئے تھے۔ بات کرتے

کرتے یکایک کلیم نے کہا، ''یار میرے ابو کو سمجھاؤ۔ وہ یہاں کیا کر رہے ہیں، اس اسٹیوپڈ ملک میں؟ کیا ہے یہاں؟ اور کیا کروں گا میں یہاں؟ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا ہے۔ وہ خود تو امریکا چلنے کو تیار نہیں ہیں بلکہ اُلٹا مجھے کہہ رہے ہیں کہ میں بھی پاکستان آکر کراچی میں کام کروں۔ ارے یار! میں اس ملک میں کیا کام کروں گا؟ نہ کوئی قانون ہے نہ ہی کوئی نظام۔ میں کیسے سمجھاؤں ان کو؟ ان کی تو سمجھ میں ہی نہیں آتا ہے۔''

ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ امریکا میں بور اور پریشان ہوجاتے تھے۔ ان کے لیے امریکا میں میں کچھ بھی نہیں تھا۔ یہاں ان کی ایک دُنیا تھی وہاں اُن کا ایک لڑکا تھا۔ کلیم کے لیے پاکستان میں کچھ نہیں تھا۔ وہ افسردہ اور پریشان امریکا واپس چلا گیا اور وہ اپنے پرانے گھر میں اپنی یادوں کے ساتھ رہ گئے تھے۔

بیٹیاں باپ کے لیے پریشان رہتیں اور انھوں نے آپس میں ڈیوٹیاں لگالی تھیں۔ ہر ہفتے وہ کسی نہ کسی کے گھر چلے جاتے، گھر پر ایک نوکر کا بھی انتظام تھا اور زندگی ایک نئے ڈگر پر چل نکلی تھی۔ اس انداز پر وہ اگر خوش نہیں تھے تو ناخوش بھی نہیں تھے۔

پھر ایک روز گھر پر رات کو ڈاکو آگئے، جو بھی کچھ قیمتی سامان تھا لے گئے، کلیم کے ابا کو مار مار کر بے ہوش کر دیا اور نوکر کی جان چلی گئی تھی۔ ایسا ہی ہو رہا تھا کراچی میں اس وقت۔ دوسرے دن ان کی چھوٹی بیٹی ان کے گھر آئی تو اس نے وہاں سے دوسرے رشتے داروں کو اور مجھے فون کر کے بلایا، انھیں ہسپتال میں داخل کرنا پڑ گیا تھا۔

میں نے انھیں آغا خان ہسپتال میں دیکھا تھا۔ وہ ہوش میں تھے مگر خوف ان کے چہرے پر آنسوؤں کی طرح سے بہہ رہا تھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیوں ہوا، کیسے ہوا؟ انھوں نے رک رک کر بتایا تھا کہ ایک سیاسی جماعت کے لوگ ان سے کچھ پیسوں کا مطالبہ کر رہے تھے مگر انھوں نے منع کر دیا۔ جس پر ان سے کہا گیا کہ انھیں مار دیا جائے گا اور مکان پر قبضہ کر لیا جائے گا۔ انھوں نے اس بات کو محض دھمکی سمجھا تھا اور کسی سے کچھ کہا بھی نہیں تھا کہ یہ سب کچھ ہوگیا۔ کراچی میں تو

یہی ہو رہا تھا۔ لڑکے ہتھیار لے کر آتے تھے، دکانوں میں، مکانوں میں، کاروبار پر دن کو، رات کو... زبردستی پیسے بھی چھین لیتے، گھر والوں کو یرغمال بھی بنا لیتے تھے۔ عورتوں، لڑکیوں کی عزت پامال کر دیتے۔ کراچی پر تو جیسے جنگل کا راج تھا۔ انسان نہیں وحشی تھے سب لوگ۔ ان کے گھروں میں جہاں بوڑھے اکیلے رہ رہے ہوں یا جہاں بیوائیں بغیر سہارے کے زندگی کے دن گزار رہی ہوں وہاں تو جانے کیا کچھ ہو جاتا تھا۔ بھرے پرے گھروں پر بھی بڑی تعداد میں اسلحہ لے کر راتوں کو حملہ ہوتا تھا۔ پولیس، رینجر اور سیاسی لیڈر چین کی نیند سو رہے تھے۔ لوگ پریشان تھے۔ کلیم کے ابو پریشان تھے، سخت پریشان۔ دو دن بعد وہ ہسپتال سے اپنی دوسری بیٹی رخسانہ کے گھر منتقل ہوگئے تھے۔ ایک ماہ کے اندر ہی ان لوگوں نے ناظم آباد کا پرانا مکان فروخت کر دیا تھا۔

مکان سے قیمتی چیزیں تو پہلے ہی چوری ہوگئی تھیں۔ کچھ فرنیچر وغیرہ میں نے خریدنے کی کوشش کی تھی جو بہت حجت کے بعد انھوں نے بہت ہی تھوڑے پیسوں میں مجھے دے دیا تھا اور میں نے دیکھا تھا کہ چند چھوٹی چھوٹی بچوں کے بچپن کی چیزوں کو انھوں نے احتیاط سے الگ کر لیا تھا۔ کلیم آیا نہیں فون آتے رہے تھے۔ اس کے ابا کے پاس بھی اور میرے پاس بھی۔ مجھ سے اس نے کہا تھا کہ میں ہفتے دو ہفتے میں انھیں ضرور دیکھ لیا کروں۔ میں نے اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ میرے جانے کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ وہ اپنی بیٹی کے گھر میں تھے، اپنے نواسوں نواسیوں کے درمیان۔ ان کا داماد بھی بہت خیال رکھنے والا آدمی تھا۔ مگر پھر کلیم کی خواہش تھی تو میں ان کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ بڑی پابندی کے ساتھ ان کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ ان سے باتیں کرتا تھا ان کے بارے میں ان کی صحت کے بارے میں، اور وہ باتیں کرتے تھے کلیم کے بارے میں، کلیم کے کام کے متعلق، کلیم کا بچپن اور کلیم کا گھر جو اٹلانٹا میں تھا۔ انھیں اس کے بارے میں باتیں کر کے مزہ آتا تھا۔

آہستہ آہستہ وہ اپنی بیٹی کے گھر میں سیٹ ہوگئے۔ بچوں کے ساتھ مصروف رہتے، اخبار پڑھتے اور محلے کی مسجد میں جا کر نماز پڑھ لیتے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ بے چینی سے میرا انتظار کرتے رہتے تھے۔ کلیم کی باتیں سناتے، اس کے فون کا ذکر کرتے، اس کے بچوں کی تصویریں دکھاتے۔ مجھے پتا تھا کہ اس کی باتیں کر کے وہ خوش

ہوتے ہیں اور ان کے پاس خوش ہونے کے لیے تھا بھی کیا۔

کلیم پھر نہیں آیا۔ وہ خط بھی نہیں لکھتا تھا، ہاں فون کرتا تھا، مصروف آدمی کے لیے فون کرنا آسان ہوتا ہے۔ فون پر صرف آواز ہوتی ہے۔ کم وقت میں بہت ساری باتیں کرنے کی خواہش ہوتی ہے، آدمی کی شرمندگی بھی چھپ جاتی ہے اور احساس جرم کو بھی چھپایا جا سکتا ہے۔ خط میں تو بڑی جگہ ہوتی ہے، بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، بہت کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ خاص کر اگر اپنے گھر بھیجا جا رہا ہو تو۔ وہ پاکستان آنے سے ڈرتا تھا۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ اپنے باپ سے کہے کہ وہ پاکستان نہیں آئے گا۔ اس میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ انھیں آ کر دوبارہ امریکا لے جانے کے لیے آمادہ کرتا۔

وہ فون کرتا اور ہر مہینے اس کے اکاؤنٹ سے خود بہ خود کچھ رقم ان کے اکاؤنٹ میں منتقل ہوجاتی۔ الیکٹرونک ٹرانسفر۔ کاش الیکٹرونک کے ذریعے جذبات، احساسات، پیار بھی ٹرانسفر ہوسکتے۔ کلک سے بٹن دبا کر کسی کے جلد کی نرمی کا احساس ہوسکتا، ہونٹوں کی نمی محسوس ہوتی۔ آنکھوں کی چمک نظر آتی، کپکپاتے ہوئے ہاتھ اور دھڑکتے ہوئے دل بھی محسوس ہوتے۔ الیکٹرونک ٹرانسفر سے یہ سب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس سے تو صرف ڈالر ٹرانسفر ہوسکتے تھے۔ سنگ دل ڈالر کے نوٹ، حساب کتاب کے ساتھ۔

مجھے یاد ہے، ایک دن انھوں نے کہا، ''پرانا زمانہ اچھا تھا جب پوسٹ مین منی آرڈر کے ذریعے پیسے لے کر آتا تھا تو ایک رومانیت ہوتی تھی اس میں۔ سارے محلے کے لوگوں کو پتا ہوتا کہ آج بیٹے نے پیسے بھیجے ہیں۔ پوسٹ مین کو چائے پلائی جاتی، کچھ پیسے دیے جاتے اور آدمی فخر سے سر اُٹھا کر گھومتا۔ لوگوں کو بھی پتا ہوتا کہ اس کا بیٹا ہے، قابل ہے، دور ہے، مگر باپ کا خیال کرتا ہے۔ آج کل کیا ہے، محض بینک سے آیا ہوا ایک خط، آپ کے اکاؤنٹ میں اتنے ڈالر آ گئے ہیں۔ ٹھنڈے کالے حروف، جذبات سے عاری کسی ٹائپ رائٹر کی ٹھک ٹھک کی طرح تکلیف دہ۔'' وہ ایسی ہی باتیں کرنے لگے تھے۔ وقت کے ساتھ بڑھاپا اور کم زوری دونوں انھیں آہستہ آہستہ فتح کرتے چلے جا رہے تھے۔

ایک دن جب میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ دونوں چھوٹی بیٹیوں نے انھیں نہلا کر غسل خانے سے نکالا تھا اور وہ کرسی پر بیٹھے چائے کے ساتھ بسکٹ کھا رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ وہاں رہی تھیں پھر چلی گئیں، تو انھوں نے کہا تھا کہ یہ لوگ مجھے رشید، جو ان کا خاص نوکر تھا، اس کے حوالے نہیں کرتے ہیں بلکہ مجھے خود سے نہلاتے ہیں۔ بڑی تکلیف دیتا ہوں ان لوگوں کو۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر پھر بولے کہ جب صرف بیٹیاں ہوتی تھیں تو سب لوگ ہم دونوں میاں بیوی کو رحم کی نظر سے دیکھتے تھے بلکہ مجھے یاد ہے میری ماں نے تو کہہ بھی دیا تھا کہ میاں بیٹا نہیں ہوگا تو بڑھاپا کیسے گزاروگے؟ دیہات کی سادہ عورت تھیں وہ، جو انھوں نے دیکھا وہی کہہ دیا تھا۔ کلیم کی ماں کو بہت برا لگا تھا۔ اگرچہ ہم دونوں کی شدید خواہش تھی کہ بیٹا بھی ہوجائے ہم لوگوں کو، پھر خدا نے بیٹا بھی دے دیا۔ کیا کیا خوشیاں نہیں منائی تھیں ہم لوگوں نے۔ کس کس طرح ناز اُٹھائے تھے ہم نے کلیم کے مگر غلط تھی میری ماں۔ اسے کیا پتا تھا کہ امریکا بھی کوئی جگہ ہے جہاں بیٹے جا کر مصروف ہوجاتے ہیں اور بیٹیاں اپنے بوڑھے ماں باپ کے بڑھاپے کا سہارا بنتی ہیں۔ ان کے لہجے میں شکایت تھی، بلا کا درد تھا مگر ساتھ ہی کلیم کے لیے بے تحاشا پیار بھی۔ ارے وہ کرتا بھی کیا یہاں پر؟ اتنی قابلیت کے ساتھ تو وہ ضائع ہوجاتا۔ پاکستان کو اچھے ڈاکٹر تھوڑی چاہییں، گدھے چاہییں، گدھے آجاتے ہیں یہاں جو وہاں کچھ نہیں کر سکتے ہیں جو وہاں ناکام ہوجاتے ہیں۔ کلیم تو بڑا قابل ڈاکٹر ہے۔ وہاں کے لیے ہی ہے وہ۔ یہاں کیا کرے گا؟ پھر صحیح کہتا ہے کلیم۔ کراچی میں تو اب بچوں کی تعلیم بھی صحیح طریقے سے نہیں ہوسکتی ہے۔ یہاں بچے تو ضائع ہوجائیں گے۔ سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے چکروں میں...

عام طور پر میں ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتا اور یہی کیا میں نے اس وقت بھی۔

آج وہ طویل بیماری کے بعد مر گئے۔ کل تدفین ہوجائے گی۔ تینوں بہنیں گلے لگ کر باپ کے لیے رولیں گی۔ بھائی فلائٹ نہ ملنے کی وجہ سے دیر سے پہنچے گا۔ دو دن، چار دن غم زدہ ماحول میں رہنے کے بعد چیزیں نارمل ہونا شروع ہوجائیں گی اور پھر افسردگی کے ساتھ ہم سب لوگ کلیم کو ایئرپورٹ پر جا کر الوداع کہیں گے۔ میں نے سوچا۔

مگر کلیم نہیں آیا اور میں کلیم کو وہ بڑا سا پیکٹ بھی نہیں دے سکا جو اس کے والد نے مرنے سے کچھ عرصے قبل میرے حوالے کیا تھا کہ جب بھی کلیم آئے میں اسے دے دوں۔ ''اس میں اس کے لیے کچھ اہم ہدایت ہے۔'' انھوں نے ہنس کر مجھے کہا تھا پھر ایک کہانی بھی سنائی تھی۔ نہ کلیم آیا تھا، نہ بہنوں کو اس کے ساتھ مل کر رونے کا موقع ملا اور نہ ہی وہ کہانی میں اسے سنا سکا۔

پھر یکایک مجھے میری کمپنی کی طرف سے امریکا جانا پڑ گیا۔ کلیم کو میں نے خبر کی کہ نیویارک میں ایک ہفتہ گزارنے کے بعد میں اس کے پاس آؤں گا۔

اٹلانٹا کے بڑے سے ایئرپورٹ پر وہ مجھے لینے آیا۔ یہ ایئرپورٹ جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ سے بھی شاید بڑا تھا۔ ایئرپورٹ کیا چھوٹا سا ایک شہر تھا۔ نہ جانے کتنے ٹرمینل تھے اور ایک ٹرمینل سے دوسرے ٹرمینل جانے کے لیے اندر، اندر ٹرین کا نظام تھا۔ ایک وقت میں کئی کئی جہاز آتے جاتے رہتے تھے۔ ہم لوگ کراچی میں ایک بس کا اڈا نہیں بنا سکے تھے۔ ان لوگوں نے ہر شہر میں شہروں سے بھی بڑے ایئرپورٹ بنا لیے تھے۔

وہ اٹلانٹا میں اسٹون ماؤنٹین کے علاقے میں رہتا تھا۔ پورا اٹلانٹا گہرے سبز رنگ کے درختوں سے بھرا ہوا ہے اور اسٹون ماؤنٹین کا علاقہ بڑا شان دار، خوب صورت اور امیر لوگوں کا علاقہ ہے۔ پیچ اسٹریٹ کے اوپر ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے اس کا بڑا سا مکان تھا۔

گھر پہنچتے ہی اس نے مجھے پورے گھر کی سیر کرائی۔ بڑا سا خوب صورت سا لان، سوئمنگ پول، لان کے ساتھ گھوڑوں کو رکھنے کی جگہ، مکان کے نیچے ایک تہہ خانہ جس میں ورزش کرنے کا سامان اور اسٹور تھا۔ ایک بڑا ہال سا تھا اوپر، جس میں ایک بڑا سا ڈرائنگ روم، اس کے ساتھ ایک بڑا سا باورچی خانہ اور کچھ کمرے بنے ہوئے تھے۔ اس نے ڈرائنگ روم سے نکلتے ہوئے کہا کہ یہ میرا پاکستان ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

پھر وہ مجھے ہر ایک کمرے میں لے گیا۔ ہر کمرے کی ڈیکوریشن مختلف تھی۔ پنجاب، بلوچستان، سندھ اور سرحد کے حوالے سے۔ وہاں کی دست کاری، وہاں کی

تصویریں وہاں کے بنے ہوئے قالین اور وہاں کی موسیقی کے کیسٹ موجود تھے۔ ہر کمرے کو صوبے کے لحاظ سے سجایا بنایا گیا تھا۔ لگتا تھا کہ ان کمروں کی سجاوٹ بناوٹ میں بڑی محنت اور عرق ریزی کی گئی ہے اور ساتھ ہی بے تحاشا پیسے بھی خرچ کیے گئے ہیں۔ وطن سے دُور، وطن کا ہر صوبہ اس نے اپنے گھر میں بنا لیا تھا۔ ''یہ سارے ہمارے مہمانوں کے لیے کمرے ہیں۔ تم کہاں سونا چاہوگے۔ چلو تمھیں کراچی میں سلاتا ہوں۔ یہ ذرا الگ سا کمرہ میں نے سندھی کمرے کے اندر بنایا ہوا ہے۔ یہ سندھ میں شامل بھی ہے اور سندھ سے الگ بھی ہے۔ سندھ میں شامل ہے کیوں کہ یہ سندھ کا علاقہ ہے اور الگ بھی ہے۔ یہاں پر مہاجر، سندھی، پنجابی، بلوچ، پٹھان، افغانی، ہندو، عیسائی، پارسی، چینی، یہودی، کچھی اپنے الگ وجود کے ساتھ رہتے ہیں۔ اب تو ہر طرح کے لوگ کراچی آ گئے ہیں۔ امریکا میں جارجیا کے شہر اٹلانٹا کے ایک گھر میں پاکستان کے چاروں صوبے بغیر کسی جھگڑے کے ایک ساتھ خوشی خوشی رہ رہے تھے۔

اوپر کے حصے میں اس کے اور بچوں کے کمرے تھے اوپر بھی پکانے اور کھانے کا علاحدہ انتظام تھا۔ بہت خوب صورت گھر تھا اس کا بڑی محنت کی تھی اس نے اور اس کی بیوی نے اس کو سجانے میں۔ امریکن مہمان گھر دیکھ کر ضرور مرعوب ہو جاتے ہوں گے۔

اس کے بچوں اور بیوی سے ملنے کے بعد ہم نے کھانا کھایا اور کافی پیتے پیتے اس نے یکایک مجھ سے کہا تھا، ''بہت مس کرتا ہوں پاکستان۔ لیکن دیکھو، آ نہیں سکا وہاں پر۔ ابا جان نے شرط ہی اتنی بڑی لگا دی تھی۔ بڑا دل کرتا تھا میرا کہ میں ان کے پاس آخری وقت میں تو ہو آؤں۔ مگر یار مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ ان سے کہہ سکتا کہ میں پاکستان نہیں آؤں گا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پاکستان میں میرے لیے کچھ نہیں تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے بچے ہیں۔ ان کی تعلیم تو پاکستان میں ممکن ہی نہیں ہے۔ یار، کیا ہے، وہاں پر ہر چیز کا بیڑا غرق ہو چکا ہے۔ خاص طور پر بچوں کا تو کوئی مستقبل نہیں ہے۔''

میں نے اس سے بحث نہیں کی، اس سے اختلاف نہیں کیا، اس کا فائدہ نہیں تھا مگر میں نے دل میں سوچا کہ پاکستان کا یہ آدمی جو وہاں ایمان دار تھا، یہاں بے ایمان

ہوگیا ہے۔ اس ملک میں جہاں زیادہ تر لوگ سچ ہی بولتے ہیں، یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میرا دل کہتا تھا کہ میں اس سے کہہ دوں کہ وہ پاکستان نہیں آئے تو اس میں کوئی بری بات نہیں ہے، جو کچھ یہاں پر ملا ہے تمھیں شاید پاکستان میں نہیں ملتا مگر اتنی تو ہمت سے کام لو کہ صرف یہی بات کہو۔ کہو کہ تمھاری اقتصادی مجبوریاں ہیں، کہو کہ تم بے تحاشا ڈالر کے بغیر نہیں رہ سکتے ہو۔ زندگی کی یہ آسائشیں، یہ سڑک پر گھر، یہ بازار، یہ سہولتیں سب اچھی چیزیں ہیں۔ تم ان کے عادی ہوگئے ہو۔ نہیں رہ سکتے اس جگہ پر، مکھی مچھر کے درمیان، بغیر پانی بجلی کے گندگستان میں۔ بچوں کی تعلیم کا بہانہ تو نہ بناؤ۔ یہ عجیب بات ہے ہم لوگوں کی۔ پاکستان میں بھی ہر برا کام کرنے والا یہی کہتا ہے کہ وہ رشوت نہیں لینا چاہتا ہے۔ وہ بے ایمانی نہیں کرنا چاہتا ہے۔ یہ سب تو کرنا پڑتا ہے، اپنے بچوں کے لیے۔ آخر ان کا کیا قصور ہے؟ ان کو اچھی زندگی چاہیے۔ کتنے جھوٹے ہیں لوگ پاکستان سے امریکا تک۔ لیکن اس سے میں یہ بات نہیں کہہ سکا۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں سنتا رہا پھر مجھے اس کے والد کے دیے ہوئے پیکٹ کا خیال آیا جس نے میرے سوٹ کیس کے تلے کو تقریباً مکمل طور پر گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ میں نے وہ پیکٹ اسے لاکر دے دیا۔

اس نے وہ پیکٹ میرے سامنے ہی کھول لیا۔ خاکی رنگ کے اس بڑے سے پیکٹ میں کچھ تصویریں تھیں اور ایک چھوٹا سا کیرم بورڈ اور ایک لفافے میں اس کیرم بورڈ کی چھوٹی چھوٹی گوٹیاں تھیں۔

''یہ دیا ہے تمھارے ابا نے تمھارے لیے۔ اسے بہت سنبھال کر رکھا ہوا تھا انھوں نے۔ اپنا مکان چھوڑتے ہوئے اور کچھ نہیں اٹھایا تھا گھر سے۔ انھیں گھر کے لٹ جانے کا شاید اتنا غم نہیں تھا جتنا اس کیرم بورڈ اور تمھارے کمرے کی چیزوں کے بچ جانے کی خوشی تھی۔ اس چھوٹے سے کیرم بورڈ کو سینے سے لگا کر رکھا تھا انھوں نے۔ ہر روز اسے چھوتے تھے جیسے تم کو چھو رہے ہیں، دھیرے سے ہنستے تھے، جیسے تمھیں ان گوٹیوں سے کھیلتے ہوئے دیکھ رہے ہوں۔ اپنی تینوں بیٹیوں سے پیار تھا انھیں، تم سے شدید محبت تھی۔ تم بیٹے تھے ان کے، اکلوتے بیٹے۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ تم جب بہت چھوٹے تھے تو تم نے ایک دن ان سے جلدی آنے کو کہا تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے

اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ان کے کالر کو پکڑ کر ان کے گالوں کو چوم کر اپنی تتلاتی ہوئی زبان میں۔ ان کو یاد تھا ایک ایک لفظ جو تم نے کہا تھا، ایک ایک حرکت جو تم نے کی تھی۔ ان کے ذہن کے پردے پر سلو اسپیڈ میں چلتی ہوئی کسی فلم کی طرح وہ پوری طرح محفوظ تھی اور اسی دن وہ نہیں آسکے تھے اور تم انتظار کر کر کے پریشان ہوتے رہے تھے۔ تمھیں خوش کرنے کے لیے یہ چھوٹا سا کیرم بورڈ خریدا تھا انھوں نے۔ تم اسے دیکھ کر خوش ہوگئے تھے اور نہ جانے کتنے دنوں تک تم اس سے کھیلتے رہے تھے۔ انھیں تو جیسے ایک ایک گیم یاد تھا۔ ایک ایک گوٹی کے ساتھ ایک کہانی تھی اور ایک ایک اسٹرائک کے ساتھ ایک قصہ تھا۔ یہ بالکل بچوں والی باتیں ہیں۔ صرف ایک قصہ ہے مگر انھوں نے مجھے سنایا تھا اور کہا تھا کہ تمھیں اسی طرح سے بتا دوں۔ انھوں نے تمھیں کھو دیا۔ تمھارا کیرم بورڈ تو ان کے ساتھ تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ کیرم بورڈ تمھیں دے دوں تو پھر ایک بار خوش ہوجاؤ گے، ان کے امریکا نہ آنے سے تم شاید ناراض ہوگئے ہو۔"

کلیم ساکت اپنی ویران آنکھوں سے مجھے تک رہا تھا اس نے کیرم بورڈ کو زور سے سینے سے لگا لیا جیسے کوئی اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیتا ہے۔

□

عورت کا سرطان

''بچہ دانی کے منھ کا کینسر مسلمان اور یہودی عورتوں کو بہت کم ہوتا ہے، پتا ہے کیوں؟''

میرے باس نے سوال کیا تھا اور میرے جواب سے پہلے وہ خود ہی بول پڑا تھا۔ ''اس لیے کہ مسلمان اور یہودی دونوں ختنہ کراتے ہیں اور دونوں ہی مذہب کے ماننے والوں میں جنسی بے راہ روی کم ہے۔ تمھیں تو پتا ہے ناں کہ بچہ دانی کے منھ کا کینسر جوان عورتوں کو ہوتا ہے۔ تیس سے پینتیس سال کی عورتوں کو۔ ان عورتوں کو جن کی جنسی زندگی تیرہ چودہ سال کی عمر سے ہی شروع ہوجاتی ہے، جن کے بہت سارے جنسی ساتھی ہوتے ہیں، جن کے جنسی ساتھیوں کے ختنے نہیں ہوئے ہوتے ہیں۔ اور یہ ساری ابھی تک کا سائنسی علم یہی کہتا ہے۔''

رضیہ کے مرنے کی جتنی خوشی مجھے ہوئی اتنی شاید کسی کو بھی نہیں ہوئی ہوگی بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ میرے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی کوئی بات پہلے ہوئی ہی نہیں تھی تو یہ کہنا غلط نہیں ہوگا۔

باقی لوگوں کے لیے رضیہ محض ایک عورت تھی، ایک جواں سال عورت، قبول صورت عورت۔ ایک ایسی عورت جو ہمارے درمیان کہیں نہ کہیں موجود ہے، ہم

سب کے دروازوں سے گزرتی ہوئی، ہمارے گھروں میں آتی ہے۔ ہمارے گھروں کے کام کاج کرتی ہے۔ اس کے ساتھ کبھی بچے ہوتے ہیں، کبھی نہیں ہوتے۔ وہ کبھی آتی ہے کبھی غائب ہوجاتی ہے۔ ہم اسے بھول جاتے ہیں، وہ پھر نمودار ہوتی ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزر کر خاموشی سے مر جاتی ہے اور لوگ باگ اس کے مرنے پر رسمی تعزیتی جملے کہتے ہیں۔ افسوس کرتے ہیں، ایک ایسا افسوس جس کا کوئی مطلب نہیں ہوتا ہے، جس کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔

اگر آپ کو رضیہ کے بارے میں پتا ہوتو آپ بھی افسوس نہ کریں بلکہ خوش ہوں۔ ایسے ہی خوش جیسے میں ہوا تھا۔ اس کی موت خوشی منانے کے لیے ہی تھی۔

اسے ایدھی ایمبولینس کا ایک ڈرائیور جاوید میرے پاس لے کر آیا تھا۔ جاوید اچھا آدمی تھا، اچھا ڈرائیور تھا۔ وہ میرے ہسپتال میں ہمیشہ ایمرجنسی میں ہی مریض لے کر آتا تھا۔ حاملہ عورتیں جن کا خون بہہ رہا ہوتا تھا، حاملہ عورتیں جنھیں دورے پڑ رہے ہوتے تھے، حاملہ عورتیں جو حمل ضائع کرانے کے دوران کسی مشکل کا شکار ہوگئی تھیں اور پھر ہمارے ہسپتال پہنچائی گئی تھیں۔ وہ اپنا کام بہت ہی ایمان داری سے کرتا تھا اور یقیناً بہت سی جانیں بچانے میں اس نے بہت کچھ اپنے پاس سے کھویا تھا۔

رضیہ اس کے ساتھ ہی آئی تھی۔ پہلی نظر میں مجھے وہ ایک عام سی عورت لگی۔ کالا برقعہ پہنے ہوئے، ایک عجیب قسم کی سراسیمگی اور کشش تھی اس کے چہرے پر۔ برقعے نے اس کا جسم ڈھانپا ہوا تھا مگر چہرے پر کسی قسم کا کوئی نقاب نہیں تھا۔ وہ جاوید کے ساتھ خاموشی سے میرے کمرے میں داخل ہوکر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

تھوڑی دیر میں ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس کی سراسیمگی اور کشش کے پیچھے ایک کم زوری تھی، ایک درد تھا، کچھ تھا جو اس نے اپنے سینے کے اندر، بہت اندر اپنے دل کے کسی بہت ہی گہرے خانے میں چھپا رکھا تھا۔ مجھے اس سے ہمدردی ہوگئی۔

جاوید نے بتایا تھا کہ رضیہ اس کے محلے میں ہی رہتی ہے، ایک جھگی سی ڈال رکھی ہے اس نے اپنے دو بچوں کے ساتھ۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی کہیں سے آئی تھی، شوہر کے مرنے کے بعد کوئی نہیں تھا اس کا اور اب بنگلوں میں جھاڑو پونچھے کا کام کرکے کسی نہ کسی طرح سے اپنا گھر اور کام چلا رہی ہے۔

میں نے جاوید سے باہر بیٹھنے کو کہا اور ڈاکٹر عذرا سے کہا کہ ذرا رضیہ کو دیکھ کر بتائیں کہ کیا مسئلہ ہے؟

رضیہ مسلسل خون بہنے کے سبب سے آئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ چھ ماہ قبل اس کا شوہر مرگیا تھا جس کے بعد سے خون مسلسل بہہ رہا ہے، آہستہ آہستہ کر کے، وقت بے وقت۔ کبھی خود ہی رک جاتا تھا اور کبھی خود ہی بہنا شروع ہوجاتا ہے۔ پتا نہیں اسے کس قسم کی اندرونی بیماری ہوگئی تھی۔

میں نے جب اس کا معائنہ کیا تو یہ بات بالکل واضح تھی کہ اسے بچے دانی کے منھ کا کینسر ہے اور مرض بہت آگے تک جا چکا ہے، اس قابل نہیں تھا کہ آپریشن کر کے کینسر زدہ بچہ دانی کو نکالا جاسکے۔ مجھے معائنہ کرتے وقت بڑا افسوس ہوا تھا کہ یہ جوان عورت کچھ مہینوں میں آہستہ آہستہ، رک رک کر، تھکی تھکی موت کا شکار ہوجائے گی۔ مجھے اتنی بھی ہمت نہیں ہورہی تھی کہ میں اس سے کہہ سکوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کے بچوں کا کیا ہوگا؟ شوہر پہلے ہی مر چکا ہے، میرے دُھویں جیسے چہرے کو دیکھ کر وہ بھی بھانپ گئی تھی کہ خبر اچھی نہیں ہے۔

میں نے جاوید کو بلایا تھا اور اس کے سامنے اسے سمجھایا کہ اسے بچہ دانی کے منھ کا کینسر ہوگیا ہے۔ اس کا علاج شروع میں تو یہ تھا کہ آپریشن کرکے بچہ دانی ہی نکال دی جائے مگر اب مرض اتنا بڑھ چکا ہے کہ یہ آپریشن ممکن نہیں ہے۔ علاج کے لیے جناح ہسپتال جانا پڑے گا جہاں پر بجلی لگا کر علاج کیا جائے گا، مگر علاج کا کتنا فائدہ ہوگا اور مرض میں کتنا افاقہ ہوگا؟ اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

میں چاہنے کے باوجود اسے نہیں بتا سکا کہ اب موت اس کے دروازے پر کھڑی ہے اور یہ کہ جناح ہسپتال کی ریڈیوتھراپی بھی اس کی جان نہیں بچا سکے گی۔ وہ کینسر کے آخری اسٹیج پر ہے اور اب اس کی موت ہی اسے درد کے مستقل عذاب سے نجات دلا سکے گی۔

میں اکثر سوچتا ہوں زندگی اتنی ظالم، اتنی سفاک، اتنی بے پروا، اتنی بے غرض کیوں ہے؟ یکایک ختم ہو جاتی ہے، کچھ نہیں دیکھتی، کچھ نہیں سمجھتی۔ چھوٹے بچے، بین کرتی ہوئی مائیں، ماتم کرتے ہوئے جوان مرد عورت، حالات، وقت کا تقاضا، یہ کچھ

نہیں سوچتی، کچھ نہیں سمجھتی۔ مجھے کینسر کے مریض دیکھ کرایک عجیب قسم کی بے بسی اور بے قراری سی ہو جاتی ہے۔ عجیب قسم کی اداسی کا شکار ہوجاتا ہوں اور اس دن بھی یہی ہوا تھا۔ اس صبح کو بھی میں عادت کے مطابق اپنی پرانی کاپیوں میں سے پچھلے نوٹس پڑھ رہا تھا اور بچہ دانی کے منھ کے کینسر کے بارے میں اپنے بڈھے باس کی باتیں یاد کر رہا تھا کہ آج ہی رضیہ یہ مرض لے کر آئی تھی۔ تمام تر خوف ناک مسائل کے ساتھ۔ جوان عورت، چھوٹے بچے غربت... موت... زندگی کسی کو تو سہارا دے۔ میں صرف سوچ کر ہی رہ گیا تھا۔

میں نے دیکھا تھا کہ اس کے چہرے کی سراسیمگی شدید اور گہری ہوتی چلی گئی تھی۔

''تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے؟'' اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

میں نے بڑی ہمت کر کے جواب دیا تھا کہ ہاں اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ مگر کوشش ضرور کریں گے، کوشش کرنا ہمارا کام ہے۔ مجھے لگا تھا کہ جیسے کسی ڈھول کی زبان میں بول رہا ہوں۔ تیز دھم دھم کر کے، مگر جس کا کوئی حاصل نہیں ہے۔ جس کی آواز تو ہے مگر احساس سے خالی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ کینسر کے ڈاکٹروں کے لیے موت بھی ایک عام واقعہ ہوتی ہے۔ وہ موت دیکھ دیکھ کر موت کے ایک طرح عادی سے ہوجاتے ہیں۔ پھر ان میں احساس ختم ہو جاتا ہے۔ یہ تجربہ انھیں سنگ دل اور بدتمیز بنا دیتا ہے پھر وہ موت کے بارے میں باتیں کرنے سے گھبراتے نہیں ہیں۔ اور میں نے دیکھا بھی تھا، زیادہ تر کینسر کے ماہر ڈاکٹر مریضوں سے بڑی درشتگی سے بات کرتے ہیں۔ شاید مریض کا مرنا مریض کے رشتے داروں کے لیے اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا جتنا کینسر کے ڈاکٹر کا درشت رویہ اور بھیانک چہرہ اذیت ناک ہوتا ہے جو موت کی خبر سناتا ہے بے رحمی کے ساتھ۔

میں نے جناح ہسپتال کے ڈاکٹر کے نام ایک خط لکھ کر دیا تھا کہ جاوید اسے وہاں لے جائے تاکہ اس کا جو علاج بھی ممکن ہوسکتا ہے، وہ ہوجائے۔

دو ہفتے بعد جب میں رضیہ کو دوسرے مریضوں کے ہجوم میں کھو کر بھول چکا تھا، وہ صبح صبح میرے کمرے میں آئی تھی، اس کے چہرے پر نقاہت تھی اور ستا ہوا چہرہ

کم زوری کے باوجود خوب صورت لگ رہا تھا۔

میں نے اس سے بہت ہمدردی سے بات کی۔ وہ بہت پریشان تھی، مجھے اندازہ تھا کہ موت کا خدشہ کتنا پریشان کن ہوتا ہے۔ ایسا زہر ہے جو بہت ٹھہر ٹھہر کر اور دھیرے دھیرے جان لیتا ہے۔ ذہن اور روح دونوں کو کچلتا رہتا ہے۔

''ڈاکٹر میں کتنے دن اور بچوں گی؟'' اس نے بڑی التجا سے سوال کیا تھا۔

''مجھے ایک دفعہ بجلی لگائی گئی ہے مگر میں تو بہت کم زور ہوگئی ہوں، میرے بچوں کا کیا ہوگا، ڈاکٹر مجھے صاف صاف بتا دو، کچھ چھپانا مت مجھ سے۔''

آخری جملے نے مجھے بھی حوصلہ دیا تھا کہ میں صاف صاف سچ سچ اسے بتادوں۔ اور میں نے یہی کیا تھا۔

میں اس کے سامنے والی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ میرے ہسپتال کی آیا میرے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دھیرے دھیرے کہا تھا کہ چھ آٹھ ماہ سے زیادہ وہ نہیں بچ سکے گی اور موت کے آخری دن بڑی مشکلات والے ہوں گے، درد ہوگا اور تکلیف بڑھتی چلی جائے گی۔ ''میں تمھاری مدد کروں گا، ہسپتال میں داخل کرلیں گے تم کو۔ تم نے بڑی بہادری دکھائی ہے، بہت بہادری سے سوال کیا ہے اور بہادری سے ہی سب کچھ سہنا ہوگا۔ دیکھو موت تو اٹل ہے وہ آ ہی جاتی ہے اور یہ سب کچھ سہنا ہی ہوتا ہے۔'' بہت مشکل سے یہ سب کچھ میں نے کہا تھا بہ ظاہر سیدھے سادے الفاظ میں لیکن وہ کتنے مشکل ہوں گے اس کا اندازہ ہر کوئی نہیں لگا سکتا ہے۔

اس نے بڑی زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''میں موت سے نہیں ڈرتی ہوں جو زندگی میری ہے اس کے بعد تو موت بھی اچھی ہوگی۔ مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ مجھے بچوں کی فکر ہے ان کا کیا ہوگا؟'' یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ خلا میں کچھ گھور رہی ہے۔ جیسے دُور کہیں چھوٹا سا تارہ ٹمٹما رہا ہے۔ اسے بلا رہا ہے۔

میں نے پھر ہمت کی اور دلاسا دینے کے لیے کہا تھا، ''دیکھو رضیہ! مرنا تو ہر ایک کو ہی پڑتا ہے اور قسمت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں کسی کو کچھ یہاں ملتا ہے کسی کو کچھ وہاں ملتا ہے، اوپر والے کا حساب اوپر والا ہی سمجھتا ہے۔ ہم لوگ تو بالکل جاہل اور عاجز بندے ہیں، اوپر والے کا حساب کتاب کیا جانیں گے، کیا سمجھیں گے؟ پر دیکھو

ہم لوگ یہ کر سکتے ہیں کہ میں اور جاوید مل کر تمھارے دونوں بچوں کا انتظام کر دیں۔ دیکھو کتنے میاں بیوی روز میرے پاس آتے ہیں جنھیں بچوں کی ضرورت ہے مگر قدرت نے انھیں اولاد نہیں دی ہے۔ ایسے ہی کوئی جوڑا ان دونوں بھائی بہن کو اپنا لے گا جو ان کا خیال رکھیں گے، انھیں تعلیم دیں گے اور اولاد کی طرح سے چاہیں گے، پالیں گے۔ بالکل اپنے بچوں کی طرح سے۔''

زندگی اتنی کٹھور ہوتی ہے، ایک مرتی ہوئی ماں سے یہ بات کہنا بڑا مشکل ہے مگر میرے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ یہ بات کہتے ہوئے مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے میرے دل کو اپنے ہاتھوں سے پیس کر رکھ دیا ہے۔

''ڈاکٹر میرے آٹھ بچے ہیں اور میں انھیں مرنے سے پہلے دیکھ بھی نہیں سکوں گی۔ میں سوچتی تھی اپنی زندگی تو گزر ہی جائے گی کسی نہ کسی طرح۔ ایک دن بوڑھی ہوکر میں تلاش کرلوں گی کامران کو، نعیم کو، سیما کو، فرزانہ کو، رفیق کو اور عمران کو۔ یہ دونوں تو ہیں ہی میرے پاس... پھر مر جاؤں گی۔ان سب کو دیکھتے ہوئے کسی سے شکایت کیے بغیر۔ زندگی نے اتنا تو سکھادیا ہے مجھے مگر اب یہ ہوگیا ہے۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ آپ کے اوپر والے نے انصاف تو نہیں کیا میرے ساتھ۔ اس کے کرب ناک چہرے پر شدید غصہ موجیں مار رہا تھا۔ یہ کیسا انصاف ہے آپ کے اوپر والے کا، ایک میں ہی عاجز بندی رہ گئی تھی اس انصاف کے لیے۔ صرف میں ہی رہ گئی ہوں۔ بے اولادوں کے گھروں کو اولاد والا بنانے کے لیے، کسی کا بچہ جننے کی مشین کی طرح یہ کام سونپ دیا گیا ہے مجھے۔ واہ رے مالک، واہ ری دُنیا؟''

''یہ کفر ہے رضیہ، اس طرح سے نہیں بولتے ہیں۔'' میں اپنے اوپر والے کے دفاع میں اور کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر یکایک میرے ذہن میں آیا تھا کہ اتنی جوان عورت کے آٹھ بچے کہاں سے ہوگئے اور میں نے پوچھا تھا، ''رضیہ باقی بچے کہاں ہیں؟ مجھے بتاؤ میں انھیں تم سے ملانے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے پورے خلوص دل کے ساتھ کہا تھا۔ ''میں پوری کوشش کروں گا کہ تمھارے اس آخری وقت میں وہ تمھارے ساتھ ہوں۔ جاوید سے کہوں گا۔ ایدھی والے تلاش کریں گے انھیں۔'' میں نے دلاسا دینے کی کوشش کی تھی۔

آپا پانی کا گلاس لے کر آ گئی تھی۔ یہ آپا میرے بہت سارے ڈاکٹروں اور نرسوں سے بھی اچھی تھی۔ مہربان اور ہمدرد... مریضوں سے پیار کرتی تھی۔ انھیں سمجھتی تھی اور انھیں سمجھانے کی کوشش بھی کرتی تھی۔ میں اس کی موجودگی میں مریضوں کے ساتھ اچھا محسوس کرتا تھا۔ اس نے ہمدردی سے پانی رضیہ کو پلایا ''دل نہ چھوٹا کرو رضیہ!'' اس نے مکرانی لہجے میں رضیہ سے کہا تھا۔

رضیہ نے پانی پیا، ایک طویل سانس بھری اور دھیرے سے بولی تھی وہ۔ ''سب کھو گئے، ڈاکٹر۔ نہ جانے کہاں کھو گئے، کوئی اورنگی میں، کوئی جیکب آباد میں، کوئی سانگھڑ میں اور کوئی لانڈھی میں۔ مجھے کیا ملا، بچہ دانی کے منھ کا کینسر۔'' اور پھر وہ دوبارہ خاموش ہوگئی تھی۔

''مجھے بتاؤ رضیہ، مجھے سب کچھ بتاؤ۔ میں تمھاری مدد کروں گا۔ اگر مجھے پتا چل جائے گا تو میں کوشش کروں گا کہ ان تک پہنچوں۔'' نہ جانے کیوں مجھے اس سے ہمدردی ہوگئی تھی۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا تھا جیسے تول رہی ہو پھر بولی، ''ڈاکٹر میں نو سال کی تھی تو میری ماں ہم تین بہنوں کو چھوڑ کر چوتھے بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی مرگئی۔ پھر میری دونوں بہنیں بھی ایک ایک کر کے مرگئی تھیں۔ میری تو سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ کیا ہوا میری ماں، میری بہنیں یکایک کہاں کھوگئیں، مجھے میرے باپ کی شکل یاد ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکے تھے۔ روتے رہتے تھے اور ہمیں دیکھتے رہتے تھے۔ تھوڑے دنوں کے بعد ایک دوسری ماں میرے گھر میں آگئی تھی۔ ابھی میں بارہ سال کی ہی تھی کہ میری شادی زمان سے کر دی گئی۔ میں تو اسے شادی ہی سمجھتی تھی مگر مجھے بعد میں پتا لگا تھا کہ میری شادی نہیں کی گئی تھی بلکہ میری سوتیلی ماں نے مجھے بیچ دیا تھا۔ مجھے تو پتا بھی نہیں ہے کہ میرے باپ کو پتا تھا بھی کہ نہیں۔ گھر پر کچھ لوگ آئے تھے، مجھے لال کپڑے پہنائے گئے تھے، ایک مولوی نے کچھ پڑھا تھا اور زمان مجھے اٹھا کر اپنے گھر لے آیا تھا۔ اورنگی میں ہی کسی جگہ پر، اُس بستی میں کسی مکان پر۔ اورنگی کی ہزاروں گلیوں میں لاکھوں مکانوں میں نہ جانے کس مقام پر آ گئی تھی۔ مجھے تو اب یاد بھی نہیں ہے۔

''زمان اچھا آدمی تھا مگر نشہ کرتا تھا۔ وہاں پر تو سبھی نشہ کرتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات۔۔ تو نہیں تھی۔ مجھے تو کچھ پتا نہیں تھا کہ زندگی میں اور بھی کچھ ہوتا ہے۔ میری زندگی تو میرا چھوٹا سا گھر تھا، جہاں میری ساس تھی اور زمان تھا اور پھر میرے ایک ایک کر کے دو بچے ہوگئے تھے، یہ دونوں لڑکے تھے ایک، ایک سال کا اور دوسرا دو سال کا۔

ایک رات میں ان دونوں کے ساتھ سو رہی تھی کہ رات گئے زمان گھر میں داخل ہوا اور مجھے نسیم کے حوالے کر دیا۔ وہ مجھے جوئے میں ہار گیا تھا۔ میرے دونوں بچے وہیں رہ گئے اور نسیم مجھے دوسرے آدمیوں کے ساتھ ٹیکسی میں ڈال کر نیوکراچی لے کر آگیا تھا۔ میری چیخ پکار، میرا شور شرابہ نہ میری ساس پر اثر کر سکا نہ ہی محلے والے کچھ کر سکے تھے اور نہ محلے کے ان مولوی صاحب کی آنکھیں کھلی تھیں جن کی اذان کی آوازیں روز آتی تھیں، نہ محلے کے ان سیاسی کارکنوں نے کچھ کیا، جن کی مرضی سے وہاں ہر کام ہوتا تھا اور نہ پولیس کی موبائل نے ان کے راستے روکے تھے۔

میں نیوکراچی کے کسی گھر میں قید تھی۔ پہلی رات تین آدمیوں نے مجھے باری باری پامال کیا۔ میں جوئے میں جیتی ہوئی عورت تھی۔ میرے ساتھ تو سب کچھ کیا جاسکتا تھا، میں کوئی انسان تھوڑی تھی۔ عورت تھی، بچہ دانی کے منھ کے ساتھ۔ تین دفعہ اس گھر سے میں بھاگی مگر تینوں دفعہ پکڑ لی گئی تھی اور ہر دفعہ مجھے مارا گیا، پیٹا گیا اور نہ جانے کتنے لوگوں نے مجھے پامال کیا۔ اسی عرصے میں دوبارہ حاملہ ہوگئی تھی اور اس حمل کے دوران بھی نہ جانے کیا کیا کچھ میرے ساتھ ہوتا رہا تھا۔ ایک ایک دن کی ایک ایک گھنٹے کی کہانی درد بھری داستان ہے۔۔۔''

میں تقریباً سکتے کی حالت میں اسے دیکھ رہا تھا۔ آیا کے چہرے کی جھریاں اور گہری ہوگئی تھیں۔

''پھر ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ گھر میں ہی دائی نے جنم دیا تھا اسے، بالکل میری ماں کی طرح شکل تھی اس کی اور میں اسے اپنی ماں کے نام سیما سے یاد رکھتی ہوں۔ صرف دس پندرہ منٹ کے لیے دیکھا تھا اسے میں نے اور اسے دائی اپنے ساتھ لے کر چلی گئی تھی۔ مجھے تو صرف آواز آئی تھی۔ ایک ہزار روپے دیے تھے دائی نے نسیم

کو اور مجھ سے کہا تھا بہت اچھے گھر میں پلے گی میری بیٹی، یہاں رہے گی تو یہ رنڈی بنا دیں گے اسے۔ میں جن لوگوں کو دے رہی ہوں ان کا کوئی نہیں ہے۔ شہزادی بنا کر رکھیں گے۔ عورت ایک عورت کے ساتھ ایسا کر سکتی ہے، یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔ اس وقت بڑا غصہ آیا تھا مجھے، مگر شاید یہ اچھا ہی ہوا میری سیما، میری ماں کسی شہزادی کی طرح پل رہی ہوگی۔ وہ لوگ تو اسے رنڈی بنا دیتے میری طرح سے۔

میری ہر وقت کے رونے دھونے اور بھاگنے کی کوشش سے نسیم بہت گھبرا گیا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے مارا بری طرح سے اور پھر مجھے ایک سندھی وڈیرے کے ہاتھ بیچ دیا۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ ایک گاڑی میں تین مرد آئے تھے جنھوں نے پچھلی سیٹ پر مجھے بٹھایا اور دو دن تک گاڑی چلانے کے بعد کسی جگہ لے کر پہنچ گئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے مکانوں سے ذرا ہٹ کر یہ ایک بڑا سا مکان تھا۔ کئی کمرے تھے کئی چوکیدار۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ جیکب آباد کا علاقہ ہے۔

حویلی کی عورتوں میں مجھے لا کر پھینک دیا گیا۔ کسی نے کچھ کھانے کو دیا، کچھ کپڑے دیے تھے۔ ہفتے ڈیڑھ ہفتے بعد مجھے رات کی تاریکی میں سائیں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ وہ مجھ سے کسی گڑیا کی طرح کھیلتا رہا اور میں سہمی سہمی ڈری ڈری اس کے حکم کے مطابق گڑیا بنی رہی۔ میرا جسم نچتا رہا، روح چھلنی ہوتی رہی، دماغ سن ہوتا گیا کہ مجھے کچھ نظر آنا ہی بند ہوگیا تھا۔ میرے حواس قائم تھے مگر سمجھ ختم ہوچکی تھی، میں پھر حمل سے ہوگئی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں؟ میں کسی کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔ پوری حویلی میں ایک خوف ناک ماحول تھا۔ سائیں کی بیوی بچے اور خاندان کے دوسرے لوگ کسی اور جگہ پر رہتے تھے۔ اس جگہ پر صرف چوکیدار تھے اور مختلف عورتیں تھیں، جنھیں سائیں یا سائیں کے دوست، سرکاری افسر، پولیس والے استعمال کرتے تھے۔ حمل کا پتا چلتے ہی سائیں نے مجھے اللہ نواز کے حوالے کر دیا تھا۔ اللہ نواز اپنے ساتھ مجھے ڈیرہ مراد جمالی کے کسی گاؤں میں لے کر آ گیا تھا۔ یہاں پر میری چوتھی بچی پیدا ہوئی تھی اور اللہ نواز نے ہی اسے فوزیہ کا نام دیا تھا۔ میں اس بچی کو ہر وقت اپنے سینے سے لگا کر رکھتی تھی۔ مگر دو دن کے بعد ہی ایک گاڑی میں ایک عورت آئی تھی اور

فوزیہ کو لے کر چلی گئی تھی۔ اللہ نواز نے بتایا تھا کہ یہی حکم سائیں کا تھا۔

وہ اچھا آدمی تھا۔ دو مہینے میں اس کے پاس رہی تھی، اس نے اور اس کی بیوی نے میرا خیال رکھا تھا۔ اس کی بیوی بڑی معصوم عورت تھی وہ بچوں کو دیکھتی تھی، کھیت پر کام کرتی تھی، مجھے اپنی زبان میں تسلی دیتی تھی اور شاید میری ہمدردی میں خاموشی سے روتی بھی تھی۔ میں سائیں کی امانت تھی اور ان کا فرض تھا کہ مجھے دیکھتے رہیں۔ دو مہینے کے بعد مجھے پھر سائیں کی حویلی میں پہنچادیا گیا تھا...''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیسا ملک ہے، یہ کیسا صوبہ ہے، یہ کیسے لوگ ہیں، کراچی سے جیکب آباد، اورنگی سے ڈیرہ مراد جمالی تک کس طرح سے ایک معصوم بچی کے جسم و روح پر، پے در پے وار کیے گئے ہیں۔ زخموں سے انھیں چھلنی کیا گیا ہے۔ غریب جواری سے لے کر زمینوں کے مالک وڈیرے تک، جو بھی اسے ملا ہے ایسا ہی ملا ہے۔ یہ ملک ہے ہمارا اور یہ لوگ ہیں۔ ہم نے ایٹم کے جن کو قابو میں کرلیا ہے لیکن انسان کے اندر کے شیطان کو قابو میں نہیں کر سکے ہیں۔ یہ اسی ملک میں ہو رہا ہے جہاں انسانی تہذیب پانچ ہزار سالوں سے کروٹیں لے رہی ہے۔ یہ وہ لوگ کر رہے ہیں جن کے اجداد نے سندھو دریا کے کنارے نسلوں کی حفاظت میں جانیں دی تھیں۔ بوڑھے سندھو دریا کو تو سوکھنا ہی ہوگا... یہ انتقام ہے انتقام۔

''تمھاری بچی ملی کہ نہیں؟'' میں نے آہستہ سے پوچھا، ''نہیں۔ اس کا مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ اللہ نواز نے مجھے صرف یہ بتایا تھا کہ سائیں نے کسی بڑے افسر کو وہ بچی دے دی تھی جن کا کوئی بچہ نہیں تھا اور مجھ سے بھی یہی غلطی ہوگئی تھی کہ سائیں کی حویلی میں کوئی افسر آیا تھا جس کی گاڑی کے ساتھ پولیس کی بھی ایک گاڑی تھی۔ میں تو یہی سمجھی تھی کہ اسی کے پاس میری بچی ہے۔ وہ سائیں سے باتیں کر رہا تھا کہ میں بھاگی ہوئی اس کے پاس چلی گئی تھی کہ مجھے ایک نظر فوزیہ کو دکھا دو، میں اس کی ماں ہوں... اس کی ماں ہوں...

اس نے مجھے حیرت سے دیکھا تھا اور مجھے سائیں کا غضب ناک چہرہ یاد ہے۔ چار پانچ لوگ مجھے فوراً ہی پکڑ کر لے گئے تھے۔ کمرے میں لے جا کر مجھے بند

کر دیا تھا۔ مجھے وہ سارے گھونسے، تھپڑ ابھی تک یاد ہیں بلکہ ان کے درد سے ابھی بھی کبھی کبھی میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

پھر میں نے سائیں کی شکل دوبارہ نہیں دیکھی۔ اسی شام مجھے پھر بیچ دیا گیا تھا۔ سائیں کو پتا نہیں تھا کہ میں پھر حاملہ ہوچکی ہوں اگر پتا ہوتا تو شاید مجھے پھر اللہ نواز کے پاس بھیج دیتا اور میرا بچہ کسی سرکاری افسر کے پاس پل رہا ہوتا۔ اس کی تعلیم ہوتی، اس کی تربیت ہوتی۔ پھر وہ بھی بڑا ہو کر کوئی بڑا سرکاری افسر بن جاتا۔ خدا جانے کتنے بڑے بڑے افسر وڈیروں، جاگیرداروں، چودھریوں، خانوں کی ہی ناجائز اولادیں ہیں، میری جیسی عورتوں کے جنے ہوئے جن کے بچہ دانیوں کے منھ پر کینسر ہوگیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی تھی۔ درد اس کے چہرے پر عیاں تھا۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ پھر بولی تھی۔

''اس دفعہ جس نے مجھے خریدا تھا اس نے اور اس کے دوستوں نے تین چار مہینے تک مجھے استعمال کرنے کے بعد پھر بیچ دیا تھا۔ میرا حمل کافی واضح ہوچکا تھا اور میری قسمت مجھے حیدرآباد کے چکلے میں لے کر آگئی تھی۔ یہاں پر، بھی ایک کے بعد دو بچے پیدا ہوئے تھے۔ ایک سائیں کا بیٹا تھا رفیق اور دوسرا نہ جانے کس کا بچہ تھا۔ عمران، دونوں کا نام میں نے رکھا تھا۔ دونوں کو میں نے جنم دیا تھا اور دونوں کو میرے دل کے ٹکڑوں کو، میرے جسم کے حصوں کو، میری روح کو میرے مالکوں نے بیچ دیا تھا۔ چکلے کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ لڑکی پال کر جسم بیچنے کے لیے تیار کی جاتی ہے، لڑکے بیچ دیے جاتے ہیں۔ جب سے یہ دنیا بنی ہے اس وقت سے بازارحسن سجے ہوئے ہیں اور اس بازار کا یہی دستور ہے۔

پھر اس چکلے میں ہی میں نے جنگ شاہی سے آنے والے سرفراز کو پھنسا لیا تھا۔ میں نے اتنے لوگوں میں رہ رہ کر آہستہ آہستہ بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ اسے مجھ سے محبت ہوگئی تھی۔ مجھے محبت کا کچھ پتا نہیں تھا۔ محبت ایک ناسمجھ میں آنے والا لفظ ہے۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہوں گے جنھیں سچ مچ محبت ہوتی ہوگی میں نے تو صرف ایسے لوگ دیکھے تھے جنھوں نے مجھے نوچا تھا، جس طرح سے مرے ہوئے گدھے کو گدھ نوچتے ہیں۔ اسی طرح سے مجھ زندہ کو ان لوگوں نے نوچا تھا، بھنبھوڑا تھا، اور میرا سودا

کیا تھا، میرے بچوں کو بیچا تھا۔ اوپر والا انصاف کرتا ہوگا مگر وہ انصاف مجھے نہیں ملا ہے ڈاکٹر صاحب!'' تھوڑی دیر کے لیے وہ خاموش ہوگئی تھی۔ اس کا چہرہ اس کے ذہن کی کیفیت بتا رہا تھا۔ نڈھال، بے چین اور خوف زدہ ساتھ میں ایک غصہ تھا اس کے ایک ایک لفظ میں۔

میں نے پھر پانی کا گلاس اسے دیا تھا اور آیا نے اس کے شانے کو آہستہ سے پیار سے دبایا تھا۔ وہ پھر بولنے لگی۔

''پھر ایک صبح جب سب ہی سو رہے تھے میں سرفراز کے ساتھ بھاگ کر جنگ شاہی آگئی تھی۔ مجھے اس سے کسی قسم کی محبت نہیں تھی مگر ایک تعلق تھا اس سے۔ وہ مجھے نہ جانے کیوں بہت چاہتا تھا۔ اسے میرے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا اور نہ میں نے اسے بتایا تھا کہ میرے پہلے سے بچے ہیں۔ وہ شادی شدہ آدمی تھا اور اس کی بیوی اور بچے بھی تھے۔ اس نے مجھے اپنی زمینوں پر ہی ایک گھر میں رکھا تھا اور میری زندگی کے یہی تین سال سکھ چین گزرے تھے۔ یہیں پر میرے یہ دونوں بچے ہوئے تھے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ آہستہ آہستہ میں نے سرفراز کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا تھا اور سوچا تھا کہ اب یہاں پہ ہی زندگی گزار دوں گی، جب جوانی اپنی کشش کھو دے گی، جب میں عورت، ایک گالی، ہوس کا پتلا نہیں رہوں گی تو پھر اپنے بچوں کو تلاش کرلوں گی۔ اورنگی جاکر زمان سے چھینوں گی اپنے بچوں کو، جیکب آباد کے سائیں سے پوچھوں گی کہ کہاں ہے میری بیٹی، نیوکراچی کے نسیم سے پوچھوں گی کہاں ہے میری بیٹی۔ حیدرآباد کے چکلے میں جاکر ڈھونڈوں گی ان رنڈیوں کو اور پوچھوں گی کہ کہاں گئے ہیں میرے بچے۔ مگر سب کچھ ختم ہوگیا۔ ایک شام سرفراز کا ملازم میرے پاس گھبرایا ہوا پہنچا، اس نے بتایا تھا کہ سرفراز کو اس کے سوتیلے بھائی نے گولی مار دی تھی اور وہ لوگ پولیس کچہری سے فارغ ہوکر مجھے بھی مار دیں گے، لہٰذا جتنی جلدی ہوسکتا ہے یہاں سے بھاگ جاؤں۔ کچھ روپے میرے پاس تھے، کچھ روپے اس نے دیے تھے اور مجھے جنگ شاہی کے اسٹیشن پر پہنچا کر کراچی کی گاڑی میں سوار کردیا تھا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ لانڈھی کے اسٹیشن پر اُترنے کے بعد مجھے جاوید بھائی مل گئے۔ انھوں نے میرے لیے جھگی کا بندوبست بھی کیا اور کام کا انتظام بھی کیا تھا۔ ابھی چھ ماہ ہی ہوئے

تھے کہ یہ سب کچھ ہوگیا۔ بڑا عجیب انصاف کیا ہے اوپر والے نے میرے ساتھ۔'' اس کے سوالیہ چہرے کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا۔

میں نے اسے تسلی دی تھی اور کہا تھا کہ وہ بجلی کا علاج جاری رکھے اور جاوید کو میرے پاس بھیج دے، میں کوشش کروں گا کہ کچھ اس کے لیے کرسکوں۔ وہ نہیں آئی تھی۔ جاوید بھی نہیں آیا۔ دن ہفتے اور مہینے گزر گئے تھے اور پھر جاوید نے آکر خبر دی تھی کہ رضیہ مرگئی۔

میں نے اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے جاوید سے پوچھا تھا کہ اس کے بچوں کا کیا کرنا ہے؟

جاوید نے بتایا تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں ہی دونوں بچے ایک ایسے جوڑے کو دے دیے تھے جن کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ ''بڑی ہمت والی عورت تھی، ڈاکٹر صاحب بہت ہمت والی۔'' جاوید نے مجھ سے کہا، ''اپنی زندگی میں اپنے بچے کون دیتا ہے؟''

میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں تو جانتا ہوں ماؤں کو۔ وہ تو ایسا ہی کرتی ہیں، ان کا اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ سب کچھ لٹا دیتی ہیں اپنے بچوں کے اوپر۔ رضیہ نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ میں نے جاوید کو رضیہ کے بقیہ چھ بچوں کے بارے میں نہیں بتایا۔

میں کیا بتاتا کہ کس کس طرح کے عذاب جھیلے ہیں رضیہ نے۔ کس کس طرح سے پامال کیا گیا اسے۔ ارے، وہ تو جب سے پیدا ہوئی ہے صرف دے رہی ہے۔ پہلے ماں دے دی اس نے، اس نظام کو، جہاں حاملہ عورتیں بچے جننے کے دوران مر جاتی ہیں پھر اپنی بہنیں کھو دی اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے، پھر خود ہی بک گئی چند روپوں کے عوض۔ اپنی سوتیلی ماں کے ہاتھوں پھر مرد اسے بیچتا رہا اس کے بچوں کو بیچتا رہا۔ بچہ بنانے کی مشین تھی، عیاشی کا ایک چلتا پھرتا اسٹال تھی وہ۔ لیکن... ہاں لیکن آخر تو ایک عورت تھی اندر سے... بلکتی رہی، سسکتی رہی اپنے بچوں کے لیے۔

کیا دیا تھا ہم لوگوں نے اسے، بچہ دانی کے منھ کا کینسر۔ میرے باس نے مجھے بتایا تھا، ''میری کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ مسلمان اور یہودی عورتوں کو بچہ دانی کے منھ کا کینسر نہیں ہوتا ہے کیوں کہ ان کے شوہر ختنہ کراتے ہیں، کیوں کہ ان کی عورتوں

کے بہت سارے جنسی ساتھی نہیں ہوتے۔ میرا دل کرتا ہے اپنی کتابوں کو آگ لگا دوں۔ اپنے باس کے نوٹس کو پھاڑ کے پھینک دوں۔ انھیں رضیہ دکھا دوں۔ رضیہ کی لاش دکھا دوں۔ ان تمام مردوں کے ساتھ جن کے ختنے ہوئے ہو چکے تھے۔

میں اس رضیہ کی لاش دکھاؤں، جو ایک غیراہم فرد کی غیرضروری موت مر گئی مگر وہ یہ لاش کیسے دیکھیں گے؟ یہ لاش سرطان بن کر پورے معاشرے کے تن بدن میں پھیل چکی ہے، ناسور بن کر سڑ رہی ہے۔ کیا ان سب لوگوں کو اس لاش کے سڑنے کی بدبو نہیں آ رہی؟!

□

سندھ دیس کی دھرتی پر...

محمد بن قاسم اور ذوالفقار بھٹو کی تصویریں ساتھ ساتھ لگائی ہوئی تھیں اُس نے۔ دونوں تصویروں کے نیچے دو خوب صورت لڑکیوں کی تصویریں تھیں، ماتھے پر بندیا، ہونٹوں پر لالی، کانوں میں بالی، آنکھوں میں کاجل، گالوں پر گلال، ناک میں نتھ، جھکی جھکی نظریں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ ہندو لڑکیوں کی تصویریں ہیں۔ ویسی ہی لڑکیاں جو آج کل کی ہندوستانی فلموں میں ہوتی ہیں۔ لگتا تھا کسی نے ان لڑکوں کو ماڈل بنا کر تصویریں بنا ڈالی ہیں۔ میں نے قریب جا کر دیکھا تو اردو میں پتلا پتلا لکھا ہوا تھا، شہید سندھ۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ یہ ایک عجیب قسم کا تکون تھا۔ محمد بن قاسم اور بھٹو، دونوں کا تعلق سندھ سے تو تھا مگر ہر لحاظ سے مختلف تھے وہ لوگ، اور پھر ان کے ساتھ یہ دو ہندو لڑکیوں کی تصویریں؟ میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ اندر سے آ گیا۔ ہاتھ میں ٹرے تھی اور ٹرے میں اسکاچ کی بوتل، دو خوب صورت گلاس اور تازہ تازہ برف کے ٹکڑے شیشے کی طرح چمکتے ہوئے۔ ساتھ میں بادام، پستہ اور چنے کے بھرے ہوئے پیالے۔ بے اختیار مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر آ گئی جسے دیکھ کر وہ بھی ہنس پڑا۔

''خوب جمے گی آج۔ بس اب جانے کی نہ کرنا پیارے۔'' وہ چہکتے ہوئے بولا۔

وہ مجھ کو گرینچ ولیج میں ملا تھا، ایک آئرش پب میں۔ اوکانر نام تھا اس پب کا

اور میں وہیں کام کر رہا تھا اس وقت۔ بعض لوگوں کا ایک عجیب قسم کا رکھ رکھاؤ ہوتا ہے۔ وہ نہ کچھ کہتے ہیں نہ کرتے ہیں مگر چھا جاتے ہیں۔ اس کی شخصیت بھی ایسی تھی۔ بھری بھری، مکمل۔ کچھ نہ کرتے ہوئے بھی اس کی موجودگی کا احساس ہوگیا تھا۔ جب میں نے بڈوائزر کا چوتھا گلاس بنا کر اسے دیا تھا تو اس کے بھرے بھرے ہونٹوں نے سوال کیا تھا، ''پاکستان سے آئے ہو کیا؟'' میں نے اردو میں ہی جواب دیا تھا، ''جی ہاں! کراچی سے آیا ہوں۔''

''پڑھتے ہو یا کمائی میں لگے ہو؟''

''جی پڑھتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا تھا۔ ''یہ کام تو خرچا چلانے کے لیے کر رہا ہوں۔''

''اچھا کرتے ہو یار، اچھا کرتے ہو۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ جاتے وقت دس ڈالر کی ٹپ اور ساتھ میں اپنا کارڈ بھی چھوڑ کر گیا تھا، ''کبھی کوئی کام ہو تو ضرور بتانا۔'' دس ڈالر کی ٹپ ہر کوئی نہیں دیتا ہے، میں نے وہ کارڈ حفاظت سے رکھ لیا تھا۔

پھر ایک دفعہ ملاقات پب میں ہی ہوئی۔ وہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ وہاں آیا تھا۔ دو مرد اور دو عورتیں، چاروں کے چاروں گورے امریکن، وہ بڑی گرم جوشی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے۔ وہ ہر ایک سے بڑے اچھے انداز سے بات کر رہا تھا۔ چھایا ہوا تھا ان پر۔ میں نے بھاگ بھاگ کر ان لوگوں کی خدمت کی۔ بار بار آ کر پوچھا، وہ لوگ بہت خوش ہو کر گئے تھے۔ اس نے دس دس ڈالر کے دو نوٹ میری جیب میں ڈال دیے تھے۔

سمسٹر ختم ہوا اور چھٹیاں ہوئیں تو میں نے پاکستان جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ تقریباً ساری تیاریاں مکمل ہوگئی تھیں اور جانے میں صرف ایک دن ہی باقی تھا کہ مجھے اس کا خیال آیا۔ دراز میں سے کارڈ نکال کر میں نے افضل صاحب کو فون کیا۔ وہ گھر پر ہی مل گئے اور فوراً پہچان بھی گئے تھے۔ میں نے پوچھا کہ میں دو مہینے کے لیے پاکستان جا رہا ہوں اگر ان کو کسی کو کوئی چیز بھیجنی ہو تو میں ضرور لے جاؤں گا۔

وہ تھوڑی دیر سوچتے رہے تھے پھر آواز آئی تھی، ''نہیں یار! اب کون ہے ہمارا

اس جہاں میں۔ سب لٹ گیا وہاں پر اور ہم ہیں اس دیار میں۔'' یہ کہہ کر وہ بڑے زور سے ہنسے تھے۔''ارے بھائی! مزے کرنا۔ برنس روڈ کے کھانے کھانا، کلفٹن کے چکر لگانا، پی آئی ڈی سی کے پان چبانا اور واپس آنا تو فون کرنا ہمیں۔ ملاقات کریں گے آپ سے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر زور سے ہنسے اور فون بند ہوگیا۔

پاکستان میں نواز شریف کی حکومت دوسری دفعہ آگئی تھی، بے نظیر اور آصف زرداری پر مقدمہ چل رہا تھا۔ کراچی کا وہی حال بے حال تھا۔ میں بہت جلد ہی کراچی میں اُکتا گیا۔ نیویارک کی بات ہی کچھ اور تھی۔ پیسے والوں کے لیے بھی سب کچھ تھا اور ہم جیسے غریبوں کے لیے بھی بہت کچھ۔ میں نیویارک میں تھا تو سوچتا تھا کہ کراچی بھی تو نیویارک ہوسکتا ہے۔ یہاں بھی تو سب کو نوکری مل سکتی ہے، یہاں بھی تو ہر بچہ اسکول جاسکتا ہے، یہاں بھی تو ہر ایک کی عزت ہوسکتی ہے، یہاں بھی تو قانون ہر ایک کے لیے ہوسکتا ہے۔ مگر یہ محض میری سوچ تھی۔ کراچی آکر اب میں نے سمجھ لیا تھا کہ کراچی بیروت بن سکتا ہے، کراچی کابل بن سکتا ہے، کراچی نیویارک نہیں بن سکتا ہے، کبھی بھی نہیں...نہ چاہتے ہوئے بھی دل میں کراچی والوں کے لیے نفرت سی پیدا ہوگئی تھی اور ایک دُکھ تھا اس کے پیچھے۔ کون کرتا ہے اپنے شہر سے نفرت، اسی شہر سے جہاں اس نے آنکھیں کھولی ہوں، جہاں بچپن گزارا ہو، جہاں پہلی محبت کے پھول کھلے ہوں، دل ٹوٹا ہو، آنکھیں روئی ہوں۔ لیکن جب اسی شہر میں آگ لگ گئی ہو۔ کلاشنکوف سے سروں میں سوراخ ہو رہے ہوں اور بوریوں میں لاشیں مل رہی ہوں تو پھر نفرت ہی ہوسکتی ہے، صرف نفرت۔

نیویارک واپس آ کر میں پھر انھیں مصروفیات میں اُلجھ گیا تھا۔ بزنس ایڈمنسٹریشن کا آخری سال تھا میرا اور بہت پڑھنا پڑ رہا تھا مجھے۔ ایک اسائمنٹ ختم ہوتی نہیں تھی کہ دوسری اسائنمنٹ مل جاتی۔ گھڑی کی ہر ٹک ٹک کا حساب کرلیا گیا تھا۔ امتحان ہوئے تھے اور گریجویشن کے بعد نوکری کے بازار میں کود پڑا تھا میں۔

ایک دو دفعہ خیال بھی آیا تھا کہ افضل صاحب کو فون کروں مگر پھر بھول گیا تھا۔ مجھے اچھی نوکری مل گئی تھی، ایک ٹیلی فون کمپنی میں۔ کام اچھا تھا اور تنخواہ بھی مناسب۔

ایک جمعے کی شام کو میں اپنے ایک کلاس فیلو کے ساتھ گرینچ ولیج کے اسی پب میں گپ شپ مار رہا تھا کہ افضل صاحب نظر آئے تھے اسی میز پر اور بڈوائزر کے گلاس کے ساتھ۔

میں اُٹھ کر ان سے ملنے گیا تھا اور کہا تھا کہ آج ایک گلاس میری طرف سے ہوجائے کہ اب میں نوکری بھی کررہا ہوں اور آپ کو بھولا بھی نہیں ہوں۔

انھوں نے بھی مجھے پہچان لیا۔ زور سے ہنسے پھر کہا، پہلے تو یہ آپ تاپ کا چکر نہ چلاؤ۔ یہ نیویارک ہے پیارے، سب لوگ ہم اور تم کرتے ہیں۔ ضرور پی لیں گے ایک گلاس تمھاری طرف سے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر زور سے ہنس دیے۔ ''مگر یار! تم ملے نہیں مجھ سے پاکستان سے آنے کے بعد۔ کب واپس آئے، فون بھی نہیں کیا۔''

''جی بہت مصروف ہوگیا تھا میں۔ امتحان میں لگ گیا تھا پھر نوکری کی تلاش، نیویارک کا تو پتا ہی ہے آپ کو۔''

انھوں نے پھر اپنا کارڈ نکال کر دیا تھا، ''ضرور ملنا مجھ سے اگر فرصت ہو تو۔''

ایک دن میں نے انھیں فون کیا تھا۔ وہ گھر پر نہیں تھے ٹیلی فون مشین میں میں نے پیغام چھوڑ دیا تھا۔

دو دن کے بعد جب شام گئے میں کام سے واپس آیا تو ان کا پیغام میری مشین میں موجود تھا۔ وہ لاس اینجلس گئے ہوئے تھے اور اب واپس نیویارک پہنچے تھے۔

میں نے پھر فون کیا تو اس دفعہ ان سے بات ہوگئی تھی۔ بڑے اخلاق اور خوشی سے بات کی تھی انھوں نے۔ پھر ہفتے کی شام کو گرینچ ولیج کے اسی پب میں ملنا طے ہوا تھا۔

شام پانچ بجے سے آٹھ بجے تک وہ بڈوائزر اور میں ہینی کن پیتے ہی رہے۔ دونوں ہی بیئر تھے مگر دونوں کا اپنا الگ الگ مزہ تھا۔ میں زیادہ تر ہینی کن ہی پیتا تھا۔ بیئر کا مسئلہ بھی سگریٹ کی طرح ہے جس کو جو منھ لگ جائے وہ چھٹتی نہیں ہے۔ رات کا کھانا بھی ہم نے ساتھ ہی ایک ویت نامی ریسٹورنٹ میں کھایا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ چل کر نہاری، تکا یا کڑاہی کھائی جائے مگر قریب میں جو پاکستانی ریسٹورنٹ تھا، ان کے پاس شراب پینے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک ہندوستانی ریسٹورنٹ تھا جہاں شراب ملتی

تھی مگر ہم دونوں کی پاکستانیت آڑے آگئی تھی۔ یہی طے ہوا تھا کہ ویت نامی کھانے کے ساتھ جام چھلکائے جائیں۔

زبردست ویت نامی کھانا کھایا تھا ہم لوگوں نے۔ سوپ سے لے کر جھینگے اور بانس کے پھول سے لے کر بطخ تک ہر چیز نفیس اور مزے دار تھی۔ ساتھ میں میکسیکو کا مشہور وائن مریا ماریا۔ کھانے کا مزہ آ گیا تھا۔ بہت دنوں بعد سیر ہو کر کھایا اور مزے لے کر شراب پی تھی میں نے۔

وہ دلچسپ آدمی تھے۔ میرا دل چاہتا تھا وہ بولتے رہیں اور میں سنتا رہوں۔ دنیا بھر کی باتیں کی تھیں انھوں نے۔ امریکا کی سیاست میں عیسائیوں کا کتنا اثر تھا، یہودی کیا کر رہے تھے، امریکن فٹ بال میں کون سا شہر جیت رہا ہے، آئندہ امریکن الیکشن میں کوئی جیتے گا، یورپ امریکا سے کیوں ناراض ہے، برطانیہ کیوں امریکا کے ساتھ ہے، لیڈی ڈیانا طلاق کے بعد کیا کرے گی چین سپر طاقت کب بنے گا، بیس بال میں کیا ہو رہا ہے، ہالی وڈ کی کون سی فلم نے کتنا کمایا ہے، مادھوری ڈکشٹ کی شادی کیوں نہیں ہو رہی اور عمران خان نے کس کس سے معاشقہ چلایا تھا اور جاوید میاں داد کیوں بہت بڑا کھلاڑی ہے؟ وہ سرور میں بولتے رہے تھے۔ میں سرور میں سنتا رہا تھا۔ ان سے دوستی پکی ہوگئی تھی آپ سے تم ہوتے ہوتے زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

افضل کا ٹرانسپورٹ کا کاروبار تھا آہستہ آہستہ نیویارک سے پھیل کر دوسرے شہروں تک چلاگیا تھا۔ جب وہ نیویارک پہنچا تو دمڑی نہیں تھی اس کے پاس۔ سیاسی پناہ کی درخواست آسانی سے قبول ہوگئی اور ایک ٹیکسی کی کمپنی میں نوکری بھی مل گئی تھی۔ جس کے بعد وہ ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں چلاگیا تھا۔ شروع شروع میں تو بیس بیس اور بائیس بائیس گھنٹے کام کرتا رہا اور چھٹی کا نام تک نہیں لیا تھا۔ وہیں اس کی ملاقات جاش سے ہوئی تھی جو وہاں اکاؤنٹینٹ تھا۔ اس یہودی کی دوستی اسے خوب راس آئی تھی۔ بچت کیے ہوئے ڈالروں اور جاش کے مشوروں سے اس نے نیویارک مارکیٹ میں پیسے لگانا شروع کیے تھے اور تھوڑا سرمایہ کما لیا تھا کہ کمپنی والوں نے اسے پارٹنر بنا لیا۔ کمپنی تیزی سے پھیلتی گئی اور پھیل رہی تھی اور زندگی اب خوب گزر رہی تھی۔

وہ نیویارک کے ایک مہنگے علاقے میں ایک کنڈومونیم میں رہتا تھا۔ شادی

نہیں کی تھی۔ شروع شروع میں کام کی وجہ سے لڑکیوں اور عورتوں کی طرف توجہ نہیں دی تھی، ''بعد میں کئی عورتیں زندگی میں آئیں اور آ کر چلی گئیں، جو بیوی بننے کے قابل تھیں انھوں نے بیوی بننے سے انکار کر دیا۔ جو بیوی بننا چاہتی تھیں ان کا شوہر میں بن نہیں سکتا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا تھا۔ ''زندگی گزر جائے گی یار۔ یہاں بڈھوں کو جوان اولادوں کی ضرورت نہیں ہے۔ انشورنس ہے تو بھی عزت سے ہی موت ہوگی اور انشورنس نہیں ہے تب بھی عزت سے ہی موت ہوگی۔ پھر اپنی مرضی کے بغیر کوئی کیوں کسی کی غلامی کرے۔ مرضی جب تھی تو کوئی ملا نہیں اور جب ایسا نہیں ملا جس کی غلامی کا شوق ہو تو ایسوں کی غلامی کیا کرنا؟''

بات شاید صحیح تھی لیکن مزید اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

پھر ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں۔ افضل کے کہنے سے میں نے ایک کمپیوٹر کمپنی میں نوکری پکڑ لی جہاں ترقی کے زبردست مواقع تھے۔ کمپنی میں پہلی ترقی کے فوراً بعد میں نے افضل کی دعوت کی تھی۔ میں نیویارک اور نیوجرسی کے سرحد پر رہتا تھا۔ چھوٹا سا گھر تھا میرا، وہیں میں نے افضل کو بلایا تھا۔ پاکستانی کھانے بنائے تھے۔ بڈوائزر کا مناسب انتظام تھا اور کھانے کے ساتھ سرخ اور سفید وائن۔ افضل کا شکریہ اسی طرح سے ادا ہو سکتا تھا۔

باتوں باتوں میں افضل نے بتایا تھا کہ بھٹو صاحب کی موت کے بعد بڑی کٹھن زندگی گزاری تھی اس نے۔ کالج کے زمانے سے ہی وہ پیپلز پارٹی میں تھا۔

''بڑی محنت کی تھی ہم لوگوں نے پیپلز پارٹی کے لیے۔ اس زمانے میں، میں کراچی یونی ورسٹی میں تھا اور کراچی میں کفر و اسلام کی جنگ ہو رہی تھی۔ جماعت اسلامی اور جمعیت والوں نے سارے شہر پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ جیکب لائنز کے مولوی احتشام الحق تھانوی نے تین سو تیرہ مولویوں کے دستخط سے پیپلز پارٹی کے خلاف کفر کا فتویٰ لکھ دیا تھا۔ سوشلزم کی بات کرنے والے بھٹو بھاشانی ولی خان کے ساتھی کافر ہیں۔ یہ فتویٰ لگایا گیا تھا اس وقت کے پاکستان میں ان لوگوں پر جو تبدیلی چاہتے تھے جو عوام کے لیے روٹی، کپڑا، مکان مانگ رہے تھے۔ ہم لوگ تو بھٹو صاحب کے دیوانے تھے۔ ایک خواب دکھایا تھا اس نے۔ آرمی والوں سے نجات کا خواب،

سرمایہ داروں، جاگیرداروں سے نجات کا خواب، میروں پیروں سے آزادی کا خواب، ایک ایسے وطن کا خواب جہاں بہنوں کے سروں سے چادریں نہیں کھینچی جائیں گی، جہاں مائیں رو رو کر بیٹوں کا انتظار نہیں کریں گی، جہاں بچے بھکاری نہیں ہوں گے۔ ہم لوگ خود چندہ جمع کرتے تھے، بینر لگاتے تھے، پوسٹر چھاپتے تھے، راتوں کو دیواروں پر نعرے لکھتے تھے۔ بھٹو ساڈا شیر ہے، یا مانگ رہا ہے ہر انسان، روٹی، کپڑا اور مکان۔ پھر الیکشن بھی ہوئے۔ بھٹو صاحب اور مجیب صاحب الیکشن جیت گئے مگر پھر پاکستان پاکستان نہ رہا۔ مغربی پاکستان ، پاکستان اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ یہ سب کچھ بہت تیزی سے یکایک ہوگیا تھا۔ یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگیا تھا جیسے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ شدید کرب تھا اس کے چہرے پر۔ ویران آنکھیں ایسی ہوتی ہوں گی۔ میں نے سوچا تھا۔

''ضیاء الحق کا زمانہ تو بہت ہی خراب تھا۔'' وہ رک رک کر بولا۔ ''سندھ پر تو جیسے عذاب آگیا تھا۔ سندھ کے گاؤں اُجڑ گئے۔ جو علاقہ بھی تھا وہ لاڑکانے کے قبرستان کی طرح ہوگیا تھا۔ نہ جانے کتنے جیلوں میں گئے اور نہ جانے کتنے غائب ہوگئے۔ تاریک راہوں میں مارے گئے اور بھٹو صاحب کے دوستوں نے فوجیوں کے ساتھ عشق و عاشقی کا بازار گرم رکھا۔ ہمارے جیسے لوگوں سے جیل بھرتے چلے گئے۔ سکھر جیل سے مچھ جیل تک۔ میں آج بھی راتوں کو خراب خواب دیکھتے دیکھتے چونک پڑتا ہوں اور جیل کی دیواریں، پیٹھ پر پڑتے ہوئے ہنٹر، لوہے کی بیڑیاں، سگریٹ سے داغے ہوئے جسم۔ پاکستان کی جیلوں نے میرے اندر کے آدمی کو مار دیا تھا۔ میں بھی وحشی ہوگیا تھا، وحشی۔ جیل تو یہی کرتا ہے اندر سے توڑ دیتا ہے، اپنی ہی عزت کو اپنی ہی نظروں میں ختم کر دیتا ہے۔ یہی سب کچھ ہوا تھا میرے ساتھ۔ میرے اندر کا انسان اتنی ذاتی بے عزتی برداشت نہیں کر سکا تھا۔ حیوان سا بن گیا تھا میں۔

جیل سے نکل کر میں گھر والوں سے نہیں ملنے گیا۔ کیا شکل لے کر جاتا ان کے پاس؟ سگریٹ سے جلے ہوئے ہونٹ، اکھڑے ہوئے ناخن، ہنٹروں کے نشان۔ ماں باپ زندہ ہوتے اور دیکھتے تو بے ہوش ہوجاتے۔ ایک بھائی اور ایک بہن کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ کہتے ہیں سیاسی قیدی آزاد ہوتا ہے تو بڑا مغرور ہوتا

ہے مگر مجھے نہ جانے کیا ہوگیا تھا۔ کسی بات پر شرمندگی نہیں تھی مگر ہمت بھی نہیں تھی، اتنی بھی نہیں کہ ماں باپ کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھ لیتا، کیا سوچتے وہ لوگ، کیا بنانا چاہتے تھے مجھے، کیا بن گیا تھا میں؟ پیپلزپارٹی کے کسی بڑے لیڈر نے مدد نہیں کی میری۔ ہم چار دوستوں نے نہ جانے کس طرح سرحد پار کر کے افغانستان میں پناہ لی۔ پھر ایران، ترکی سے ہوتے ہوئے جرمنی پہنچے تھے۔ جرمنی میں سیاسی پناہ ملی تھی، تو پھر میں امریکا آگیا تھا۔ گھر والوں سے بات کرنے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں۔ ویسے بھی گھر میں کون تھا میرا۔ والد بچپن میں ہی مر گئے تھے، ایک ماں تھی جو بہت دنوں تک جیلوں کے چکر کاٹتی رہی تھی۔ میں جیل میں ہی تھا جب ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ گھر پر کسی رشتہ دار نے قبضہ کر لیا ہوگا اور میں سننے کی ہمت نہیں رکھتا تھا کہ کس طرح سے میری ماں مجھے یاد کر کے مر گئی۔ ایک بار جب وطن چھوٹ گیا، جب ہمارا لیڈر ہی مر گیا تو پھر ہر ملک میرا ملک ہے اور ہر وطن میرا وطن۔ سوچتا تھا کہ جب ضیا مرے گا تو پاکستان چلا جاؤں گا۔ اپنا وطن پھر اپنا ہی وطن ہے، میں سمجھا تو یہی تھا...

مگر اپنا وطن اپنا وطن نہیں تھا۔ یہ فوجیوں کا وطن تھا۔ یہ ان بڑے لوگوں کا وطن تھا جو صرف لوٹتے ہیں، ان وڈیروں اور جاگیرداروں کا وطن تھا جن کے سینے میں دل نہیں ہے، سونے کا ایک ٹکڑا ہے۔ خون بیچ کر خریدا ہوا ہیرا ہے جو سانپ کی کنڈلی کی طرح ہر ایک کو ڈس رہا ہے۔ صرف اُمید تھی بھٹو کی بیٹی سے کہ وہ ایک دن آئے گی اور وہ روٹی کپڑا مکان کا وعدہ پورا کرے گی۔ اپنے باپ کے اس خواب کو ہر اس آدمی تک پہنچائی گی جس کے لیے اس شہید نے جان دے دی۔ جس نے سر نہیں جھکایا۔ ضیاء الحق سے معافی نہیں مانگی۔ اس ملک کے غریب مزدور ہاری کسان کے لیے اپنی جان دے دی۔ مگر اس دفعہ بھی خواب جھوٹا نکلا تھا۔ وہ آئی ضرور تھی مگر مصلحتوں کی بہت بڑی بوری لے کر۔ اپنے شہید باپ کے خون کا سودا کرنے کے لیے۔ اپنی بولی لگا کر، اپنا پیٹ بھرنے کے لیے...''

وہ رک گیا تھا پھر بولا، ''جانے دو یار، ان سب باتوں میں کیا رکھا ہے؟ تم خوش ہو، میں خوش ہوں، امریکا میں ہیں ہم لوگ اور مزے سے ہیں۔ اس وقت تو یہی ضروری بات ہے اور غم کیا ہے پیارے۔ دُنیا تو چلتی رہے گی۔''

مزید بات نہیں ہوئی اس موضوع پر اور ہم لوگ دوسری باتوں میں اُلجھ گئے تھے۔

افضل سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ اندر سے بہت خوب صورت آدمی تھا۔ دوسروں کا مددگار، ہمیشہ اپنے آپ میں مست رہنے والا آدمی۔ ہم دونوں کافی ملتے جلتے رہے تھے ایک دوسرے سے اور وہ میرے کام بھی آتا رہا تھا، جب بھی ممکن ہوا اس کے لیے۔ ہماری جان پہچان گہری دوستی میں بدلتی جارہی تھی۔

اس دن اس نے مجھے اپنے گھر بلایا تھا۔ بڑے سے خوب صورت کنڈومونیم میں آسائش کی ہر چیز تھی اور اس خوب صورت کمرے میں یہ چار تصویریں لگی ہوئی تھیں۔

کھانے پینے کے ساتھ شراب کا بھی دور چلتا رہا تھا۔ اور نہ جانے کیا بات ہوئی تھی کہ میں پوچھ بیٹھا کہ ''قائد عوام کی تصویر تو ٹھیک ہے مگر یہ محمد بن قاسم اور ساتھ میں ہندوستانی فلموں کی یہ دولڑکیوں کی تصویروں کا کیا مطلب ہے؟ ساتھ میں قائدعوام کی بیٹی کی تصویر کیوں نہیں لگائی آپ نے؟''

وہ ہنسا تھا، بڑی ترش سی ہنسی تھی، بڑی زہر بھری ہوئی۔ ''ارے، یہ تو شہید سندھ ہیں،سندھ کے شہید تم نہیں جانتے انھیں۔ یہ محمد بن قاسم ہے جس نے سندھ کی دھرتی پر آکر غلاموں کو آزادی دلائی تھی اور ہندو بنیوں کو بتایا کہ انصاف کیا ہوتا ہے؟ اسلام کی راہ دکھائی تھی انھیں۔ وہ لوگ اس کی پوجا کرنے لگے تھے۔ کہتے ہیں اس کی شکل کے بت بنا کر رکھ لیے تھے سندھ والوں نے۔ بھگوان کی مورت بنا دیا تھا اسے۔ وہ سندھ میں انصاف لے کر آیا تھا مگر اس کو قتل کر دیا گیا۔ اسے بھی شہید کر دیا گیا۔ یہی طور ہے، یہی طریقہ ہے کہ جو انصاف کی بات کرتا ہے، قتل ہوجاتا ہے۔ یہی تاریخ کے صفحوں پر جلی حروف سے لکھا ہوا ہے۔ تمھیں پتا ہے ناں کہ اس غازی کا قتل کیسے ہوا تھا؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا تھا۔

''نہیں، مجھے نہیں پتا ہے۔'' میں نے جواب دیا، کیوں کہ مجھے تو نہیں پتا تھا کہ غازی محمد بن قاسم کو شہید کیا گیا تھا۔ مجھے تو اسکول میں جو تاریخ پڑھائی گئی تھی اس میں تو یہی بتایا گیا تھا کہ سندھ کے فاتح نے سندھ میں امن و انصاف کا بول بالا کر دیا تھا۔ کیا حجاج بن یوسف کے سترہ سالہ داماد نے ہند کے سندھ میں جہاں تاریکی تھی

وہاں روشنی پھیلا دی تھی، اسے قتل کیا گیا تھا؟ میرے لیے تو یہ خبر ہے۔ میں نے شدید حیرت کا اظہار کیا۔

''میں تمھیں بتاتا ہوں، تھوڑی بہت تاریخ میں نے بھی پڑھی ہے۔ یہ جو دو تصویریں ہیں دو لڑکیوں کی، یہ ہندوستانی فلموں کی ہیروئنیں نہیں ہیں۔ یہ میں نے ایک دوست سے بنوائی ہے۔ یہ راجا داہر کی بیٹیوں کی تصویریں ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا تھا۔

میرا ذہن جو شراب کے سرور میں تھا یکایک سخت قسم کی متضاد کیفیتوں کا شکار ہو کر رہ گیا۔ کہاں اس کے قائد عوام کی تصویر، کہاں محمد بن قاسم کی شہادت اور پھر راجا داہر کی بیٹیوں کی تصویریں!؟ میں بڑے غور سے اس کی بات سننے کو تیار ہو گیا تھا۔

اس نے بڈوائزر کا ایک بڑا گھونٹ لیا اور بڑے ہی دھیمے لہجے میں انگلی اُٹھا کر کہنا شروع کیا، ''یو نو (You know) جب راجا داہر مارا گیا تو اس کی یہ دونوں بیٹیاں محمد بن قاسم کے قبضے میں آ گئی تھیں اور محمد بن قاسم نے مال غنیمت اور دوسرے قیدیوں کے ساتھ ان دونوں کو بھی بغداد میں خلیفہ کے دربار میں بھیج دیا تھا۔ بغداد کے خلیفے کے دربار میں ان دونوں لڑکیوں نے، راجا داہر کی بیٹیوں نے ٹھٹھول کیا اور خلیفہ سے ہنس کر کہا کہ ہمیں نہیں پتا تھا کہ مسلمان فوجی اپنے خلیفہ سے پہلے اپنا حصہ لے لیتے ہیں۔ ہم دونوں کو تمھارے سپاہی محمد بن قاسم نے لوٹ کر بھیجا ہے۔ یہ کہہ کر دونوں ہی رو دی تھیں۔ یہ کوئی معمولی جرم نہیں تھا۔ خلیفہ کی امانت میں خیانت کرنے کی کسی کو بھی اجازت نہیں تھی۔ یہ بڑا جرم تھا، بہت بڑا جرم۔ اس کی سزا کے طور پر خلیفہ کے حکم سے محمد بن قاسم کی گردن اُڑا دی گئی اور خلیفہ نے راجا داہر کی بیٹیوں کے سامنے لاش رکھ کر کہا تھا کہ مال غنیمت اور خلیفہ کی امانت میں کوئی بھی خیانت کرے اس کی جان لے لی جاتی ہے، چاہے وہ محمد بن قاسم ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ہے خلیفۂ بغداد کا انصاف۔

یہ کہہ کر افضل نے ایک اور بڑا گھونٹ بھرا پھر مسکرا کر کہا، ''پھر دونوں لڑکیوں نے خلیفہ سے کہا تھا کہ ہم نے اپنے باپ کا بدلہ لے لیا اور بے قصور محمد بن قاسم کو سزائے موت دلا دی۔ ہم نے تو بدلہ لینے کے لیے جھوٹ کہا تھا۔ اپنے باپ کا

بدلہ، سندھ کے حکمران راجا داہر کا بدلہ جس کا تختہ اس نے اُلٹا تھا جس کی حکومت کو تاراج کیا تھا۔ کہتے ہیں یہ کہہ کر وہ لڑکیاں دل بھر کے ہنسی تھیں۔"

خلیفہ کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ راجا داہر کی ان دونوں بیٹیوں کی بھی جان لے لے۔ اسی وقت دونوں کے سرتن سے جدا کر دیے گئے تھے۔

ان دونوں بیٹیوں کی تصویر لگائی ہے میں نے قائدعوام کے ساتھ۔ شہید سندھ ہیں یہ لوگ۔ وہ بھی جس نے سندھ کے عوام کو فتح کیا۔ وہ دونوں بھی جنھوں نے سندھ کے حکمران، اپنے باپ کے لیے جان دے دی۔ سمجھوتا نہیں کیا، جرنیلوں سے۔ اور وہ بھی جو عوام کے لیے پھانسی پر لٹک گیا اور اس شہید عوام کے نیچے اس کی تصویر تو نہیں لگ سکتی ہے ناں جس نے باپ کے خون کا، پورے ملک کے عوام کا، میرا اور تمھارا سودا کیا ہے، انھیں جرنیلوں سے جو خلیفۂ بغداد کا تسلسل ہیں۔ تم ہی بتاؤ کہ کون ہے شہید سندھ؟"

اس کی آنکھوں کی نفرت اور لبوں کی ترشی ایک شریر مسکراہٹ میں بدل کر اس کے چہرے پر رقص کر رہی تھی... ہوش مندی میں دیوانگی کا رقص۔

❑

کفارہ

لڑکوں نے اُسے مار مار کر ادھ مرا کر دیا تھا اور وہ دھڑام سے زمین پر گر گیا۔

''حرام زادے قائداعظم کو گالی دیتا ہے!'' میں نے اسے پہلی دفعہ قائداعظم کے مزار کے سامنے بری طرح سے پٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں بندر روڈ سے مڑ کر آغا خان ہسپتال جا رہا تھا کہ میری نظر ان لوگوں پر پڑی تھی۔ میں جلدی میں تھا مگر بے ساختہ گاڑی روک کر اتر پڑا۔ اس بے دردی سے میں نے کبھی بھی کسی کو پٹتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ میرے پہنچتے پہنچتے وہ زمین پر گر چکا تھا۔ میرے پوچھنے سے قبل ہی ان میں سے ایک لڑکے نے کہا تھا، ''ارے صاحب! بڑا بدتمیز آدمی ہے، مزار پر پتھر پھینک رہا تھا اور گندی گندی گالیاں دے رہا تھا، ایسے حرام زادے کا یہی علاج ہے۔'' دو ایک راہ گیر اور رُک گئے تھے۔ مارنے والے لڑکے آہستہ آہستہ ادھر اُدھر ہو رہے تھے۔

میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ جھومتا ہوا اٹھا تھا اور کھڑے ہو کر اس نے مجھے بہت غور سے دیکھا تھا۔ ''چشم ملی چشم الدین تو بھی مارے گا، لے مار۔'' یہ کہہ وہ زور سے ہنسا تھا اور لے مار، لے مار کہتا ہوا خداداد کالونی کی طرف دوڑ پڑا تھا۔

یہ میری اس سے پہلی ملاقات تھی۔ دُبلا پتلا آدمی تھا وہ۔ گھٹے ہوئے قد کے ساتھ چہرے پر چگی داڑھی تھی اور گھنے بال۔ پاجامہ قمیص میں ملبوس تھا وہ، مگر چہرے پر ایک عجیب قسم کی وحشت تھی۔ مجھے آغا خان ہسپتال پہنچنے کی جلدی تھی جہاں میرے ایک

دوست کے دل کا آپریشن ہوا تھا۔ پچھلے ہفتے اس پر دل کا دورہ پڑا تھا اور ہسپتال میں فوراً داخل کرلیا گیا تھا۔ دنیا جہان کے ٹیسٹ ہوئے اور تین چار دنوں میں ہی فیصلہ کرلیا گیا تھا کہ بائی پاس آپریشن ہونا ہے۔ تین لاکھ کے قریب خرچ ہوئے تھے اور اب وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ مجھے ہر صورت میں اس سے ملنا تھا، لہٰذا اس آدمی کو مزید کچھ وقت دیے بغیر میں آغا خان ہسپتال کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔

دوسری دفعہ وہ مجھے حسن اسکوائر کی چورنگی پر نظر آیا تھا۔ حسن اسکوائر پر چاروں طرف سے آنے والی گاڑیوں کا اژدہام تھا۔ سگنل خراب تھے اور ٹریفک کو کنٹرول کرنے والا کوئی سپاہی نہیں تھا۔ ہر گاڑی والے نے اپنی گاڑی چوراہے میں ڈالی ہوئی تھی۔ میں بھی گاڑیوں کے سمندر میں پھنسا ہوا تھا کہ یکایک میری نظر اس پر پڑی تھی۔ وہ کرتا شلوار میں ملبوس تھا اور چوراہے کے بیچ میں، جہاں ٹریفک کانسٹبل کھڑا ہوتا ہے، اس کی جگہ کھڑا ہوا آتی جاتی ٹریفک کو کنٹرول کررہا تھا۔ اس میں ایک سیمابی کیفیت تھی۔ وہ ٹریفک سے بے نیاز تھا اور ٹریفک اس سے بے خبر تھی۔ چہرے پر وہی وحشت تھی اور وہ تیزی سے ہاتھ اوپر نیچے آگے پیچھے کرکے ٹریفک کو اشارے دے رہا تھا۔ میں جب تک دُھویں دُھول اور گاڑیوں کے شور کے درمیان کھڑا رہا اسے دیکھتا رہا تھا۔ مجھے لگا تھا شاید وہ بھی مجھے دیکھے گا اور کہے گا چشم ملی چشم الدین۔ مگر یکایک مجھے راستہ مل گیا اور میں اپنی گاڑی نکال لے گیا تھا۔

وہ مجھے پھر گرومندر کے چوراہے سے تھوڑا آگے نظر آیا تھا۔ حلیہ تو اس کا کم و بیش وہی تھا مگر اس کے چہرے پر کالے رنگ کا ایک چشمہ بھی تھا۔ وہ سگنل سے نیچے روڈ پر کھڑا تھا، شور سے لاپروا بے آشنا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا اور چہرے پر نگاہ جمانے کی کوشش کررہا تھا مگر اس گھومتے ہوئے چہرے پر سوائے وحشت کے کچھ بھی نہیں تھا۔ وحشت یا دیوانگی!؟ میں اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا۔

وہ ایک دن پھر نظر آیا تھا، نشاط سینما کے ساتھ فٹ پاتھ پر بے خبر سو رہا تھا۔ مجھے نیشنل بینک میں کوئی کام تھا۔ جب میں کام نپٹا کر واپس آیا تو بھی وہ اسی طرح سے اسی کروٹ بے خبری کی نیند کا مزہ لوٹ رہا تھا جیسے بے انتہا تھکا ہوا ہو۔ وہ کرتے پاجامے میں ملبوس تھا اور ایک پرانا سا سوئٹر پہنا ہوا تھا۔ مجھے اس پر رحم بھی آیا تھا اور

پیار بھی۔ گہری نیند کی وجہ سے چہرے پر چھائی ہوئی وحشت غائب تھی۔ مجھے لگا جیسے کسی جگہ یہ مسلسل ڈانس کرنے کے بعد تھک گیا ہو اور اب اس جگہ پر گر کر سو گیا ہے۔ میں سوچتا رہا کہ انسان کا دماغ بھی کتنا پیچیدہ ہے بہ ظاہر ٹھیک ٹھاک نظر آنے والے انسان کی ایسی کیا مجبوری ہے؟ نہ جانے اس پر کیا بیتی ہے، یہ کس کا بیٹا ہے، کس کا شوہر ہے؟ میں سوچتا ہوا اپنی گاڑی میں بیٹھ کر نکل گیا تھا۔

پھر وہ نظر آیا تھا، بریٹو روڈ اور سولجر بازار روڈ کے چوراہے پر۔ سولجر مارکیٹ کی طرف سے آنے والے روڈ کی طرف ایک بوڑھا آدمی اسے پکڑ کر کھڑا ہوا تھا اور ان دونوں میں کسی بات پر تکرار ہو رہی تھی۔ میں فوراً ہی گاڑی سے اتر کر ان کے پاس پہنچا تھا۔

''کیا بات ہے بابا، کیا مسئلہ ہے، کیوں تنگ کر رہے ہو اسے؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''تنگ نہیں کر رہے ہیں، انھیں گھر لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آج آٹھ دن ہوگئے ہیں یہ گھر سے غائب ہیں۔'' بوڑھے نے جواب دیا تھا۔

''آپ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟'' میں نے پھر پوچھا تھا۔

''میں اس کا باپ ہوں بیٹے، اورنگی لے کے جانا ہے۔'' بوڑھے نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے جواب دیا تھا۔

چلیے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔'' نہ جانے کیوں میں نے ہامی بھرلی تھی۔

''نہیں بیٹے! اورنگی بہت دُور ہے، ہم کسی منی بس میں چلے جائیں گے۔''

لیکن میں نے زور دے کر دونوں باپ بیٹے کو گاڑی میں بٹھالیا تھا۔ میں ویسے بھی ناظم آباد جارہا تھا۔ تھوڑا سا آگے اور جانا پڑتا مگر نہ جانے کیوں میں چاہ رہا تھا کہ اس آدمی کے تھوڑا سا کام آؤں۔ وہ دونوں میری گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اس نے مجھے چشم ملی چشم الدین کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

''تو آپ آٹھ دن سے انھیں تلاش کر رہے ہیں۔'' میں نے گاڑی چلاتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ہاں اس دفعہ تو آٹھ دن ہوگئے ہیں۔ یہ تو گھر سے نکلتا ہے اور غائب

ہوجاتا ہے پھر میں ہی ہوں گھر میں، جو کام کر کے اس کی تلاش میں سارے شہر میں بھٹکتا رہتا ہوں کبھی دو دن کبھی پانچ دن اور کبھی دس دن۔ کوشش تو بہت کرتے ہیں کہ اسے گھر میں باندھ کر رکھیں مگر کسی نہ کسی طرح سے یہ نکل ہی جاتے ہیں۔'' بوڑھے نے بڑے پیار سے کہا۔

تھوڑی دیر خاموشی کے بعد بوڑھا پھر بولا، ''بس بیٹے! ہماری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ اس کی بیوی کے گناہ کی سزا سارے خاندان کو مل رہی ہے۔ یہ اچھا خاصا تھا، کام کرتا تھا۔ روز کے چالیس پچاس روپے کماتا تھا۔ میں بھی کچھ کر لیتا تھا۔ گھر تھا ہمارا اس کے بچے، اس کی بیوی، اس کی ماں، اس کی بہنیں مگر جب سے اس کی بیوی مری ہے ہمارا تو سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔ یہ تو بالکل ہی پاگل ہوگیا ہے۔ اب تو پھر بھی بہتر ہے، پہلے تو لوگوں کو مارتا تھا۔ اب اپنے آپ میں ہی لگا رہتا ہے، کبھی سڑکوں پر ٹریفک کا سپاہی بن جاتا ہے، کبھی چوراہوں پر ناچنا شروع کردیتا ہے۔ اب تو اللہ ہی کچھ کرے گا۔ میں تو بالکل ہی تھک گیا ہوں، نہ جانے میرے بعد کیا ہوگا؟''

یہ کہہ کر بڑے میاں خاموش ہوگئے تھے۔ ''بیوی کیسے مرگئی تھی، کیا ایکسیڈنٹ ہوا تھا؟'' میں نے سوال کیا تھا۔

''نہیں بیٹے! ایکسیڈنٹ بھی ہوجاتا تو صبر کر لیتے۔ اظہر میاں کی بیوی نے چھلا ڈلوا کر اپنا حمل ضائع کرایا تھا۔ پھر اللہ میاں سے سزا تو ملنی تھی۔ حالاں کہ اچھی خاصی بیوی تھی اس کی۔ پڑھا لکھا تو ہمارے یہاں کوئی نہیں ہے لیکن وہ بہت سمجھ دار تھی۔ میرے بھائی کی بیٹی تھی۔ بڑی گھر گرہستی والی، بڑا مشکل وقت دیکھا تھا اس نے ہمارے ساتھ۔ کبھی شکایت نہیں کی تھی۔ ہماری جھگی کو بھی جنت بنا کر رکھا ہوا تھا۔ پر نہ جانے کیوں حمل گروانے کا گناہ کر بیٹھی تھی۔ اللہ معاف نہیں کرتا ہے ایسے گناہ کو۔ پھر تو سب کو سزا بھگتنی تھی۔ سو ہم بھگت رہے ہیں مگر اب سزا کی انتہا ہوگئی ہے۔'' بڑے میاں روہانسے ہوگئے تھے۔ ''نہ جانے کب تک اس کے کیے کی ہم لوگ بھریں گے؟''

''اورنگی میں کہاں رہتے ہیں آپ لوگ؟'' میں نے بات بدلنے کے لیے پوچھ لیا۔ ''اورنگی ڈھائی نمبر میں جانا ہوگا بیٹے۔ وہ بہت دُور ہے، آخر میں ہے بالکل۔ ہمیں تو آپ یہاں ہی اتار دو، ہم چلے جائیں گے۔ ویسے ہی آپ کی بڑی مہربانی ہے۔''

''نہیں نہیں، میں چھوڑ دوں گا۔ کب سے رہ رہے ہیں یہاں آپ لوگ؟''
میں نے پھر سوال کیا تھا۔

''مشرقی پاکستان سے یہاں آگئے تھے، بنگلہ دیش بننے کے بعد۔ ساری اورنگی ایسے ہی بنی ہے۔ آہستہ آہستہ لوگ آتے گئے، جھگیاں پڑتی گئیں، آبادی بڑھتی گئی۔ ہم بھی ایسے ہی آگئے تھے۔ زندگی سفر میں ہی گزر گئی ہے۔ اچھے خاصے بہار میں رہتے تھے کہ پاکستان کا نعرہ چل پڑا۔ ابھی پاکستان بنا بھی نہیں تھا کہ میرے والد کو ہندوؤں نے مار دیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد تو وہاں رہنا ہی نہیں تھا۔ کلکتے کے راستے میں اپنی ماں، چھوٹے بھائی اور بہن کو لے کر مشرقی پاکستان آگیا تھا۔ ڈھاکے میں مجھے اچھا کام مل گیا تھا۔ تھوڑے دنوں میں نے پھلوں کے کام کو سیکھا تھا، سمجھا تھا، پھر اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ کام چل نکلا تھا اور ہم دونوں بھائیوں نے جلد ہی اپنے اپنے مکان بھی بنا لیے تھے۔ ہندوستان میں تو شاید ہم کچھ بھی نہ کرپاتے۔ میری پھوپھی اور ان کے بچے گیا سے ۶۵ء کی جنگ سے پہلے ملنے آتے تھے اور مجھے یاد ہے کہ میری ماں سے انھوں نے کہا تھا کہ ہندوستان میں بڑی غربت ہے اور مسلمانوں کا تو برا ہی حال ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ پاکستان آکر ہم لوگوں نے اچھا ہی کیا تھا۔''

میں اورنگی کے حدود میں داخل ہوچکا تھا۔ میں نے کہا، ''آپ سناتے رہیں، جب ڈھائی نمبر پہنچیں گے تو آپ سے پتا پوچھ لوں گا۔'' ان کا بیٹا ان کے کاندھے پر سر رکھ کر گہری نیند سو رہا تھا۔

''مگر نہ جانے ۶۵ء کی جنگ کے بعد کیا ہوا تھا کہ نفرت کی آگ بھڑک اُٹھی تھی اور اس میں سب کا ہی قصور تھا۔ کچھ بنگالیوں کا، کچھ بہاریوں کا اور کچھ پنجابیوں کا اور کچھ وقت کا۔ ۷۱ء کی جنگ صرف بربادی لائی تھی، صرف بربادی۔ میرے چھوٹے بھائی کا پورا خاندان مکتی باہنی کے ہاتھوں مارا گیا تھا صرف ایک بچی رہ گئی تھی جو اس وقت ہمارے گھر میں تھی۔ میں پھر اپنی بیوی، ماں اپنی دو بچیوں، اپنے اس بیٹے اور اپنی بھتیجی کے ساتھ لٹا پٹا کراچی پہنچا تھا۔ جو کچھ پیسے تھے وہ پاکستان آنے کے سفر میں خرچ ہوگئے تھے۔ واپسی بہار کے راستے سے ہی ہوئی تھی۔ میری گیا والی پھوپھی نے بہت کہا تھا کہ اب پاکستان جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہار سے گئے تھے، واپس آگئے ہو، اب

یہیں رچ بس جاؤ مگر مجھے خیال تھا کہ کراچی میں بہت کچھ ہے۔ میں محنت کروں گا اور دوبارہ سے سب کچھ کراچی میں ہی حاصل کرلوں گا۔ مگر یہ نہیں ہوسکا۔ کراچی میں امن تو ہوتا ہی نہیں ہے کہ کوئی کام ہوسکے۔ تھوڑا سا سکون ہوتا ہے اور کچھ کرنے کی صورت بنتی ہے کہ ہنگامے شروع ہوجاتے ہیں۔ بہرحال اورنگی میں جھگی ڈال کر میں نے دوبارہ سے پھلوں کا ہی کام شروع کیا تھا۔ وہ بات نہیں تھی مگر کسی نہ کسی طرح سے گزارا ہو ہی رہا تھا۔ کراچی میں ہی میں نے اپنے اس بیٹے کی شادی اپنے بھائی کی بیٹی سے کردی تھی۔ یہ دونوں بھی یہی چاہتے تھے اور زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طرح سے چل ہی رہی تھی۔''

''اس وقت آپ کا بیٹا بالکل صحیح تھا؟'' میں نے سوال کیا تھا۔

''ارے بالکل صحیح تھا۔ جماعت اسلامی کا کارکن تھا اور ایک پریس میں کام کرتا تھا۔ میں اسے بہت سمجھاتا تھا کہ جماعت اسلامی، مسلم لیگ، بھٹو پارٹی، ایم کیو ایم سب بے کار ہیں۔ ہم نے پوری زندگی نعروں کے پیچھے لگا دی۔ نعرے تو جھوٹے ہوتے ہیں بلکہ لگائے ہی اس لیے جاتے ہیں کہ جھوٹ کو نعرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سچ تو سیدھا سادا ہوتا ہے اور خود ہی نمایاں ہوجاتا ہے۔'' میں نے شیشے میں بڑے میاں کی صورت دیکھی تھی۔ وہ سچ کی ہی طرح سادا لگے تھے۔

''میری بات اس نے مانی نہیں تھی۔ کام کے بعد جتنا وقت ملتا تھا وہ جماعت اسلامی ہی کے چکر میں لگا رہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ کوئی اور کام کرے۔ پریس وغیرہ کے کام میں آدمی آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ مگر اس کی تو سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا۔ میں اسلام اور پاکستان کی جنگ ہار کر زندگی کی جنگ لڑ رہا تھا اور یہ دوبارہ سے میری ہاری ہوئی جنگ کو لڑنے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔

''لیکن آپ نے کہا تھا کہ بیوی کے مرنے کے بعد یہ بیمار پڑ گئے تھے، یہ کیسے ہوا؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہم لوگوں کو تو بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ اصل بات کیا تھی؟ اس کی بیوی سمجھ دار تھی بہت سمجھ دار۔ تھوڑی سی آمدنی میں نہ صرف یہ کہ گھر کا سارا کام چلتا تھا بلکہ اس نے تھوڑا تھوڑا کرکے اپنی نندوں کے لیے جہیز بھی بنالیا تھا۔ وہ بڑی محنتی لڑکی تھی۔ جب ہم لوگ کام پر چلے جاتے تھے تو وہ بچوں کے ساتھ مل کر لہسن چھیلتی تھی۔ دو تین

روپے سیر کے ملتے تھے اور آہستہ آہستہ یہ رقم بھی اس نے برے وقتوں کے لیے جمع کرلی۔ مشکلوں کے باوجود مجھے اطمینان تھا کہ گھر ٹھیک ہی چل رہا ہے۔ صرف لڑکی کی شادی کا مسئلہ ہے اور اب تو صرف رشتوں کی تلاش تھی کہ یہ سب کچھ ہوگیا تھا۔''

بڑے میاں خاموش ہوگئے جیسے کہنے کے لیے الفاظ چن رہے ہوں۔ میں نے مڑکر دیکھا تھا، اظہر میاں بے خبری سے سو رہے تھے۔

''بات یہ تھی کہ کچھ ہی سال میں ان کے کئی بچے ہوگئے۔ مجھے تھوڑا بہت اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اور بچے نہیں چاہتی ہے مگر اظہر تو جماعت اسلامی کے تھے، خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف۔ شاید انھوں نے ہر طرح کی احتیاط سے منع کردیا تھا۔ ہمیں تو یہ ساری باتیں بعد میں پتا چلی تھیں، جب عفت مرگئی۔ ساری باتیں آہستہ آہستہ پتا لگی تھیں، کچھ عفت کی سہیلی نے بتایا تھا، کچھ اظہر نے کہا تھا اور اصل بات یہی تھی کہ جب سیدھے راستے سے الگ ہوکر چلوگے تو تباہی آئے گی ہی، مگر میرے اللہ بہت سزا مل گئی ہے، اب تو اظہر میاں کو اچھا کردے کہ ان کے بچوں کی زندگی کچھ بن جائے۔''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئے۔ میں نے آئینے میں دیکھا تھا ان کی آنکھیں لال تھیں۔ ڈھائی نمبر ابھی دُور تھا۔ میں نے خود ہی پوچھ لیا ''آخر ہوا کیا تھا، کیسے مرگئی تھیں ان کی بیوی۔ کیا کیا تھا انھوں نے؟''

بیٹے وہ خاندانی منصوبہ بندی کے دوا خانے گئی تھی کہ مزید بچے نہ ہوں۔ ان لوگوں نے بچہ دانی میں چھلا ڈال دیا تھا۔ یہی بتایا تھا ان کی دوست نے جو ہمارے پڑوس میں رہتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس چھلے سے بچہ نہیں ہوتا ہے۔ انھوں نے کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا مگر خدا کی قدرت ہے، حمل پھر بھی ٹھہر گیا تھا۔ یہ پھر خاندانی منصوبہ بندی والوں کے پاس گئی تھیں اور ان لوگوں نے چھلا نکال دیا تھا کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا ہے، یہ بچہ شاید ہوجائے یا شاید کچھ دن میں ضائع ہوجائے گا۔ ایک ہفتے کے بعد یہ لسبیلہ پل کے نیچے کوئی دواخانہ ہے کسی دائی کا جہاں اسقاط حمل کا کاروبار ہوتا ہے، وہاں چلی گئی تھیں۔ ان لوگوں نے آٹھ سو روپے لے کر بچہ ضائع کرنے کی کوشش کی تھی۔ نہ جانے کیا کیا تھا کہ دوسرے دن صبح عفت کو سخت بخار ہوگیا تھا۔ شام تک اچھی خاصی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ محلے کے ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گئے تھے اظہر میاں انھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے کچھ شربت دیا تھا، کچھ گولیاں دی تھیں مگر طبیعت بگڑتی ہی چلی گئی تھی۔ ہم لوگوں کو حمل یا چھلے کی کہانی کا تو پتا بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اگلے دن دیکھ کر یہی کہا تھا کہ انھیں سول ہسپتال لے جاؤ ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔

پھر ہم سب اسے سول ہسپتال لے گئے تھے۔ عورتوں کے وارڈ میں ان کا علاج ہوا تھا۔ پہلے کوئی چھوٹا آپریشن ہوا تھا پھر پتا چلا کہ بچہ دانی سڑ گئی ہے، بڑا آپریشن کرنا پڑے گا۔ گھر میں جو بھی روپے پیسے تھے، خرچ ہو چکے تھے۔ روزانہ کے چار ہزار پانچ ہزار روپوں کی تو صرف دوائیں آرہی تھیں۔ پھر بڑا آپریشن ہوا تھا۔ بچہ دانی نکالی گئی تھی اور آنتوں میں سوراخ ہوگئے تھے انھیں بھی کاٹ کر نکال دیا گیا تھا۔ عفت کی جمع کی ہوئی رقم خرچ کردی گئی تھی۔ اظہر میاں تو بالکل ہی دیوانے سے ہوگئے تھے، کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں؟ وہ تو ڈھائی نمبر مسجد کے مولوی صاحب بہت کام آئے، انھوں نے نہ جانے کس طرح سے آنے والے نمازیوں سے کچھ پیسے جمع کرکے دیے تھے، تقریباً بارہ ہزار روپے میں آپریشن اور اس کے بعد کی دوائیں آئی تھیں۔ ابھی عفت کچھ سنبھلی ہی تھیں کہ ان کو سول ہسپتال میں ہی عورتوں کے وارڈ سے دوسرے وارڈ میں لے جانا پڑگیا تھا کہ ان کے دل میں کوئی مسئلہ ہوگیا تھا اور دل بڑا ہوگیا تھا۔ جوان لڑکی تھی، محنتی، اس مصیبت سے نکلی تھی کہ پھر گردوں نے کام بند کر دیا تھا۔ پھر سے اسے سول ہسپتال کے گردوں کے وارڈ میں لے جایا گیا تھا۔ جہاں خون کی ضرورت پڑی تھی۔ اظہر میاں جماعت اسلامی کے دوستوں نے خون دیا تھا، مسجد میں مولوی صاحب نے کچھ نمازیوں سے کہا تھا، ان کا بھی خون مل گیا تھا۔ کئی بوتلیں خون کی چڑھائی گئیں، ہم سب کو لگا تھا کہ عفت اب اچھی ہوجائے گی۔ پانچ چھوٹے چھوٹے بچے تھے، میں رو رو کر خدا سے دعا مانگتا تھا کہ عفت کو اچھا کر دے مالک!'' ہم اب ڈھائی نمبر پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے باہر دیکھا اور گاڑی روکنے کے لیے کہا تھا۔

میں نے گاڑی روکی تھی، انھوں نے اظہر کو جگایا تھا اور بڑی محبت، لجاجت، شرمساری کے ساتھ کہا تھا، ''بیٹے! غریب کے گھر پر ایک پیالی چائے پی لو تو احسان ہوگا، بڑی تکلیف کی ہے تم نے۔''

میں منع نہیں کر سکا تھا۔ اظہر نے مجھے دیکھ کر کہا تھا، چشم ملی چشم الدین پھر زور

سے خود ہی ہنس دیا تھا۔ میں بڑے میاں کے ساتھ ان کے چھوٹے سے گھر میں داخل ہوا، انھوں نے اظہر کے دونوں ہاتھوں کو رسی سے باندھ کر ایک چارپائی سے باندھ دیا تھا اور دوسری چارپائی پر مجھے بیٹھنے کو کہا اور اندر چلے گئے تھے۔

''افشاں بیٹے! جلدی سے چائے بناؤ ایک مہمان آئے ہیں۔'' مجھے آواز آئی تھی۔

وہ پھر میرے پاس آکر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے پوچھا تھا، ''آپ نے اظہر کا علاج کیوں نہیں کرایا ہے؟ یہ کوئی ایسی بیماری نہیں ہے کہ علاج نہ ہوسکے۔''

''ہاں کراؤں گا بیٹے مگر کدھر کرواؤں، سول ہسپتال جانے سے خوف آتا ہے، عباسی ہسپتال میں دماغ کی بیماری کا علاج ہی نہیں ہوتا۔ آغا خان اور لیاقت ہسپتال میں تو پیسے لگتے ہیں ہمارے پاس تو اب کچھ رہا ہی نہیں۔''

وہ سچ کہہ رہے تھے، گھر میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں تھی کہ جس سے اندازہ ہوتا کہ یہاں کے مکینوں کے پاس تھوڑی بہت بھی رقم ہے۔

میں نے کہا تھا، ''میں کوشش کروں گا کہ ان کا علاج جناح ہسپتال میں ہوجائے۔''

بڑے میاں نے بڑی شکرگزار نظر مجھ پر ڈالی تھی۔ تھوڑی دیر میں گیارہ بارہ سال کی بچی چائے کے دو مگ لے کر آئی تھی۔

''یہ افشاں ہے، اظہر کی سب سے بڑی بیٹی ہے۔ ماں کی طرح ہی محنتی ہے۔''

میں نے پوچھا تھا، ''باقی بچے کہاں ہیں؟''

بڑے میاں کے چہرے پر جیسے ایک طوفان سا آگیا تھا۔ انھوں نے فوراً ہی جواب نہیں دیا تھا۔ ذرا دیر رک کر بولے تھے، ''میری دونوں بیٹیاں تو اندر لہسن چھیل رہی ہیں۔ اظہر کے دو چھوٹے بچے تو ماں کے مرنے کے سال کے اندر اندر ہی مر گئے تھے۔ افشاں سے دو چھوٹے بیٹے ہیں۔ ایک گیراج میں کام سیکھ رہا ہے اور دوسرا خراد کی مشین پر کام سیکھ رہا ہے۔ گھر کا کام کاج تو چلانا ہے ناں۔ پیٹ تو روٹی مانگتا ہے۔''

اظہر چارپائی پر پڑے ہوئے سو رہے تھے۔ بڑے میاں نے اُٹھ کر توشک کے نیچے سے چادر نکال کر اظہر کے اوپر ڈال دی تھی میرے لیے ٹھنڈی چائے کا پینا مشکل ہوگیا تھا۔

وہ دوبارہ آ کر میرے سامنے بیٹھ گئے تھے، پھر آہستہ سے بولے تھے، ''بیٹے! عفت تو مرگئی، گناہ کیا تھا اس نے چھلا ڈال کر حمل ضائع کرا کر، اس کی سزا تو مل گئی اسے۔ ان بچوں کا کیا قصور ہے؟ اظہر میاں اگر ٹھیک رہتے تو ان بچوں کو اسکول سے تو نہیں اُٹھانا پڑتا۔ کچھ نہ کچھ پڑھ لیتے، یہ لوگ کسی کام کے ہوجاتے۔ میں تو پاکستان بننے کی وجہ سے نہیں پڑھ سکا تھا مگر ڈھاکے میں کاروبار کے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اظہر میاں کو پاکستان ٹوٹنے کی وجہ سے اسکول چھوڑنا پڑا تھا۔ ان کے بچے اچھے خاصے اسکول جارہے تھے کہ یہ سب کچھ ہوگیا۔ میں تو اظہر میاں کو ہی دیکھنے میں لگا رہتا ہوں گھر تو چلانا ہوتا ہے ناں۔'' میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میرے چاروں طرف سناٹا تھا، دُور تلک نہ کوئی آواز تھی اور نہ ہی کوئی آہٹ۔ کتنی ہی عفتیں، زاہدائیں، سلمائیں، شمیمیں اسی طرح کی موت کا شکار ہوجاتی ہیں اور کراچی جیسے غریب پرور شہر کے چوراہوں پر ہار بیچنے والے بچے، گیراجوں پر کام کرنے والے چھوٹے اور ہوٹلوں میں ٹیبل صاف کرنے والے چھوکرے جن کے باپ ہاتھ میں پتھر لے کر گھومتے ہیں، سڑکوں پر ڈانس کرتے ہیں، چوراہوں پر اپنے جانتے میں ٹریفک کنٹرول کرتے ہیں، جن کے بوڑھے باپ ان کی تلاش میں خاک دھول اور دھویں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ اسکول جانے والے بچے لہسن چھیلتے ہیں، خراد کی مشین اور گیراجوں میں کام کرتے ہیں کہ گھر کا کام چلے۔

پیٹ تو روٹی مانگتا ہے
پیٹ تو روٹی مانگتا ہے

□

زاہدہ حنا

آئینہ کہانیاں☆

ڈاکٹر شیر شاہ کا نام جس کے نام پر رکھا گیا، اس کا برتھ سرٹیفکیٹ، ڈومیسائل، پی آر سی اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ سب ہی سہسرام کا تھا۔ مجھ سہسرامی نے شعور سنبھالنے سے بھی پہلے اس کا نام کہانیوں میں سنا۔ اس چور کی کہانی جو اس کی قبر پر رکھے ہوئے جڑاؤں پیالے کو چرانے آیا تھا... پورے چاند کی رات کو شیر شاہ کے تالاب میں پانی سے پیر بھگونے اور تاڑی سے لبؔ تر کرنے والوں کے قصے جنھیں شیر شاہ کے جلال نے نشان عبرت بنادیا تھا اور بعض کہانیوں میں تو وہ شیر بھی تھے جو چندن شہید پیر کے مزاروں پر پہرا دیتے دیتے کبھی شیر شاہ کے روضے کا رخ کرتے، آدھی رات کو باندھ پر سے چلتے ہوئے شیر شاہ کے مزار تک جاتے، قبر پر اپنی دم سے جھاڑو لگاتے اور سحر سے پہلے شہیدوں کی خدمت میں حاضر ہوجاتے۔

یوں کہہ لیں کہ ہمارے گھر میں شیر شاہ کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ دادی جن کے وسیلے سے شیر شاہ کا رتی ماشہ خون میری رگوں میں بھی دوڑتا پھرتا ہے، وہ اس کا خصوصی طور سے ذکر کرتیں، امی اور اباجان تو ایک طرف رہے اس نام کو میری بوا بھی بہت لہک کرلیتی تھی۔ وہ قحط کے دنوں میں میری نانیہال میں ایک پسیری چاول کے

☆۔یہ مضمون شیر شاہ سید کے دوسرے افسانوی مجموعے ''جس کو دل کہتے تھے'' کی تقریب اجرا میں پڑھا گیا۔

عوض پانچ سات برس کی عمر میں خریدی گئی اور پھر امی کے دان دہیز کے ساتھ کراچی کی جانب ہنکادی گئی۔ میرے بچپن کی شاید سب سے بڑی اذیت بوا اور شیرشاہ کے تذکرے سے عبارت ہے اور کیوں نہ ہو کہ میں نے جب بھی بوا کے خریدے اور بیچے جانے پر آنسو بہانے کی کوشش کی اس نے کھنکتے ہوئے لہجے میں یہی کہا، ''ہمرے مائی باپ ہمرے کو سراوں لا کے اگر بیچت نہ رہت تو ہمرے کو سیر ساہ کا روجہ دیکھن کو کیسے ملت رہا (میرے ماں باپ اگر مجھے بیچنے کے لیے سہسرام نہ لاتے تو پھر میں شیرشاہ کا روضہ کیسے دیکھ پاتی)۔

بوا کے اس بار بار کے بیان سے ہی مجھے یقین آتا تھا کہ شیرشاہ کے روضے کا دیدار یقیناً اتنا ہی بڑا واقعہ ہے کہ بھوک اور قحط کے سامنے ماں باپ کے ہتھیار ڈال دینے کا صدمہ اور ان سے ابدی جدائی بھی ہنس ہنس کر بیان کی جاسکتی ہے۔

اب آپ ہی انصاف کریں کہ جس کے دل پر شیرشاہ کے نام کی ایسی دھاک بندھی ہو، اس کی بھلا کیا مجال کہ وہ اس کے ہم نام کی کہانیوں پر جان کی امان مانگتے ہوئے کچھ عرض کرنے کو حاضر نہ ہوجائے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان کا نام اگر شیرشاہ نہ ہوتا اور انھوں نے یہی کہانیاں لکھی ہوتیں تب بھی آج میں آپ کے سامنے موجود ہوتی۔

میں کراچی میں پیدا نہیں ہوئی لیکن اس شہر کی مٹی میرے گھٹنوں میں لگی یہاں میں نے سنبھل سنبھل کر اور پلنگ کی پٹی پکڑ کر چلنا سیکھا ہے۔ میں اس شہر کی عاشق ہوں، یہاں سے بہ نوک خنجر تو ہنکائی جاسکتی ہوں لیکن اپنی خوشی اور اپنی خواہش سے اسے ترک کرکے لندن یا لکسم برگ، شکاگو یا شنگھائی میں جاکر آبادی کے نام پر بربادی نہیں کما سکتی۔

دلّی اور لکھنؤ کے لیے شاعروں نے کیسے کیسے شہر آشوب نہیں لکھے اور کراچی جسے اس کے فاتح سر چارلس نیپیر نے ''ملکۂ مشرق'' کہا تھا، وہی ملکہ ہمارے دیکھتے دیکھتے کوچہ و بازار میں رسوا ہوئی، اسی عفت مآب، عصمت آرا کے سر کی ردا اس کے بیٹوں نے چھینی اور وہ اپنوں کے ہاتھوں بے حرمت ہوئی، نسلی اور لسانی سیاست کے کوٹھے پر بٹھائی گئی۔

شیر شاہ نے اسی عالم آرا کراچی کے لیے ایک نہیں متعدد شہر آشوب لکھے ہیں اور انھیں کہانیوں کا نام دیا ہے۔ وہ کسی ایسے باپ کے بیٹے نہیں جو ہندوستان کی سرحد پار کرتے ہی کھوکھرا پاری سیّد بن بیٹھا ہو، جس نے اشرافیہ کے شاگرد پیشہ سے نکل کر، کراچی پہنچتے ہی اپنے محلات کے جعلی کلیم داخل کیے ہوں اور منظور کرائے ہوں اور پھر نواب صاحب آف کالادھن یا خان بہادر بے ضمیر بن بیٹھا ہو۔ وہ ایک کثیر العیال باپ کے بیٹے ہیں جس نے انھیں غربت سے لڑنا، محنت سے رہنا اور عزت سے جینا سکھایا۔ ایک ایسے دادا کے پوتے ہیں جو بستر مرگ پر بھی ان کا املا درست کرتا رہا اور ایک ایسی ماں کے پالے ہوئے ہیں جو ان کی انگلی تھام کر انھیں اردو ادب کی بھول بھلیاں میں لے گئی۔ وہ قرۃ العین حیدر کی ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' کا کوئی Highbrow کردار نہیں۔ انھوں نے لیاری کی تنگ گلیوں میں اردو کی کلاسیکی داستانیں پڑھی ہیں اور ملیر کی مضافاتی بستی کے ایک کالج کے طالب علم رہے ہیں، جس کا نام مہاجر اشرافیہ کے نوجوان استہزائیہ انداز میں لیتے ہیں۔

ان کی ماں نے انھیں اردو ادب کی جس بھول بھلیاں کا راستہ دکھایا تھا وہ اب اسی کی سیدھی، آڑی ترچھی گلیوں میں پھرتے ہیں اور اس شہر کا مرثیہ لکھ رہے ہیں جس سے انھیں عشق ہے، مجھے عشق ہے، ہزاروں کو عشق ہے لیکن افسوس کہ ہم عشاق کا ہجوم آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا، حالاں کہ ہم سے پکار پکار کر کہا جا رہا تھا کہ:

مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

یرمیاہ نے یروشلم کا نوحہ لکھتے ہوئے کہا تھا:

''وہ ملکۂ ممالک باج گزار ہوئی
وہ رات کو زار زار روتی ہے
اس کے آنسو رخساروں پر بہتے ہیں
اس کے چاہنے والوں میں کوئی نہیں جو اسے تسلی دے
اس کے سب دوستوں نے اسے دغا دی، وہ اس کے دشمن ہوگئے''

ہم نے بھی اپنے شہر سے دغا اور دشمنی کی اور اسی غم نے شیر شاہ سے دشمنوں میں گھری ہوئی ملکۂ مشرق کے لیے ''شکار پور سے شکاگو''، ''دگمین شلوم''، ''مجبوری''،

''ٹھنڈا پانی''، ''آگرے کے ماسٹر صاحب''، ''ٹوٹے ہوئے لوگ'' اور ''ننھے ننھے ہاتھ'' ایسی کہانیاں لکھوائی ہیں۔

ان کے افسانے ''ننھے ننھے ہاتھ'' میں ''چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کے ساتھ اور جسم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے ساتھ ہاشم کا جنازہ'' جب اپنی ماں کے جنازے کے ساتھ اٹھتا ہے تو اس لیے کہ:

> وہ صرف سیاست نہیں کر رہا تھا، وہ سیاست سے آگے بھی بہت کچھ کر رہا تھا۔ ایک دن جب وہ میرے گھر آیا تو میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ جس راستے پر وہ چل نکلا ہے وہ کہاں تک جائے گا؟ ''عوام''، ''قومی اخبار'' اور ''امن'' میں نہ جانے کیا کیا چھپ رہا تھا۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ ایسے حالات میں چندہ جمع کرنا، بھتا وصول کرنا، اسلحے کی خریداری کرنا، لڑکوں کو ٹریننگ دلوانی اور نہ جانے اس طرح کے کتنے کاموں کی ذمے داری اس پر تھی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ ابھی بھی وقت ہے کہ صرف اسٹیل مل میں کام کرو اور اگر یہ ممکن نہیں ہے تو اسے چھوڑ دو، یہ شہر ہی چھوڑ دو۔ تم محنتی آدمی ہو، بہت کچھ کرلوگے۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے کچھ اس کی سمجھ میں آیا ہے، کچھ وہ نہیں سمجھا ہے اور کچھ وہ سمجھنا بھی نہیں چاہتا ہے۔

ہاشم اگر یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکا تھا اور اس جیسے ہزاروں نوجوان اگر چندے، بھتے اور اسلحے کی سیاست کی دلدل میں اترے تو اس لیے کہ کراچی کی:

> آبادی بڑھتی جارہی تھی اور مسائل بھی بڑھتے جارہے تھے۔ بھٹو صاحب کی حکومت کو کراچی سے بڑے ووٹ ملے تھے اور انھوں نے کراچی کے لیے کیا بھی خوب، مگر ساتھ ہی کراچی کے لیے quata لگا کر مہاجروں کی دشمنی بھی مول لی تھی۔ پھر ضیاء الحق کی حکومت نے کراچی سے خوب مذاق کیا تھا۔ بے نظیر کی دشمنی میں آہستہ آہستہ ملک کا جو برا ہوا وہ تو ہوا ہی، مگر کراچی کا بہت

ہی برا ہوا تھا۔ لانڈھی کورنگی میں ایک دُنیا آباد تھی، مگر اسکول اتنے
ہی تھے، کالج اتنے ہی تھے، بے روزگاری بڑھ گئی تھی اور آہستہ
آہستہ سب کچھ بدل گیا تھا۔ بچے اسکول جانے کی بجائے ہوٹلوں
میں ڈبو کھیلتے تھے، جوان بھتے وصول کرتے تھے اور پڑھی لکھی
آبادی آہستہ آہستہ جہالت کی گود میں چلی گئی تھی۔

''جس کو دل کہتے تھے'' شہر آشوب در شہر آشوب نہیں تو اور کیا ہے کہ جس
میں لکھا گیا:

باہر سے آنے والوں نے چاہے پنجابی ہوں یا پٹھان، بلوچی ہوں
یا مہاجر سب نے کراچی کو لوٹا ہے، اسے دیا کچھ نہیں ہے۔ اب
الفنسٹن اسٹریٹ، زیب النسا اسٹریٹ ہے اور میکلوروڈ، چندریگر
روڈ ہے اور بندر روڈ جناح روڈ ہے، جہاں اندرون سندھ کے
زمیں دار، وڈیرے آ کر کراچی کی بے حرمتی کرتے ہیں۔

یروشلم کے شہر سے زیادہ کون سی بستی مناسب ہوتی جہاں صیون کی ندیوں کو
ہزاروں برس رونے والوں کے سامنے کراچی کے ایک بیٹے نے اپنے شہر برباد کو یاد کیا
اور کہا:

اب کراچی میں انسانوں کو پانی نہیں ملتا۔ جانوروں کی کسے فکر
ہے؟ اب تو وہاں سڑکوں پر لوگوں کو گولی مار دی جاتی ہے اور
بوریوں میں ٹکڑے ٹکڑے انسان ملتے ہیں۔ بزدل ہندو کراچی
چھوڑ گئے جو جانوروں کو پانی پلاتے تھے، اب کراچی والوں کو
کراچی والے خون پلاتے ہیں۔

شیر شاہ کے ان جملوں کو پڑھ کر کون ہوگا جو زار زار نہیں روئے گا کہ:

کراچی اپنا مقدمہ ہار چکا ہے۔ کراچی دھوکا کھا چکا، کراچی کے
بیٹوں نے شہر سے بے وفائی کی، ہر ایک نے کراچی کو توڑا ہے۔
جو کراچی میں رہتے ہیں انھوں نے اور جو کراچی سے بھاگ گئے
ہیں انھوں نے بھی۔ برنس روڈ پر چھابڑی لگانے والے اور تین

تلوار پر اپارٹمنٹ بنانے والے نے، جاہل نے بھی اور پڑھے
لکھے نے بھی۔

شیر شاہ ایک عذاب میں مبتلا ہیں، ان کے ابا بہار سے آئے تھے، شیر شاہ بھی بہتوں کی طرح اگر بہاری مہاجر رہتے تو سکون سے زندگی بسر کرتے، شرف آباد یا ڈیفنس میں کوٹھی ہوتی، بنگالی نوکروں سے بہاری کباب لگواتے، پنجابیوں، بنگالیوں، سندھیوں اور پٹھانوں کے بارے میں مسجع مقفی زبان استعمال کرتے، یہود و ہنود کی سازشوں پر آنسو بہاتے اور ہر سال بنکاک اور لاس ویگاس میں چھٹیاں مناتے۔ انھوں نے تو اپنی ذات میں ایک خلقت آباد کی ہوئی ہے۔ ادھر اردو بولنے والے ہیں تو اُدھر سندھیوں، پنجابیوں اور پٹھانوں کا ٹھکانا ہے، پارسیوں، ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں کی بستیاں ہیں، چناں چہ کبھی وہ کسی مندر کے لیے نوحہ کرتے ہیں اور کبھی کسی سینی گاگ کے لیے گریہ، کبھی وہ میوہ شاہ میں یہودیوں کا فراموش کردہ قبرستان ڈھونڈنے نکلتے ہیں اور کبھی کراچی کے کسی ایسے مندر کی تلاش پر کمربستہ ہوجاتے ہیں جسے گرا کر اس پر دکان یا مکان بنالیا گیا ہے۔

''جنت نگاہ''، ''ٹھنڈا پانی''، ''کھیلن کو مانگے چاند''، ''ٹوٹے ہوئے لوگ''، ''شکارپور سے شکاگو...'' انھیں کہانیاں کون کہے گا؟ یہ تو چمچماتی ہوئی، سان رکھی ہوئی چھوٹی چھوٹی چھریاں ہیں، کہانی کی زنجیر سے بندھی ہوئی۔ ہم انھیں پڑھتے جاتے ہیں اور وہ ہماری پشت، ہمارے سینے میں اترتی جاتی ہیں اور ''یا انسان... یا انسان'' کی گونج میں ہونے والا چھریوں کا یہ ماتم ہمیں لہولہان کرتا چلا جاتا ہے۔

ان کی کہانیوں میں وہ سندھی بوڑھے ہیں جو دھاڑیں مارتے ہیں اور مہاجروں کی طرف انگلیاں اٹھاتے ہیں ''ان لوگوں نے میرے دونوں بیٹے مار ڈالے، میرے دونوں جوان بیٹے مار ڈالے، کسی نے میرے پلائے ہوئے پانی کا بھی پاس نہ کیا۔''

ان میں وہ پنجابی ہیں جو بے دھڑک یہ کہتے چلے جاتے ہیں کہ:

یہ جو تم لوگوں کی army ہے وہ خود اتنی بڑی Parasite ہے
کہ وہ ملک کو ایک دن ختم کردے گی۔ میں خود پنجابی ہوں اور

> میرا ایک بھائی فوج میں بریگیڈیئر ہوگیا ہے۔ مجھے تھوڑا بہت اندازہ ہے کہ اتنی بڑی آرمی کو زندہ رکھنے کے لیے بہت سے لوگوں کا پیٹ کاٹنا پڑے گا۔

شیرشاہ کے والد نے خوب کیا کہ انھیں سہرام کے شیرخان کا نام دیا، شاید اس نام کی مناسبت سے ہی وہ اتنے بہادر ہیں کہ یہ لکھ سکیں:

> ایوب خان کے خاندان سے لے کر ضیاء الحق تک اور بھٹو سے لے کر شریف خاندان تک فوجوں، نوکرشاہی کے لوگوں اور ان کے خاندانوں کے دوستوں نے جس طرح سے ملک کو بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر نوچا ہے، اس کا اندازہ تم لوگ پاکستان میں بیٹھ کر، کر ہی نہیں سکتے ہو۔

وہ بائیں بازو کے انقلابیوں کی طرف جھکاؤ رکھتے ہوئے بھی یہ سچ بولنے سے نہیں چوکتے کہ:

> اب پاکستان میں انقلاب بھی نہیں آئے گا کیوں کہ انقلاب لانے والی طاقتیں خود اتنی زیادہ کرپشن کا شکار ہیں کہ اب انقلاب کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

شیرشاہ کے خمیر میں بہادری اور بے باکی گندھی ہوئی ہے، تب ہی تو وہ ابھاگن سندھ اور بیراگن کراچی کے عذابوں کا ہمیں کوئی ایک رخ نہیں دکھاتے، اس کی سچی اورلرزہ خیز تصویریں ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ یہ تصویریں نہ اردو بولنے والوں کو اچھی لگتی ہیں اور نہ سندھی بولنے والوں کو بھاتی ہیں۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ آئینہ کہانیوں میں اگر ہمیں اپنے کریہہ چہرے، خون آلود ہاتھ اور نفرت کے زہر سے کاسنی آنکھیں دکھائی دیں تو اس میں کہانیوں کا کیا قصور اور آئینوں کی کیا خطا؟

یہودیوں نے ہمارے شہر میں ایک سینی گاگ بنایا تھا، عبرانی میں اس کا نام ''مگین شلوم'' رکھا تھا۔ وہ ایک اجنبی زمین پر رہتے تھے اور اس شہر کو ''جائے امان، جائے پناہ'' کہتے تھے، سمجھتے تھے اور ایک ہم ہیں کہ اپنی بستیوں اور اپنے گھروں کو اجاڑنا ہمارا مشغلہ ہے۔ ہم امن و آشتی کا درس دیتے ہیں اور یہود و ہنود سے نفرت

ہماری نس نس میں اتری ہوئی ہے۔ ہم ہر جمعے کو رقت آمیز آواز میں ''یا اللہ قبلۂ اوّل کو آزاد فرما''، ''یا اللہ بابری مسجد کی حفاظت فرما'' کی دعا کرتے ہیں اور ''نگین شلوم'' اور ''نارائن مندر'' ڈھادیتے ہیں۔ ہماری منافقتوں اور غداریوں کا یہ عالم ہے کہ ہم نے اپنے شہر کے ذرے ذرے سے عزت، دولت اور شہرت کشید کی، پھر اس کی بے حرمتی کی، اسے اپنے دانتوں، ہاتھوں اور ناخنوں سے بھنبھوڑا ہے، اسے قتل کیا اور پھر خود ہی اس کے سرہانے اس کے وارث بن کر بیٹھے اور واویلا کیا۔ اس کا خون ہمارے ہاتھوں پر تھا اور اس کے قتل کا الزام ہم نے دوسروں پر دھرا۔ میری چہیتی بوا قحط کے دنوں میں پانچ سیر چاول کے عوض بکی تھی، میرا شہر شادمانی اور خوش حالی کے زمانے میں پانچوں سواروں کے ہاتھوں فروخت ہوا۔

مرثیے اور نوحے داد کے نہیں، گریہ و ماتم کے طلب گار ہوتے ہیں۔ سو میں شیر شاہ کو ان کی کہانیوں کی مبارک باد نہیں دیتی۔ آئیں آپ اور میں اور ہم شیر شاہ کو اور ایک دوسرے کو اپنے شہر کا پرسہ دیں۔

❑

"انہوں نے اپنے افسانوی مجموعوں میں ایسی خوبصورت، معنی خیز اور تراشیدہ کہانیاں پیش کی ہیں جو نہ صرف اپنے موضوع کے اعتبار سے نئی اور منفرد ہیں، بلکہ اپنے فن اور تخلیقی جوہر کے اعتبار سے بھی نادرہ کاری اور تکمیلیت کی حامل ہیں۔ اُن کے افسانوں میں ایک اچھے افسانے کی تمام خوبیاں ملتی ہیں۔ اُن کے یہاں بھانت بھانت کے کردار ہیں۔ انوکھے اور اچھوتے واقعات سے پلاٹ تعمیر کرنے کی اُن کے پاس غیر معمولی صلاحیت ہے۔ جزئیات نگاری، فضا بندی اور منظر نگاری اُن کے افسانوں کو ایک چلتی پھرتی تصویر کی طرح دیکھنے اور اُن میں اُن ہی کیفیتوں کو محسوس کرنے کی چیز بنا دیتی ہیں۔

ان افسانوں میں بڑا تنوع ہے۔ نہ صرف کرداروں اور کہانیوں کا، بلکہ اُن واقعات کا بھی جو زمانی اور مکانی اعتبار سے مختلف وقتوں میں مختلف ملکوں اور قوموں میں رونما ہوتے ہیں... اُن کے البم میں صرف کراچی اور کابل ہی کی نہیں بلکہ انگلینڈ، آئرلینڈ، کینیڈا اور امریکہ کے مناظر اور موسموں کی بھی نہایت جزبیں اور دلکش تصویریں ہیں۔

دراصل شیر شاہ سیّد کا بڑا کارنامہ ہی یہ ہے کہ انہوں نے کسی نظریاتی وابستگی کے بغیر اپنے وقت کے سیاسی مزاج اور سماجی انتشار کی ایسی تصویریں پیش کی ہیں جو فنکاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

وقت نے بھلے شیر شاہ سیّد کو تشدّد اور خوں چکائی کی سوغات دی ہو، لیکن شیر شاہ سیّد نے اپنے وقت کا دامن رنگا رنگ خوبصورت کہانیوں سے بھر دیا جو تشدّد کا عکس بھی ہیں، اور اس کا جواب بھی۔"

وارث علوی

ISBN 978-969-5680-09-4

Rs. 130/-